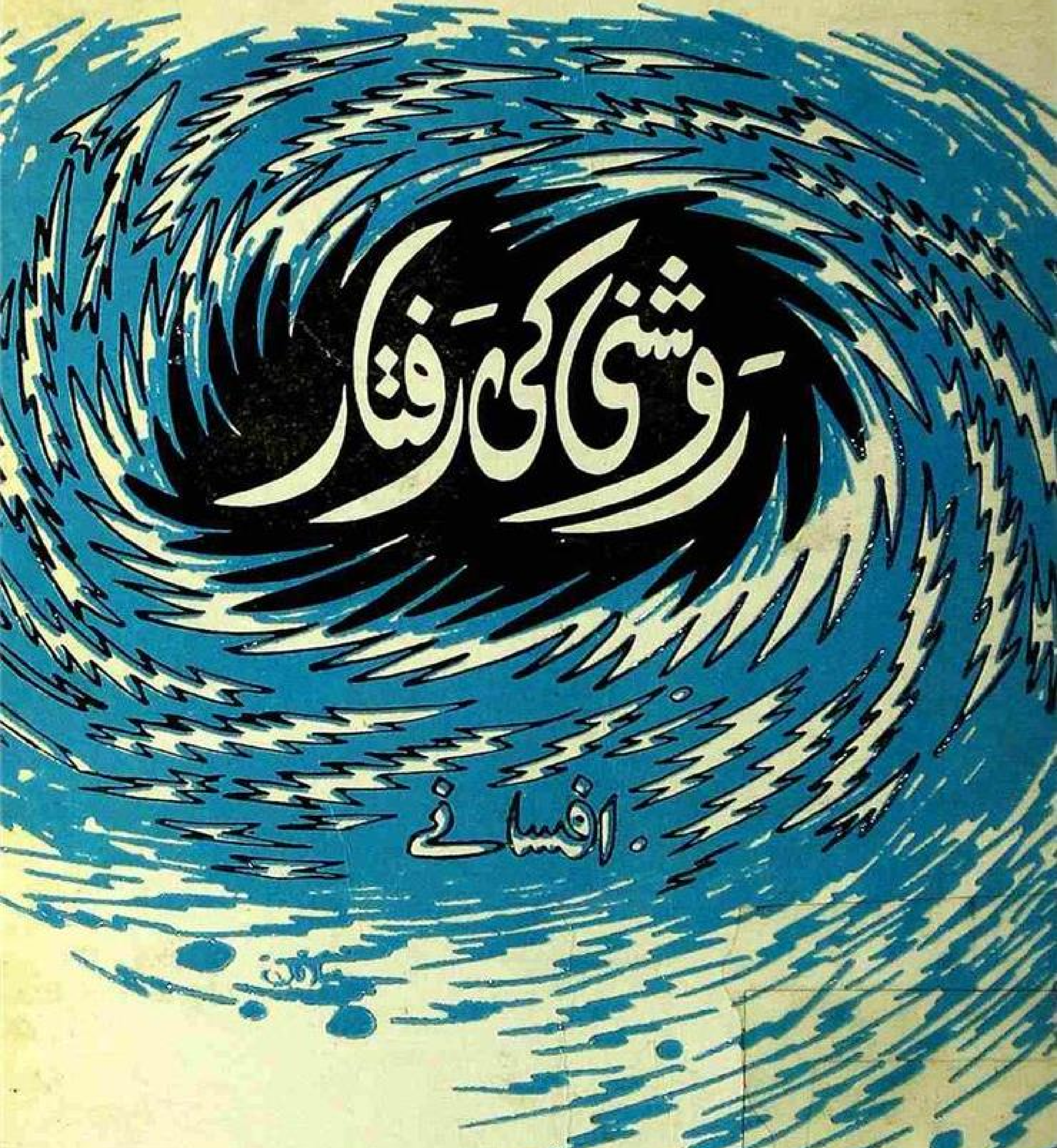

قرۃ العین حیدر

روشنی کی رفتار

قرۃ العین حیدر

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

ایڈیشن ------ ۱۹۹۲ء

تعداد ---------- ۱۰۰۰

قیمت ---------- ۴۰/۰۰

کتابت : س. ریاض، الہ آباد

مطبع : تاج آفسٹ پریس، الہ آباد

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

ترتیب

۱	آوارہ گرد	۵
۲	ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی	۱۵
۳	فوٹوگرافر	۲۹
۴	حسب نسب	۳۸
۵	سکریٹری	۵۸
۶	نظارہ درمیاں ہے	۶۹
۷	دو سیاح	۸۶
۸	یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے	۹۹
۹	فقیروں کی پہاڑی	۱۲۳
۱۰	اکثر اس طرح سے بھی رقصِ فغاں ہوتا ہے	۱۳۸
۱۱	سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات	۱۵۵
۱۲	روشنی کی رفتار	۱۸۷
۱۳	لکڑ بگے کی ہنسی	۲۲۰
۱۴	آئینہ فروشِ شہرِ کوراں	۲۴۰
۱۵	پالی ہل کی ایک رات	۲۴۹
۱۶	ـــــ دریں گرد سوارے باشد	۲۷۱
۱۷	جن بولو تارا تارا	۲۹۷
۱۸	کہرے کے پیچھے	۳۱۳

آوارہ گرد

پچھلے سال، ایک روز شام کے وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں باہر گئی۔ ایک لمبا تڑنگا یورپین لڑکا کینوس کا تھیلہ کندھے پر اٹھائے سامنے کھڑا تھا۔ دوسرا بنڈل اس نے ہاتھ میں سنبھال رکھا تھا اور پیروں میں خاک آلود پشاوری چپل تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنی دونوں ایڑیاں ذرا سی جوڑ کر سر خم کیا۔ میرا نام پوچھا اور ایک لفافہ تھمادیا۔ "آپ کے ماموں نے یہ خط دیا ہے"۔ اس نے کہا۔

"اندر آجاؤ"۔ میں نے اس سے کہا اور ذرا اچنبھے سے خط پر نظر ڈالی۔ یہ الن ماموں کا خط تھا اور انھوں نے لکھا تھا ——— "ہم لوگ کراچی سے حیدرآباد سندھ واپس جارہے تھے۔ ٹھٹھہ کی ماکلی ہل پر قبروں کے درمیان اس لڑکے بیٹھا دیکھا۔ اس نے انگوٹھا اٹھا کر لفٹ کی فرمائش کی اور ہم اسے گھر لے آئے۔ یہ دنیا کے سفر پر نکلا ہے اور اب ہندوستان جا رہا ہے۔ اور بہت پیارا لڑکا ہے میں نے اسے ہندوستان میں عزیزوں کے نام خط دے دیئے ہیں۔ اور ان کے پاس ٹھہرے گا۔ تم بھی اس کی میزبانی کرو۔

نوٹ: اس کے پاس پیسے تقریباً بالکل نہیں ہیں"۔

لڑکے نے کمرے میں آکر تھیلے فرش پر رکھ دیئے۔ اور اب آنکھیں چندھیا کر دیواروں

پر لگی ہوئی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ اتنے اونچے قد کے ساتھ اس کا بچوں کا سا چہرہ تھا، جس پر ہلکی ہلکی سنہری داڑھی مونچھ بہت عجیب سی لگ رہی تھی۔

ایک اور ہچ ہائیکر[ا] ——— میں نے ذرا کوفت سے سوچا۔ الن ماموں بے چارے فرشتہ صفت آدمی اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آگئے ہوں گے کیوں کہ یہ بین الاقوامی آوارہ گرد اپنی مطلب برآری کے لئے راہ چلتوں سے دوستی کر لیتے کا فن خوب جانتے ہیں۔

"شاہدہ نے بھی آپ کو سلام کہا ہے"۔ اس نے میری طرف مڑ کر بڑی اپنائیت سے کہا۔

"شاہدہ ؟"

" آپ کی کزن شاہدہ۔ میں بنارس میں ان کے ہاں مقیم تھا۔ اور لکھنؤ میں آپ کی پھوپھی کے ہاں۔ اور چاٹگام میں انکل انور کے ہاں رہوں گا اور اگر دار جلنگ جا سکا تو کزن مطہرہ کے گھر پر ٹھہروں گا"۔ اس نے جیب میں سے مزید لفافے نکالے۔

"بیٹھ جاؤ ——— اوٹو ——— چائے پیو ———" میں نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ مجھے وہ دو ڈچ ہچ ہائیکر یاد آئے، جنھوں نے کراچی میں لڈن ماموں کے گھر پر ڈیرے ڈال دیئے تھے، کیونکہ ان کے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے۔

" میں ترکی اور ایران ہوتا ہوا آیا ہوں اور جرمنی سے یہاں تک میں نے موٹروں اور لاریوں میں لفٹ لئے ہیں۔ اب لنکا جاؤں گا۔ پھر تھائی لینڈ وغیرہ۔ وہاں سے کارگو بوٹ کے ذریعے جاپان، امریکہ اور اس کے بعد گھر واپس۔ اس وقت تو میں اورنگ آباد سے ایک ٹرک پر آرہا ہوں"۔

"بے حد ایڈونچر رہے ہوں گے تمھارے سفر میں"۔

" ہاں۔ استنبول میں میں تین راتیں غلطہ کے پل کے نیچے سویا۔ اور ایران میں ———"

پھر اس نے مختلف چھوٹے چھوٹے ایڈونچر سنائے۔ "میں کولون یونی ورسٹی میں پڑھتا ہوں"۔

ا؎ HITCH HIKER

اس نے مزید اطلاع دی۔

"پاکستان اور ہندوستان میں تم نے کیا فرق پایا" کھانے کی میز پر میں نے اس سے پوچھا۔

"وہاں سب لوگ مجھ سے مسئلہ کشمیر پر بڑے جوش و خروش سے باتیں کرتے تھے۔ یہاں کشمیر اور پاکستان کا ذکر بہت کم کیا جاتا ہے۔ یہاں کے مسائل ——" پھر اس نے ہندوستان کے مسائل پر ایک جامع تقریر کی۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔"میں دولت مند سیّاحوں اور عام یورپینوں اور امریکنوں کی مانند محض تاج محل دیکھنے نہیں آیا ہوں۔ میں رات بھر دیہاتوں کے برآمدوں میں سوتا ہوں۔ کسانوں کی جھونپڑیوں میں رہتا ہوں۔ مزدوروں سے دوستی کرتا ہوں۔ حالانکہ ان کی زبان نہیں سمجھ سکتا۔"

کھانے کے بعد اس نے بمبئی کا نقشہ نکال کر فرش پر پھیلایا۔ بچارے انگریز بمبئی کے طرز تعمیر کو وکٹورین گوتھک کہتے تھے۔ یہاں کیا کیا چیزیں قابلِ دید ہیں؟"

"ایلیفنٹا اور اپالو بندر۔ اور ——"

"یہ سب گائیڈ بک میں بھی موجود ہے" اس نے ذرا بے صبری سے میری بات کاٹی۔ اور ہندوستان کی معاشیات اور عمرانیات پر نہایت ثقیل اور مدلل گفتگو سے مجھے نوازا۔

"اوٹو —— تمہاری عمر کتنی ہے" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"میں اکیس سال کا ہوں" اس نے بڑے وقار سے جواب دیا" اور جب جرمنی واپس پہنچوں گا تو بائیس سال کا ہو جاؤں گا۔ اور اس کے اگلے سال مجھے ڈاکٹریٹ مل جائے گا۔ میں یونی ورسٹی میں جرمن غنائیہ شاعری کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ جرمنی میں صرف ڈاکٹریٹ ملتا ہے۔ جس طرح آپ کے بی اے۔ ایم اے" بعد ازاں وہ دیر تک جرمن غنائیہ شاعری، عالمگیر سیاست اور ہندوستانی آرٹ پر روشنی ڈالتا رہا۔ وہ تصویریں بھی بناتا تھا۔ کس قدر بقراط لڑکا ہے۔

میں نے دل میں سوچا۔ بیشتر جرمنوں کی طرح انتہائی سنجیدہ، دھن کا پکا اور حسِ مزاح سے تقریباً عاری۔

"میں رات کو سونے سے پہلے آپ کی کتابیں دیکھ سکتا ہوں؟"

"یقیناً"۔

"رات گئے تک نشست کے کمرے میں روشنی جلتی رہی۔ صبح تین بجے غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز آئی، تو میری آنکھ کھل گئی۔ وہ راتوں رات نہا دھو کر فارغ ہو چکا تھا تاکہ صبح کو اس کی وجہ سے گھر والوں کو زحمت نہ ہو۔ ناشتے کے وقت اس نے ہندوستان کے متعلق اس کتاب پر تبادلۂ خیالات کیا جو اس نے رات بھر میں پڑھ کر ختم کر ڈالی تھی۔ پھر اس نے بمبئی کا نقشہ اٹھایا اور سیاحی کے لیئے نکل گیا۔

وہ اپنے تھیلے میں پانچ کتابیں لے کر چلا تھا جن پر کمرہ ٹھیک کرتے وقت میری نظر پڑی۔ گوئٹے کی فاوسٹ، ہائینے کی نظمیں، رلکے، بریخٹ اور انجیل مقدس۔ شام کو جب وہ تھکا ہارا مگر بے حد بشاش واپس آیا تو میں نے اس سے کہا۔ "اوٹو! —— کل رات تم خدا سے منکر تھے، مگر انجیل ساتھ لے کر گھومتے ہو!" اس پر اوٹو نے خدا کے تصور میں ایک، جذباتی سہارے کی انسانی حاجت پر مختصر تقریر کی۔

"اوٹو تم ایلیفنٹا گئے تھے؟ وہاں کی تری مورتی اور دیوتا ——"

"میں کہیں بھی نہیں گیا۔ وکٹوریہ گارڈن میں دن بھر بیٹھا عوام کے ہجوم کا مطالعہ کرتا رہا۔ انسان انسان سب سے بڑا دیوتا ہے"۔

"ہاں ہاں —— یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ مگر تم نے کھانا کہاں کھایا؟"

"میں نے ایک درجن کیلے خرید لیئے تھے"۔

مجھے دفعتاً سخت ندامت ہوئی، کہ چلتے وقت سنڈوچز اس کے ساتھ کرنے مجھے کیوں نہ یاد رہے اور مجھے الن ماموں کے خط کا خیال آیا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اس کے پاس

پیسے تقریباً بالکل نہیں ہیں۔

کھانے کی میز پر اس نے کہا۔ "میں بہت دنوں بعد پیٹ بھر کے کھانا کھا رہا ہوں"۔ میں اس سے جرمنی کے متعلق باتیں کرتی رہی۔ برلن کی دیوار کا ذکر کرتے ہوئے اس نے مجھے اطلاع دی کہ وہ بہت سخت اینٹی کمیونسٹ ہے۔

"گھر پر میری اماں بھی میرے لئے بہت مزیدار کھانے پکاتی ہیں۔ آپ میری اماں سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ اب ان کی عمر بیالیس سال کی ہے۔ مصائب نے ان کو قبل از وقت بوڑھا کر دیا ہے، مگر وہ اب بھی دنیا کی حسین ترین عورت ہیں"۔

"تم ان کے اکلوتے لڑکے ہو؟"

"ہاں، میرے ابا فوجی افسر تھے۔ اماں پرشا کی رہنے والی ہیں۔ اماں سترہ سال کی تھیں، جب انھوں نے ابا سے شادی کی۔ ابا پولینڈ کے محاذ پر مارے گئے۔ ان کے مرنے کے دوسرے مہینے میں پیدا ہوا۔ بمباری سے بچنے کے لئے مجھے کندھے سے لگائے لگائے اماں جانے کہاں کہاں گھومتی رہیں۔ وہ مجھے گود میں اٹھائے، سر پر رومال باندھے فل بوٹ پہنے اپنا مختصر سا سامان میری پرمبولیٹر میں ٹھونسے گاؤں گاؤں پھرتی تھیں اور کھیتوں کھلیانوں میں چھپتی رہتی تھیں۔ اماں پولینڈ میں ایک گاؤں میں چھپی ہوئی تھیں جب پولش فوج اس رات اس مکان میں گھس آئے۔ میں اس وقت پورے چار سال کا تھا۔ میرے بچپن کی واضح ترین یاد اس قہرناک رات کی ہے —— میں ڈر کر پلنگ کے نیچے گھس گیا۔ جب افسروں نے میری اماں کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو میں زور زور سے رونے لگا۔ وہ اماں کو گھسیٹ کر باہر کھیتوں میں لے گئے۔ اماں کئی دن بعد واپس آئیں۔ وہ فوجیوں سے بچنے کے لئے اتنے عرصے تک ایک کھلیان میں چھپی رہی تھیں اور میں اس خالی مکان میں اکیلا تھا اور باہر گولیاں چلنے کی آواز پر سہم سہم کر کونوں کھدروں میں چھپتا پھرتا تھا اور نعمت خانے اور باورچی خانے کی الماریاں کھول کھول کر کھانے کی چیزیں تلاش کرتا تھا اور جو کچھ پڑا مل جاتا تھا بھوک

کے مارے منہ میں رکھ لیتا تھا۔ مگر وہ الماریاں سب اونچی اونچی تھیں جن میں کھانے پینے کا سامان رکھا تھا۔" وہ چپ ہوگیا اور خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف ہوگیا۔ "یہ چاول بہت مزے کے ہیں"۔ اس نے چند منٹ بعد آہستہ سے کہا۔

اسی وجہ سے میں جنگ کا تکلیف دہ ذکر اس سے نہ چھیڑنا چاہتی تھی۔ میں جنگ کے بعد بڑی ہونے والی نسل سے اس طرح کے لرزہ خیز واقعات سن چکی تھی۔ مجھے وہ فرانسیسی لڑکی یاد آئی جس نے زوالِ فرانس کے بعد اسی اوٹو کے ہم قوم جرمنوں کی درندگی کے قصے سنائے تھے۔ اسی پولینڈ میں جہاں اوٹو اور اس کی ماں پر یہ سب بیتی، اسی زمانے میں وہ نازی گیس چیمبر بھی دن رات کام کر رہے تھے جہاں روزانہ ہزاروں یہودیوں کو موت کے بھینٹ چڑھایا جاتا تھا اور —— مجھے اس روسی لڑکی کا قصہ یاد آیا۔ اپنے سارے خاندان کو اپنے سامنے جرمن مشین گن کی نذر ہوتے دیکھ کر پل کی پل میں صدمے کی شدت سے اس روسی لڑکی کے بال سفید ہوگئے تھے۔

یہ ۱۹۴۵ء کے بعد کے یورپ کی نوجوان نسل تھی۔

"اب تمھاری ماں کچھ کام کرتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، وہ محض ایک "ہاؤس فرا" ہیں۔ ان کو فوجی بیوہ کی حیثیت سے پنشن ملتی ہے۔ ہمارا چھوٹا سا دو کمروں کا مکان ہے۔ میں شام کی شفٹ میں ایک فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔ میری اماں بہت بھولی بھالی ہیں۔ اسٹرولوجی میں یقین رکھتی ہیں اور پابندی سے گرجا جاتی ہیں۔ پچھلے سال میں نے سائیکل پر سارے جرمنی کا چکر لگایا تھا —— جرمنی دنیا کا حسین ترین ملک ہے"۔

"ہر ملک اس کے باشندوں کے لئے دنیا کا حسین ترین ملک ہونا چاہئے۔ مگر تم 'نئے نازی' نہ بن جانا۔"

"نہیں۔ میں 'نیا نازی' نہیں بنوں گا۔ مجھے یہودیوں سے بہت زیادہ نفرت نہیں ہے"۔ اس نے سادگی سے کہا۔ مجھے ہنسی آگئی۔

"میرے نانا اور نانی اب بھی مشرقی جرمنی میں ہیں۔ مگر ہم ان سے نہیں مل سکتے ——
جس طرح آپ کا آدھا خاندان یہاں ہے، اور آدھا پاکستان میں"۔ اس نے کانٹا اٹھا کر مجھے سمجھایا۔

دوسرے روز اس نے وعدہ کیا کہ شہر کی قابلِ دید جگہیں ضرور دیکھ کر آئے گا۔ مگر وہ اس روز بھی دن بھر رانی باغ میں بیٹھا رہا۔

چوتھا دن اس نے وارڈن روڈ پر بھولا بھائی دیسائی انسٹی ٹیوٹ کے برآمدے میں بیٹھ کر لاؤس کی جنگ کے متعلق مضامین پڑھنے میں گزارا۔ اندر لڑکیاں رقص سیکھ رہی تھیں اور ہال میں حسین کی نئی تصاویر کی نمائش ہو رہی تھی۔ "لہٰذا میں ساتھ ساتھ آرٹ و کلچر سے بھی بہرہ ور ہوتا رہا"۔ اس نے واپس آکر کہا۔

بمبئی میں وہ سارے فاصلے پیدل طے کرتا تھا اور وارڈن روڈ سے فلورا فاؤنٹن تک پیدل جاتا تھا۔

"میں آٹھ آنے سے ایک روپیہ روز تک خرچ کرتا ہوں اور زیادہ تر کیلے کھاتا ہوں۔ ہر جگہ بے حد مہمان نواز لوگ مل جاتے ہیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ انسان انفرادی طور پر اس قدر سیدھا سادا اور نیک ہے اور اجتماعی حیثیت میں درندہ بن جاتا ہے ——؟" یہ سوال کرنے کے بعد وہ منہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس دن وہ ایک ٹرک کمپنی سے طے کر آیا تھا بنگلور تک ان کے ٹرک پر جائے گا۔ صبح سویرے اس نے اپنے تھیلے میں کتابیں اور کپڑے ٹھونسے، دوسرا تھیلا، جو اس کا سفری خیمہ اور بستر تھا، لپیٹ کر کندھے پر رکھا، خدا حافظ کہا اور ٹرانسپورٹ کمپنی کے دفتر فلورا فاؤنٹن پیدل روانہ ہو گیا۔

اوٹو کو گئے کئی مہینے گذر گئے۔ الّن ماموں کا خط آیا تو میں نے انھیں شکایتاً لکھا کہ آپ کے بیٹے اوٹو نے یہاں سے جا کر یہ بھی اطلاع نہ دی کہ کمبخت اب کہاں کی خاک چھان رہا ہے۔ میں نے یہ خط پوسٹ کیا ہی تھا کہ شام کی ڈاک سے اوٹو کا لفافہ آگیا۔ اس کے ٹکٹوں پر لاؤس کے بادشاہ کی تصویر بنی تھی اور خط میں لکھا تھا:

"وہ جرمن لڑکا جو آپ کے گھر پر ٹھہرا تھا آپ کو بھولا نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ بہت مہربان تھیں۔ (میری انگریزی کمزور ہے غلطیاں معاف کیجئے گا) آپ میرے ساتھ بڑی بہن کی سی شفقت سے پیش آئیں اور میں محبت پر بہت یقین رکھتا ہوں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ابھی بہت کم عمر ہوں، لیکن آپ نے ٹھیک کہا تھا، دنیا میں صرف وہی لوگ خوش رہ سکتے ہیں جو زندگی کو بغیر کسی پس و پیش کے اور بغیر سوالات کئے منظور کریں۔ ہم جتنے زیادہ سوالات کرتے ہیں اتنا ہی زیادہ انکشاف ہوتا ہے کہ زندگی کافی مہمل ہے۔

لنکا میں میں نیورا ایلیا سے کینڈی ایک ٹورسٹ بس کے ذریعے گیا۔ بس میں ایک سنگھالی طالب علم سے میری دوستی ہو گئی۔ اس نے راستے میں مجھے اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ اس کا نام راجہ تھا۔ اس نے میرے لئے پھل بھی خریدے۔ بس میں بہت سے ڈھول رکھے تھے۔ راجہ خوب گانے گاتا رہا۔ آبشار بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ راجہ نے مجھ سے کہا۔ چلو ہم سب نہائیں۔ چند منٹ بعد وہ مر چکا تھا۔ وہ پانی میں ڈوب گیا تھا۔ دو گھنٹے کی تلاش کے بعد اس کی اکڑی ہوئی لاش ہمیں ایک چٹان کے نیچے ملی۔ یہ سب کیا ہے۔ میں سوچتا رہا ہوں کہ یہ کیسے ہوا۔ ہم میں سے کوئی بھی راجہ کو اس حادثے سے بچا نہ سکتا تھا۔ کیا یہ اتفاق تھا یا اسی کو "قسمت" کہتے ہیں؟ راجہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس کے بہن بھائی پانچ اور پندرہ کی عمروں کے درمیان مر چکے تھے۔ اس کا باپ نابینا ہے اور ماں بہت بیمار۔ راجہ ان لوگوں کا کفیل تھا۔

مدراس میں ایک نوجوان شاعر نے مجھ سے کہا کہ دنیا کی وجہ سے وہ بہت دکھی ہے۔ مدراس میں میں نے ریڈیو انٹرویو سے کچھ روپے کمائے۔ پھر میں پینانگ گیا جو بڑا خوبصورت جزیرہ ہے اور وہاں بے شمار چینی رہتے ہیں۔

ایک مال گاڑی کے آخری ڈبے میں بیٹھ کر میں بنک کاک پہنچا اور بدھ خانقاہوں میں مقیم رہا اور راہبوں کے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔ دوپہر کو خوب صورت لڑکیاں خوش لباس خواتین اپنی قسمت اور مستقبل کا حال پوچھنے راہبوں کے پاس آتی تھیں۔

زیادہ تر بھکشو محبت کے بھوکے ہیں اور بے تحاشا تمباکو پیتے ہیں اور کوئی کام نہیں کرتے۔

بوڑھی مذہب پرست خواتین انھیں کھانا اور پیسے دیتی رہتی ہیں۔ بہت سے بھکشو خانقاہوں میں اس لئے بیٹھے ہیں کہ انھیں محنت کرنا اچھا نہیں لگتا۔ یہ لوگ سخت کاہل ہیں، مگر ان کے مذہب میں اس کاہلی کا ایک مقدس جواز موجود ہے ـــــ نروان کی تلاش ـــــ بعضے ان میں سے واقعی سنجیدگی سے مراقبے میں مصروف ہیں۔ لیکن زیادہ تر بھکشو کھانے اور خواتین سے گپ کرنے کے علاوہ سوتے رہتے ہیں۔

نانگ کائی میں میں میکانگ دریا میں نہایا اس کے بعد لاؤس آگیا۔

دین تین ایک بڑے سے گاؤں کی مانند ہے۔ دھوپ بہت تیز ہے اور سڑکیں گرد آلود۔ صرف راتیں خوشگوار ہیں کیونکہ اندھیرا ساری بدصورتی ظلم اور تشدد اور خون ریزی کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے مچھر بہت ہیں۔

سوانا تک ایک طیارے میں مجھے مفت کی لفٹ مل گئی اور اب میں پکسے میں موجود ہوں۔ پھر کمبوڈیا جاؤں گا۔ میں انکل انور کے پاس چٹا گانگ نہ جا سکا کیوں کہ برما سے مشرقی پاکستان داخل ہونے میں بڑی دقتیں تھیں۔ میں نے سرخ چین اور شمالی ویٹ نام کے لئے ویزا کی درخواست دی ہے۔ پیکنگ اور ہنوئی سے مجھے پھنوم پینہ میں جواب مل جائے گا۔ کل میں یہاں سے جنوبی ویٹ نام جا رہا ہوں۔

اس غلط سلط انگریزی کے لئے دوبارہ معافی چاہتا ہوں۔ آپ کا بہت شکر گذار۔

"ادلو کردگر"۔

○

فروری ۱۹۶۳ء کے ایک غیر ملکی رسالے میں "ویٹ نام کی جنگل وار" کے عنوان سے ایک رنگین تصویروں والا مضمون چھپا ہے۔ ان تصویروں میں گوریلا سپاہیوں کو بندوقوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ کشتیوں میں بیٹھے ہوئے گوریلا قیدی میکانگ دریا کے پار لے جائے جا رہے ہیں، اور کسان عورتیں یہ کشتیاں کھے رہی ہیں۔ کنارے پر پہنچ کر ان قیدیوں کو گولی مار

دی جائے گی۔ دھان کے کھیتوں کے پانی میں سے جنگی قیدی گذر رہے ہیں اور مضمون کے آخر میں دو صفحات پر پھیلی ہوئی ایک تصویر ہے۔ جس میں دھان کے ہرے کھیت ہیں اور دھان کی بالیاں ہوا کے جھونکوں سے جھکی جا رہی ہیں اور لمبے پتوں والے درخت ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ افق پر درختوں کی قطاریں ہیں اور سبزہ اور پانی۔ یہ ایسا دلفریب منظر ہے۔ مصوّر جس کی تصویریں بناتے ہیں، شاعر نظمیں کہتے ہیں اور افسانہ نگار "دھرتی کی عظمت" کے متعلق کہانیاں لکھتے ہیں۔ ان ہرے بھرے درختوں کے پیچھے کسانوں کے پرامن جھونپڑے ہوں گے اور اس گاؤں کے باسی تنکوں سے بنی ہوئی چھجے دار نوکیلی ٹوپیاں اوڑھے دن بھر پانی میں کھڑے رہ کر دھان بوتے ہوں گے اور گیت گاتے ہوں گے اور فصل تیار ہونے کے بعد منڈی میں جا کر محنت سے اگایا ہوا یہ دھان تھوڑے سے پیسوں میں فروخت کر کے اپنی زندگیاں گزارتے ہوں گے۔ اس ندی کے کنارے لڑکیاں اپنے چاہنے والوں سے ملا کرتی ہوں گی اور نوجوان مائیں رنگ برنگے سیرونگ پہنے، گھڑے اٹھائے اپنے بچّوں کو نہلانے کے لئے دریا پر آتی ہوں گی۔

لیکن اس تصویر میں جو اس وقت میرے سامنے رکھی ہے کٹے پھٹے چہروں والی نیم عریاں اور خون آلود نوجوان لاشیں پڑی ہیں دور ایک کونے میں بھورے رنگ کا مہیب جنگی طیارہ کھڑا ہے اور تصویر کے نیچے لکھا ہے:

"موت کا کھیت ـــــ ویت کونگ گوریلے جن کو میکانگ دریا کے دھان کے ڈیلٹا میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان کے ساتھی ایک دوسرے کے ساتھ رسّیوں سے بندھے سر جھکائے ایک کونے میں بیٹھے ہیں۔ اس خوں ریز دست بدست لڑائی میں ایک نوجوان ہیج ہائیکر بھی جو میکانگ دریا کے کنارے سے گذر کر شمالی ویٹ نام جا رہا تھا، ایک اتفاقیہ گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس خوبصورت ملک میں یہ بھیانک خانہ جنگی ۱۹۴۴ء سے جاری ہے اور ـــــ"

اور تو کر دگر زندگی کا تجربہ حاصل کرنے دنیا کے سفر پہ نکلا تھا۔

ملفوظات حاجی گُل بابا بیکتاشی

رات بھر میرے دریچے کے نیچے آذربائیجانی ترکی میں قوالی ہوا کی۔ صبح منہ اندھیرے آوازیں مدھم پڑیں اور کوہ قاف کے دھند لکے میں ڈوب گئیں۔

جب سورج نکلا میں نے سرائے کے باہر آکر آسمان پر رُخ کو تلاش کیا۔ لیکن رخ کے بجائے ایک فاختہ ارارت کی سمت سے اڑتی ہوئی آئی۔ فاختہ کی چونچ میں ایک عدد خط تھا۔ صحن میں آکر وہ اس سماوار پر بیٹھ گئی جو انگوروں کی بیل کے نیچے ایک کونے میں تپائی پر رکھا تھا۔

فاختہ نے پتلیاں گھما کر چاروں طرف دیکھا اور مجھ پر اس کی نظر پڑی۔ وہ پھدک کر سماوار سے اتری لفافہ میرے نزدیک گرایا اور کوہ ارارت کی طرف پھر سے اڑ گئی۔

سرائے کے مالک نے بغیر دودھ کی چائے فنجان میں انڈیل کر مجھے دی اور بولا "حانم۔ شاید رخ نے آپ کو اطلاع بھیجی ہے کہ اس نے اپنی فلایٹ پوسٹ پون کی"۔

"ہو سکتا ہے"۔ میں نے جواب دیا۔ "لیکن میرا خیال ایسا ہے کہ یہ ان دکھیاروں میں سے کسی ایک کا خط ہے جو اپنے لاپتہ عزیزوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ کچھ عرصے سے مجھے اس قسم کے پیغام مشرق و مغرب دونوں طرف سے اکثر ملا کرتے ہیں"۔

"کوئی تعجب نہیں کیوں کہ جنگیں ہر سمت جاری ہیں" سرائے کے سفید ریش مالک نے جو بالکل ٹالسٹائی کا حاجی مراد معلوم ہوتا تھا اور روسی بلاؤز کی چرمی پیٹی میں ایک عدد مرصع نقلی پستول رکھتا تھا۔ اطمینان سے حقہ گڑگڑاتے ہوئے دریافت کیا۔ "خانم۔ یہ والی جنگ کون سی تھی"؟

میں نے فنجان تخت کے کنارے پر رکھ کر خط پڑھا۔

تب میں نے طے کیا کہ وقت آگیا ہے کہ تلاش شروع کرنے کے لیے بالکل ابتدا کی طرف واپس چلا جائے۔

چنانچہ میں نے اپنا روزمرہ کا ماسک چہرے سے اتارا۔ حاجی مراد کو خدا حافظ کہا اور ارارت کی سمت چل پڑی جو سامنے جگمگا رہا تھا لیکن بہت دور تھا۔

میں دن بھر چلا کی۔ بہت سی وادیاں اور منزلیں طے کیں۔ عین غروب آفتاب کے وقت صنوبروں میں گھرا ایک شفق رنگ چشمہ نظر آیا۔ اس کے کنارے ایک نیلی آنکھوں اور سرخ ڈاڑھی والا فقیر مراقبے میں مشغول تھا۔ میں نے بغور دیکھا۔ وہ خواجہ سبز پوش نہیں تھا بلکہ جیسا کہ ان علاقوں کا دستور ہے۔ اس بزرگ نے فل بوٹ پہن رکھے تھے۔ اس کی سفید نمدے کی کلاہ اور دھاری دار چغے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اگلے وقتوں کا بیکتاشی درویش ہے۔

اب میں نے دیکھا کہ آفتاب اور بدر کامل دونوں افق پر موجود ہیں۔ صنوبروں پر رات کے پرند نغمہ زن ہوئے۔ پھر سورج اور چاند دونوں جھیل کے پانیوں میں گر گئے۔ جھیل کا رنگ سیاہ ہو گیا۔

اس بزرگ نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور "یاہو" کا نعرہ بلند کیا جو مجھے معلوم تھا کہ بیکتاشی فقرا کے سلام کا طریقہ ہے۔

دفعتاً اس پیر مرد نے بولنا شروع کیا۔ جیسے کسی نے ایک غیر مرئی ٹیپ ریکارڈر

چلا دیا ہو۔ اس نے کہا "میں اس عجیب روشنی میں سفر کرتا ہوں جو نہ زمین کی روشنی ہے نہ آسمانوں کی۔ جو انوارِ الٰہی کی سات روشنیوں سے مل کر بنی ہے۔ سنو کہ زندہ ابھی سے مر چکے ہیں۔ اور مردے زندہ ہیں۔ کھوپڑیاں چمکتے غاروں میں گا رہی ہیں۔ جب ان کی آوازیں سمندروں کا شور بن جاتی ہیں میں اپنے تکیے پر منتظر رہتا ہوں۔

"میں رات دن خوفِ الٰہی کی چکی پیستا ہوں اور خالق کی رضامندی کی چکی میں سے دانہ نکال لیتا ہوں۔ اے خانم۔ آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"افندم"۔ میں نے عرض کی۔ "ایک اجنبی عورت نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ یہاں سے ہزاروں میل دور ایک طوفانی دریا کے کنارے رہتی ہے اور اس نے لکھا ہے دریاؤں کی موجیں لوٹ لوٹ آتی ہیں۔ لیکن وقت نہیں لوٹتا۔ کیوں کہ زمین بھی بوگس ہے۔ خزاں کی ہوائیں چلیں۔ اور جنگلوں میں اونچے درختوں کے پتے سرخ ہو گئے۔ شاخیں کھڑکھڑائیں اور دلدلوں میں جنگلی بطخیں چلا رہی ہیں دماغ باقی ہیں۔ اور جسم ختم ہو گئے۔

"عرصہ دو سال کا ہوا میرا شوہر غائب ہو گیا۔ میں بادری سب سے پوچھتی پھرتی ہوں کوئی مجھے کچھ نہیں بتاتا۔ خاتون۔ آپ کو ترکوں کی سرزمین میں شاید کوئی واقفِ اسرار مل جائے۔"

جس وقت میں یہ خط پڑھ کر سنا رہی تھی شمشاد کے درخت کے نزدیک کھڑے اس بزرگ نے ہاتھ سامنے باندھ کر سر جھکا رکھا تھا۔

تب اس فقیر نے ہاتھ آستینوں سے نکالے اور نظریں اٹھائیں اور کہا "ملک ہنگری میں میرے جدِ امجد حاجی گل بابا بیکتاشی کی درگاہ ہے۔ ایک زمانہ تھا جب بخارا اور استانبول اور البانیہ اور رومانیہ سے کلمہ گو ان کے مزارِ پرانوار کی زیارت کے لیے پاپیادہ ہنگری جایا کرتے تھے۔ اے خانم۔ اب میں وہاں جاتا ہوں۔ اور واپس آ کر تمھیں اطلاع دیتا ہوں۔"

درویش نے ایک صنوبر کے سائے میں کھڑے ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد آنکھیں وا کیں اور یوں گویا ہوا "میں نے ڈینیوب کے کنارے اس شکستہ درگاہ پر ماضی اور مستقبل کا نظارہ کیا۔ سنو۔ جب میرا پردادا حاجی عدنان آفندی ایک کارواں کے ہمراہ ملک خطا جاتا تھا یارقند کے نزدیک اسے بیکتاش قلی یعنی بندہ خدا کے سلسلے کا ایک نوجوان فقیر ملا۔ اس نے حاجی عدنان کو پلٹ کر دیکھا۔ اور بولا "آغا۔ فکر کرو۔ فکر کرو۔ محتاط ہو"۔ اس کے بعد وہ شاہراہ کے کنارے آباد ایک نقش بندی خانقاہ کے دروازے میں غائب ہوا اور اسی لمحے دوسری طرف نکل گیا اور سمرقند میوزیم میں داخل ہو گیا۔ اب وہ سمرقند، ازبک سوشلسٹ سویٹ ریپبلک کے عجائب خانے کے ایک گلاس کیس میں کھڑا ہے اور اس کی آنکھیں کانچ کی ہیں۔ جانم۔ میرے ساتھ آئیے"۔

درویش نے اپنا عصا سنبھالا اور جھکا جھکا میرے سائے کی مانند میرے آگے آگے چلنے لگا۔

ہم جھیل وان کے کنارے ایک تکیے پر پہنچے یہ تکیہ ایک چوبی عمارت تھی جس کی چھت سرخ رنگ کی تھی اور چاروں طرف سیب کے درخت تھے۔ اس قلندر نے کہ اس لفظ کے معنی ہیں "خالص سونے کی روح"، مجھے سیڑھیوں پر کھڑا چھوڑ دیا اور ہوا کے جھونکے کی مانند اندر چلا گیا۔

جب وہ دیر تک باہر نہ آیا تو مجھے بہت ڈر لگا۔ میں دبے پاؤں دریچے کے نزدیک پہنچی اور اندر جھانکا۔

تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک چوکور کمرہ ہے جس کا فرش چوبی ہے اور چھت نیچی جس کے شہتیر سیاہ رنگ کے ہیں فرش پر ایک آذربائیجانی غالیچے پر دو بالکل ہم شکل درویش آمنے سامنے خاموش بیٹھے ہیں۔ ایک کونے میں چینی کا ایک فرنچ اسٹو رکھا ہے جس پر گلاب کے پھول بنے ہیں۔ ایک شہتیر سے ایک طنبورہ آویزاں ہے اور فرش پر ایک ... نے رکھی ہے کہ

مولانا جلال الدین رومی کی روحانی بانسری کی نمایندہ ہے۔

دونوں درویش چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر ان میں سے ایک اٹھا اور جنوب کی طرف رخ کیا جو مجھے معلوم تھا کہ مدینہ منورہ کی سمت تھی۔ درویش کے اپنے سفید پٹکے سے کہ آذربائیجانی بھیڑوں کی اون سے بنا گیا تھا ایک چھوٹا سا پتھر نکالا۔ کہ المصطفےٰ اکثر بھوکے رہنے کی وجہ سے اپنے پیٹ سے پتھر باندھے رہتے تھے۔ اور بیکتاشی فقرا اس سنت رسول کی پیروی کرتے ہیں۔ درویش نے بیکتاشی طریقت کی ایک رسم شروع کی۔ اس نے پٹکے کی گرہ باندھی اور کھولی اور پھر باندھی اور کھولی اور دہرایا "میں شر کو باندھتا اور خیر کو کھولتا ہوں۔ میں جہالت کو باندھتا اور خوف الٰہی کو کھولتا ہوں طمع کو باندھتا اور فیاضی کو کھولتا ہوں۔ میں عجز وانکساری کی درانتی سے پرہیزگاری کی فصل کاٹتا ہوں۔ میں خود آگہی میں بوڑھا ہوتا ہوں اور صبر کے تنور میں اپنی روٹی پکاتا ہوں"

تب میں دریچے سے چند قدم پیچھے ہٹی اور آسمان کی طرف منہ کیا اور ایک اور بیکتاشی مناجات پڑھی ——— "اے وہ جس کا کوئی نسب نامہ نہیں۔ اے بیکتاش جو زمانے کے ساتھ گردش کرتا ہے۔ جو شب تاریک میں سنگ سیاہ پر رینگتے چیونٹے کی آواز سن لیتا ہے"۔ لیکن اب میں نے بڑی چالاکی سے اپنے پیغام کا اضافہ کر دیا۔ "اے بیکتاش! بس تو مظلوموں کی فریاد ہی نہیں سنتا"۔

لیکن میری آواز درویشوں کے وظیفے کے شور میں ڈوب گئی۔ وہ اب چلا رہے تھے۔ "اے نبیؐ۔ جس پر بادل ہمیشہ اپنا سایہ کیے رہتے تھے۔ المصطفےٰ! ——— دنیا پر رحم فرما ——— رحم۔ رحم" "کریم اللہ ——— یاہو"۔ کے بیکتاشی نعروں سے کمرہ گونج اٹھا۔

دوسرے لمحے وہ درویش کہ نام ان کا حاجی سلیم آفندی تھا، ایک صراحی اور کوزہ ہاتھ میں لیے برآمد ہوئے۔ خانم۔ اس بد قسمت عورت کے لیے جو کچھ میں کر سکتا ہوں کروں گا۔ لیکن علی مرتضیٰ شاہِ ولایت نے کہا ہے جو کچھ لکھا گیا ہے ہمیشہ موجود رہے گا۔"

تب میں نے ایک بہت غیر متعلق بات حاجی سلیم سے کہی۔ میں نے عرض کیا۔
"افندم۔ میرے وطن میں جو یہاں سے ہزاروں میل دور ہے، ہماری آبائی حویلی میں جو اب کھنڈر ہو چکی ہے' ایک تہ خانہ ہے اس تہ خانے میں پرانی کتابوں کے انبار ہیں۔ اور ایک پرانا شکستہ چینی کا فرنچ اسٹوو۔ جس پر گلاب کے پھول بنے ہیں اور انٹیلکچوئل چوہے ان کتابوں کو کترنے میں مصروف ہیں جو دولت عثمانیہ اور برطانیہ اور فرانس اور مصر اور ایران میں کسی زمانے میں بڑے شوق سے لکھی اور چھاپی گئیں ـــــ قسطنطنیہ۔ ۱۸۷۲ء۔ لندن۔ ای۔ سی۔ فور۔ ۱۸۸۴ء۔ طہران۔ ۱۸۹۲ء۔ قاہرہ۔ ۱۹۰۲ء۔ اور ایک نسبتاً جدید کتاب بھی وہاں پڑی ہے۔ لندن رسل اسکوائیر۔ ۱۹۵۲ء۔ اور دفعہ کا ذکر ہے ایک کہر آلود سہ پہر میں فرنگیوں کے اس بزرگ صوفی سے ان کے فیبر اینڈ فیبر لہ رسل اسکوائر کے دفتر میں ملی تھی۔ اور انھوں نے مجھ سے رقصاں درویشوں کے متعلق باتیں کی تھیں۔ چونکہ آپ خود اس حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں، مجھے قونیہ کے اس مرحوم سلسلے کے متعلق کچھ بتلائیے کہ قونیہ بھی اب محض ایک ٹورسٹ اٹریکشن ہے"۔

درویش نے سر جھکایا اور رونے لگے پھر آنسو آستین سے پونچھے اور خود بھی ایک قطعی غیر متعلق بات کہی۔ "خانم"۔ حاجی سلیم نے فرمایا۔ "میں اس لیے روتا ہوں کہ قانون خداوندی کے مطابق میرا ہمزاد جو اندر بیٹھا ہے۔ میرے مرنے سے ٹھیک چالیس دن قبل مر جائے گا۔ ان چالیس دنوں میں کیا کروں گا؟ کیوں کہ وہ مجھے خبردار کرتا رہتا ہے"۔

دفعتاً حاجی سلیم پھر چلائے۔ "مولائے کائنات شاہ نجف نے فرمایا ہے۔ 'جو کچھ لکھا گیا ہے رہے گا'"۔

"افندم"۔ میں نے عرض کی۔ "اوپر والوں کی باتیں تو میں نہیں جانتی مگر جو کچھ یہاں لکھا جاتا ہے اکثر بے حد خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ آپ کو علم ہے۔ ہر حرف کا ایک موکل موجود ہے"۔

لہ FABER & FABER

درویش نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ "جب اس صاحبِ زماں نے حکمنامے پر دستخط کئے تو اس کے حروف کے طاقتور موکل اڑ کر یورپ کی سمت گئے اور انھوں نے تباہی پھیلادی۔ دماغ پاش پاش ہوئے اور جسموں کے پرخچے اڑ گئے ــــــ افندم۔ میں اس اجنبی عورت کو کیا جواب دوں؟"

"فکر کرو۔ فکر کرو۔ محتاط ہو۔ خبر دار رہو۔"

"اس اجنبی خاتون نے لکھا ہے کہ اس کے خاوند کا نام ابوالمنصور تھا۔ اور وہ تصویریں بناتا تھا۔"

"کیا وہ اپنی کھوپڑی بچانے کے لئے جنگل کی سمت نہیں بھاگا"؟ حاجی سلیم نے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔ اجنبی عورت نے لکھا ہے کہ وہ ایک تالاب کے کنارے بیٹھا جنگلی بطخوں کی تصویریں بناتا رہا۔"

"نہایت احمق تھا۔" حاجی سلیم نے مختصراً کہا۔

"اور ہزاروں لاکھوں انسان جنگلوں اور دلدلوں اور سرحدوں کی طرف بھاگے۔ اور زمین ان کے پیروں تلے سے نکل چکی تھی اور سروں پر تلواروں کا سایہ تھا۔"

"کوئی تلوار نہیں سوا ذوالفقارِ علیؑ کے"۔ حاجی سلیم نے بات کاٹی۔

میں خاموش ہو گئی۔

"کیا جب قیامت آئی شخص مذکور تنہا تھا؟" حاجی سلیم نے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔ مرگِ انبوہ کے جشن میں شامل تھا۔"

"یہ کہاں کا ذکر ہے۔"

"ہر جگہ کا۔ مشرق۔ مغرب۔ شمال۔ جنوب بیکتاش کا چہرہ ہر سمت ہے۔"

حاجی سلیم نے غور سے مجھے دیکھا۔ "حانم۔ کیا تم ان میں سے نہیں، ہو جو ایمان لائے ؟"
میں نے بات جاری رکھی۔ "اور لاکھوں سرحدوں کی طرف بھاگے۔ وہ بہ حالت خموشی مشرق سے مغرب کی جانب آئے اور اسی طرح سر جھکائے پھر واپس لوٹ گئے۔ تب میں نے بہت سوچا کہ یہ سب کیوں ہوا۔ اور مجھے یاد آیا۔ لکھا ہے : جو اپنی روح کا حج کرے اس پر اسرار منکشف ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنی روح کا حج کیا پر کچھ دریافت نہ ہوا۔"
"حانم۔ شاید تمھارے قلب پر کفر کی مہر گہری لگی ہے" حاجی سلیم نے کہا اور صراحی سے تھوڑا سا پانی کوزے میں انڈیلتے ہوئے ایک بیکتاشی دعا پڑھی —— "کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔ اور محمدؐ اس کا رسول۔ اور علی اس کا دوست۔ اور امام مہدی آخر الزماں۔ اور موسیٰ کلیم اللہ اور عیسیٰ روح للہ —— حانم اس پانی میں دیکھو۔"
"کیوں۔ کیا آپ کو جام جمشید مل گیا ہے ؟" میں نے ذرا جھنجھلا کر پوچھا۔
"حانم۔ پانی میں دیکھو۔"
میں نے دیکھا۔ اور کہا۔ "افندم۔ اس میں تو مجھے ایک عدد گھوڑا گاڑی نظر آتی ہے۔ یعنی اسٹیج کوچ۔ جو ایک جاپانی سے پل پر سے گذر رہی ہے۔" پھر دفعتاً میں نے ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے COMMENTATOR کی طرح جوش سے کہنا شروع کیا "اور اس گاڑی میں ایک کٹھ پتلی نوہ ماسک پہنے بیٹھی ہے —— اور کوچوان کا چہرہ نہیں ہے —— کوچوان کا چہرہ نہیں ہے —— اور اب ایک ناؤ جو وسیع دریا کے دھندلکے میں رواں ہے۔ اور کنارے پر نازک سے پہاڑ اور بانس کے جھنڈ اور بید کے پودے۔ اور پہاڑی کے دامن میں بانس کا جھونپڑا۔ اس کے برآمدے میں ایک منحنی انسان۔ بکرے کی سی داڑھی —— بیٹھا تصویر بنا رہا ہے —— افندم —— یہ سب تو کچھ زین سا معلوم ہوتا ہے ——"
"زین بھی درست ہے۔ حانم۔ اور غور سے دیکھو۔ ناؤ یا بکتر بند گاڑیاں —— ؟"

"افندم ـــــ افندم ـــــ آپ کے پیالے کا پانی سرخ ہو گیا!"

"کریم اللہ ـــــ یا ہو ـــــ" حاجی سلیم نے ٹھنڈی سانس لے کر آہستہ سے دہرایا۔ کوزہ اٹھا کر سر جھکائے سیڑھیاں اترے سیب کے جھرمٹ سے گذرتے جھیل کے کنارے پہنچے اور دفعتاً اس مشاقی اور پھرتی سے کوزہ دور پانی میں پھینک دیا جیسے کرکٹ کے کھلاڑی گیند پھینکتے ہیں۔ پھر وہ تکیے پر واپس آئے اور سیڑھی پر بیٹھ کر کہنا شروع کیا۔ "میں خوف الٰہی کی چکی پیستا ہوں۔ اور نفرت اور ظلم کو باندھتا ہوں۔ اور محبت اور درد مندی کو کھولتا ہوں۔ اور غیظ و غضب کو باندھتا ہوں ـــــ اے خانم ہندی ـــــ کیا یہ شخص ابوالمنصور ایک انسان تھا یا ایک علامت؟"

"دونوں"۔ میں نے جواب دیا۔

حاجی سلیم نے سر جھکا کر دوبارہ رونا شروع کیا۔

"کیا میں اس خاتون کو لکھ دوں کہ وہ صبر کے تنور میں اپنی روٹی پکاتی رہے؟" میں نے پوچھا۔ "افندم۔ اب میں شاہ جہاں آباد واپس جاتی ہوں۔ آپ بھی استانبول لوٹ جائیے اور وہاں محلہ پیرا یا توپ کاپو میں اپنا تکیہ مولوی آباد کیجئے یا خانقاہ اوغلو علی پاشا۔"

"خانم۔ میرے واپس جانے کے لئے اب کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ استانبول کے دو سو چھپن تکیے نصف صدی ہونے آئی ایک صاحب الزماں کے حکم سے بند کر دیے گئے۔ چند ایک کے ماڈل عجائب خانوں میں رکھے ہیں۔ یہ فقیر حقیر بھی ایک گلاس کیس میں کھڑا ہے ـــــ" حاجی سلیم نے کہا اور آنسو بہاتے رہے۔ دفعتاً میں نے نوٹس کیا کہ حاجی سلیم کی نیلی آنکھیں کانچ کی تھیں۔

"بہرحال۔ افندم۔ آپ جہاں کہیں بھی واپس جائیں اس بیکتاش سے کہہ دیجئے گا کہ ساری دنیا میں، مشرق و مغرب شمال و جنوب میں، اس کے قلیوں پر بہت ظلم ہوئے اور ہو رہے ہیں ـــــ اور دعا کرتے رہئے۔"

"ہم بیکتاشی محض دعا نہیں کرتے۔ حانم۔ تم نماز پڑھتی ہو؟ سیدھی سادی نماز؟ ہم نماز پڑھنے کو دارِ منصور پر چڑھنا کہتے ہیں۔ میں روز دار منصور پر چڑھتا ہوں۔ اور فنا ہوتا ہوں۔ اور زندہ ہوتا ہوں۔ چونکہ تم ایسا کبھی نہ کرو گی تمھیں کچھ معلوم نہ ہوگا۔ میں روزانہ خواہشات کو باندھتا اور قناعت کو کھولتا ہوں۔ خدا صابر ہے کیوں کہ حی و قیوم ہے۔ بندہ بے صبر ہے۔ کیوں کہ اس کی زندگی چند روزہ ہے۔ اور وقت تیزی سے گذرتا جاتا ہے۔"

تب میں نے ذرا بے ادبی سے کہا۔ "افندم۔ آپ کو ہسپانیہ کے حاجی یوسف بیکتاشی کا نام یاد ہے؟ پندرھویں صدی عیسوی میں وہ علیہ الرحمتہ اندلس میں موجود تھے۔ جب مسلمانوں پر قہر ٹوٹا ان کا اور ان کے مریدوں کا صبر و رضا کسی کام نہ آیا۔"

حاجی سلیم نے میری بات کا مطلق نوٹس نہ لیا اور کہتے رہے "میں انوار الٰہی کی روشنی میں سفر کرتا ہوں۔ میں ننانوے اسمائے الٰہی کی روشنی میں چلتا ہوں۔ ہو جو برنگ سرخ ہے۔ احد سبز اور عزیز جو سیاہ ہے اور ودود جس کی ذات میں روشنی نہیں ــــــ حاجی سلیم بیکتاشی کی گفتگو ختم ہوئی ــــــ"

معاً غیر مرئی ٹیپ ریکارڈر میں سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں جیسے کسی نے اسے الٹا چلا دیا ہو۔ کیوں کہ وجود متعدد حصوں میں منقسم ہے۔

حاجی سلیم سامنے دیکھتے دیکھتے اپنا لبادہ سر سراتے تکیے کے اندر جا کر غائب ہو گئے۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس میں زنگ آلود موٹا قفل پڑا تھا۔

میں نے انگور کی بیلوں سے گھرے دریچے میں جا کر اندر جھانکا۔ حاجی سلیم اور ان کا ہمزاد اپنے اپنے ہاتھ سامنے باندھے گم سم آمنے سامنے دو زانو بیٹھے تھے۔ دیکھتے دیکھتے وہ دونوں پیلے پرانے کاغذوں میں تبدیل ہو گئے۔ کوہ ارارات کی طرف سے ہوا کا ایک تیز سرد جھونکا آیا جس میں دریچے کے شکستہ پٹ بھڑ سے کھل گئے اور وہ دونوں درویش پرزہ پرزہ ہو کر کمرے میں بکھر گئے باہر آ کر ان کے پرزے فضا میں چکر کاٹنے لگے اور خستہ

فالتو کاغذوں کی طرح ہوا میں اڑ گئے۔

○

رخ تغلق آباد کی سرزمین پر اترا اور اپنے پنکھ پھیلا دیئے۔ میں نے نیچے آکر شہر کا رخ کیا۔ راہ میں سوچتی تلاش یہاں از سرِ نو شروع کرنے سے قبل اپنے پرانے دھرانے ماسک کی مرمت کروانا ضروری ہے۔ گو میں زیادہ مدت بعد واپس نہیں آئی تھی لیکن شہر بدل گیا تھا۔ تب اندر پرستھ کی ایک گلی میں میں نے ایک رتھ بان سے پوچھا۔ "او بھائی رتھ بان۔ جمبو دویپ کی تازہ ترین آج کل کی راجدھانی کا راستہ کدھر ہے؟" اس نے کہا "معلوم نہیں" اور گھوڑوں پر چابک لگا کر ہوا ہو گیا۔

تب میں اور آگے بڑھی۔ اور ایک تورانی شہسوار سے دریافت کیا۔ "او بھائی شہسوار اگر میں تغلق آباد پہنچ گئی ہوں تو کسی ایسے کارخانے کا راستہ بتاؤ جہاں میں اپنے ماسک کی مرمت کروا سکوں"۔

شہسوار نے جواب دیا۔ "بی بی سامنے قتلق نگار خانم کا مقبرہ ہے۔ یعنی تھا۔ اس کے اوپر جو ایر کنڈیشنڈ عمارت کھڑی ہے۔ اس کے اندر وہ قدیم خاتون جو رائیڈر ہیگرڈ کے ناولوں میں SHE کے نام سے ایکٹنگ کیا کرتی تھی اب بیوٹی پارلر چلاتی ہے"۔

لہٰذا میں اس کارخانے پر پہنچی۔ اس کے سامنے ایسا ہجوم تھا جیسے کوئی مر گیا ہو۔ میں نے اندر جھانکا۔ ہیروں سے جگمگاتی بہت سی عورات ایک قطار میں خوفناک مشینوں کے نیچے سر دئے ساکت و صامت بیٹھی تھیں۔ اور مزید عورات اس طرح آ رہی تھیں جیسے فرنگستان میں مردے MORTICIANS کے یہاں آتے ہیں۔

دہشت زدہ ہو کر میں الٹے پاؤں باہر نکلی تو شاہجہاں آباد کی ایک گلی میں ایک چگی داڑھی والے نوجوان نے میرا راستہ روکا اور گویا ہوا —— "اے اس قدر CONFUSED نظر آنے والی بھارتیہ مہیلا۔ میں ایک پردیسی مسافر ہوں اور مجھے بھوک لگی ہے۔ کسی ایسی

جگہ کا پتہ بتلا سکتی ہو جہاں میں دریائی مچھلی اور اچھا بھات کھا سکوں ؟"

میں اسے جامع مسجد کے قریب ایک بھٹیار خانے میں لے گئی جہاں قلعے کے چبوترے "سلاطینوں" اور شعراء کی آمد و رفت رہتی تھی۔ دیکھا تو بھٹیار خانہ سنسان پڑا تھا۔ میں بہت مایوس نظر آئی تو اس اجنبی نوجوان نے کہا۔ "بانوئے محترم۔ آئیے نیوڈیلی چلتے ہیں۔"

نیوڈیلی کے ایک MOD ریستوران میں چگی داڑھی والا یوں داخل ہوا جیسے بطخ پانی میں داخل ہوتی ہے۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ شخص نامعلوم آرٹسٹ ہے۔ اس طعام خانے میں مرد اور عورتیں بالکل یکساں نظر آ رہے تھے۔ بلکہ عورتیں مرد اور مرد لڑکیاں معلوم ہوتے تھے کہ یہ UNISEX کہلاتا ہے۔

پردیسی نوجوان نے دریچے کے قریب میز پر بیٹھ کر دریائی مچھلی منگوائی اور کہا کہ گو وہ اب ہمارا دوست اور حلیف ہے۔ لیکن اپنا بل خود ادا کرے گا۔

تب میں نے اس سے کہا۔ "او بھائی پردیسی مہمان۔ میں تمہاری اس خودداری کی قدر کرتی ہوں۔ لیکن تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

وہ نوجوان دریچے سے باہر دیکھتا رہا جہاں ترک بادشاہوں کے خستہ مقبروں میں غریب غربا ٹاٹ کے جھونپڑے ڈالے شام کا کھانا پکا رہے تھے کیوں کہ بہر حال سب کچھ زین ہے اور بیکتاش کا چہرہ ہر طرف ہے۔

اچانک اس نوجوان نے حاجی سلیم آفندی کی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "کٹھ پتلیاں ستلیوں سے آویزاں اسٹیج پر آتی جاتی ہیں۔ تماشاگر ایک ستلی اوپر کھینچ لیتا ہے۔ دوسری کٹھ پتلی نیچے اتار دیتا ہے۔"

"یہ بھی درست ہے"۔ میں نے حاجی سلیم آفندی کی مانند جواب دیا۔ پھر میں نے مستعدی اجنبی عورت کا خط پرس میں سے نکالا اور بولی۔ "او بھائی مسافر۔ زندہ مردوں کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور مردے زندوں کے۔ اور تصویروں کی تصویریں باقی ہیں چونکہ تم

طوفانی دریاؤں کی سمت سے آئے ہو ممکن ہے تم نے مصور ابو المنصور کا نام سنا ہو۔"
مسافر کھانا کھاتا رہا۔ کیوں کہ کھانا پیدائش اور موت اور ازل اور ابد کے درمیان سب سے بڑی اور اٹل حقیقت ہے۔ گو ہم سے کہا گیا تھا کہ بھوک کو باندھو اور قناعت کو کھولو۔ تاکہ کچھ لوگوں باقی لوگوں سے زیادہ کھا سکیں۔

میں نے پھر دریافت کیا۔ "تم یہاں کاہے کی جستجو میں آئے ہو؟"

"کیا جستجو ضروری ہے؟" اس نے کہا۔ "میں یہاں نیشنل اسکول آف ڈراما میں آپ کی حکومت کے اسکالرشپ پر فن تماشاگری سیکھنے آیا ہوں جس فن کے آپ لوگ ماہر ہیں۔"

"کیا تم ان لوگوں کے قبیلے سے ہو جو نقلی چہرے لگا کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کوئی اور ہیں؟ کیا تمھارے ماں باپ اداکار ہیں؟"

"میرا باپ جنگلی بطخوں کی تصویریں بناتا تھا۔"

"کیا اب بھی وہ زندوں میں شامل ہے؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

تب نوجوان نے اکتا کر کہا "شاید میری ماں نے آپ کو بھی خط لکھا ہے۔ وہ طرح طرح کے لوگوں کو خط لکھ لکھ کر میرے باپ کی کھوج میں مصروف ہیں اور یہ یقین کرنے کو ہرگز تیار نہیں کہ میرے باپ کو صبح پانچ بجے طلوع آفتاب سے قبل مکان سے باہر لے جا کر عالم بالا روانہ کر دیا گیا تھا۔"

اس کے بعد اس شخص کم نام نے کھانا ختم کیا۔ سکون سے خدا حافظ کہا اور ریستوران سے باہر چلا گیا۔

میں نے دریچے میں سے دیکھا۔ نئی دہلی کی سڑکیں بارش میں بھیگ رہی تھیں۔ اتنے میں دور سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ اور ایک گھوڑا گاڑی قتلق نگار خانم کے مقبرے کے پیچھے سے نمودار ہوئی۔ اور سنسان سڑک پر سامنے سے گذر گئی۔ اس اسٹیج کوچ کے اندر ایک کٹھ پتلی نوہ ماسک لگائے بیٹھی تھی۔ کوچوان نے شوگن عہد کا کیمونو پہن رکھا تھا۔ کوچوان

نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ اور اس کا چہرہ نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے ماسک کو چھوا۔ اور مجھے یہ خوفناک احساس ہوا کہ میں یہ محض ظاہر ہی نہیں کرتی کہ میں کوئی اور ہوں۔ میں واقعی کوئی اور ہوں۔ اور ایک ایسی توہ تمثیل میں شامل ہوں جو کسی کے سمجھ میں نہیں آتی۔

○

عزیز من۔ آج سے چھ سو برس قبل حاجی گل بابا بیکتاشی علیہ الرحمتہ نے یہ معمہ اپنے مریدوں کے سامنے رکھا تھا جب وہ نیلے ڈینیوب کے کنارے عثمانی مملکتِ ہنگری میں اپنی خانقاہ کے اندر بیٹھے حکایاتِ قدیم و جدید کے ذریعہ درس دیا کرتے تھے۔

○

"اور اس مقام پر میرا راگ ختم ہوا۔ اے دیناؤ۔ اب رخصت ہو۔ اور واپس جاؤ۔" مولانا جلال الدین رومیؒ نے کہا اور نے ہاتھ سے رکھ دی۔

فوٹوگرافر

موسم بہار کے پھولوں سے گھرا بے حد نظر فریب گیسٹ ہاؤس ہرے بھرے ٹیلے کی چوٹی پر دور سے نظر آجاتا ہے۔ ٹیلے کے عین نیچے پہاڑی جھیل ہے۔ ایک بل کھاتی سڑک جھیل کے کنارے کنارے گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک تک پہنچتی ہے۔ پھاٹک کے نزدیک دالرس کی ایسی مونچھوں والا ایک فوٹوگرافر اپنا ساز و سامان پھیلائے ایک ٹین کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ یہ گم نام پہاڑی قصبہ ٹورسٹ علاقے میں نہیں ہے اس وجہ سے بہت کم سیاح اس طرف آتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی ماہِ عسل منانے والا جوڑا یا کوئی مسافر گیسٹ ہاؤس میں آپہنچتا ہے تو فوٹوگرافر بڑی امید اور صبر کے ساتھ اپنا کیمرہ سنبھالے باغ کی سڑک پر ٹہلنے لگتا ہے۔ باغ کے مالی سے اس کا سمجھوتا ہے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری کسی نوجوان خاتون کے لئے صبح سویرے گلدستہ لے جاتے وقت مالی فوٹوگرافر کو اشارہ کر دیتا ہے اور جب ماہِ عسل منانے والا جوڑا ناشتے کے بعد نیچے باغ میں آتا ہے تو مالی اور فوٹوگرافر دونوں ان کے انتظار میں چوکس ملتے ہیں۔

فوٹوگرافر مدتوں سے یہاں موجود ہے نہ جانے اور کہیں جا کر اپنی دکان کیوں نہیں سجاتا۔ لیکن وہ اسی قصبے کا باشندہ ہے۔ اپنی جھیل اور اپنی پہاڑی چھوڑ کر کہاں جائے۔

اس پھاٹک کی پلیا پر بیٹھے بیٹھے اس نے بدلتی دنیا کے رنگارنگ تماشے دیکھے ہیں۔ پہلے یہاں صاحب لوگ آتے تھے۔ برطانوی پلانٹرز سفید سولا ہیٹ پہنے کولونیل سروس کے جفادری عہدے دار، ان کی میم لوگ اور بابا لوگ۔ رات رات بھر شرابیں اڑائی جاتی تھیں اور گراموفون ریکارڈ چیختے تھے اور گیسٹ ہاؤس کے نچلے ڈرائنگ روم کے چوبی فرش پر ڈانس ہوتا تھا دوسری بڑی لڑائی کے زمانے میں امریکن آنے لگے تھے۔ پھر ملک کو آزادی ملی اور اکا دکا سیاح آنے شروع ہوئے۔ یا سرکاری افسر یا نئے بیاہے جوڑے یا مصور یا کلاکار جو تنہائی چاہتے ہیں ایسے لوگ جو برسات کی شاموں کو جھیل پر جھکی دھنک کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں، ایسے لوگ جو سکون اور محبت کے متلاشی ہیں جس کا زندگی میں وجود نہیں، کیوں کہ ہم جہاں جاتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے۔ ہم جہاں ٹھہرتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے۔ فنا مسلسل ہماری ہم سفر ہے۔

گیسٹ ہاؤس میں مسافروں کی آدک جادک جاری ہے۔ فوٹوگرافر کے کیمرے کی آنکھ یہ سب دیکھتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔

ایک روز شام پڑے ایک نوجوان اور ایک لڑکی گیسٹ ہاؤس میں آن کر اترے۔ یہ دونوں اندازے سے ماہِ عسل منانے والے معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن بے حد مسرور اور سنجیدہ سے، وہ اپنا سامان اٹھائے اوپر چلے گئے۔ اوپر کی منزل بالکل خالی پڑی تھی زینے کے برابر میں ڈائننگ ہال تھا اور اس کے بعد تین بیڈ روم۔

"یہ کمرہ میں لوں گا۔" نوجوان نے پہلے بیڈ روم میں داخل ہو کر کہا جس کا رخ جھیل کی طرف تھا۔ لڑکی نے اپنی چھتری اور اوورکوٹ اس کمرے کے ایک پلنگ پر پھینک دیا تھا۔

"اٹھاؤ اپنا بوریا بستر۔" نوجوان نے اس سے کہا۔

"اچھا ——" لڑکی نے دونوں چیزیں اٹھا کر برابر کے سٹنگ روم سے

گذرتی دوسرے میں چلی گئی جس کے پیچھے ایک پختہ گلیارہ سا تھا کمرے کے بڑے بڑے دریچوں میں سے وہ مزدور نظر آرہے تھے جو ایک سیڑھی اٹھائے پچھلی دیوار کی مرمت میں مصروف تھے۔

ایک بیرہ لڑکی کا سامان لے کر اندر آیا اور دریچوں کے پردے برابر کر کے چلا گیا، لڑکی سفر کے کپڑے تبدیل کر کے سٹنگ روم میں آگئی۔ نوجوان آتش دان کے پاس ایک آرام کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا، اس نے نظریں اٹھا کر لڑکی کو دیکھا۔ باہر جھیل پر دفعتاً اندھیرا چھا گیا تھا وہ دریچے میں کھڑی ہو کر باغ کے دھندلکے کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی، نہ جانے وہ دونوں کیا باتیں کرتے رہے۔ فوٹوگرافر جواب بھی نیچے پھاٹک پر بیٹھا تھا اس کا کیمرہ آنکھ رکھتا تھا لیکن سماعت سے عاری تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں کھانا کھانے کے کمرے میں گئے اور دریچے سے لگی ہوئی میز پر بیٹھ گئے۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر قصبے کی روشنیاں جھلملا اٹھی تھیں۔

اس وقت تک ایک یورپین سیاح بھی گیسٹ ہاؤس میں آچکا تھا۔ وہ خاموش ڈائننگ ہال کے دوسرے کونے میں چپ چاپ بیٹھا خط لکھ رہا تھا چند پکچر پوسٹ کارڈ اس کے سامنے میز پر رکھے تھے۔

"یہ اپنے گھر خط لکھ رہا ہے کہ میں اس وقت پراسرار مشرق کے ایک پراسرار ڈاک بنگلے میں موجود ہوں۔ سرخ ساری میں ملبوس ایک پراسرار ہندوستانی لڑکی میرے سامنے بیٹھی ہے۔ بڑا ہی رومانٹک ماحول ہے!" لڑکی نے چپکے سے کہا۔ اس کا ساتھی ہنس پڑا۔

کھانے کے بعد وہ دونوں پھر سٹنگ روم میں آگئے۔ نوجوان اب اسے کچھ پڑھ کر سنا رہا تھا، رات گہری ہوتی گئی۔ دفعتاً لڑکی کو زور کی چھینک آئی اور اس نے سوں سوں کرتے ہوئے کہا ــــــ "اب سونا چاہئے"۔

"تم اپنی زکام کی دوا نہ پینا نہ بھولنا" نوجوان نے فکر سے کہا۔

"ہاں شب بخیر ——" لڑکی نے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی پچھلا گلیارہ گھپ اندھیرا پڑا تھا، کمرہ بے حد پر سکون، خنک اور آرام دہ تھا زندگی بے حد پر سکون اور آرام دہ تھی، لڑکی نے کپڑے تبدیل کر کے سنگھار میز کی دراز کھول دوا کی شیشی نکالی کہ دروازے پر دستک ہوئی اس نے اپنا سیاہ کیمونو پہن کر دروازہ کھولا۔ نوجوان ذرا گھبرایا ہوا تھا سامنے کھڑا تھا۔ "مجھے بھی بڑی سخت کھانسی اٹھ رہی ہے"۔ اس نے کہا۔

"اچھا —— !" لڑکی نے دوا کی شیشی اور چمچہ اسے دیا۔ چمچہ نوجوان کے ہاتھ سے چھٹ کر فرش پر گر گیا، اس نے جھک کر چمچہ اٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا، لڑکی روشنی بجھا کر سو گئی۔

صبح کو وہ ناشتے کے لئے ڈائننگ روم میں گئی۔ زینے کے برابر والے ہال میں پھول مہک رہے تھے۔ تانبے کے بڑے بڑے گلدان براسو سے چمکائے جانے کے بعد ہال کے جھلملاتے چوبی فرش پر ایک قطار میں رکھ دیئے گئے تھے اور تازہ پھولوں کے انبار ان کے نزدیک رکھے ہوئے تھے۔ باہر سورج نے جھیل کو روشن کر دیا تھا اور زرد و سفید تتلیاں سبزے پر اڑتی پھر رہی تھیں کچھ دیر بعد نوجوان ہنستا ہوا زینے پر نمودار ہوا، اس کے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا ایک گچھا تھا۔

مالی نیچے کھڑا ہے، اس نے یہ گلدستہ تمہارے لئے بھجوایا ہے"۔ اس نے کمرے میں داخل ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اور گلدستہ میز پر رکھ دیا۔

لڑکی نے ایک شگوفہ اٹھا کر بے خیالی سے اسے اپنے بالوں میں لگا لیا اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

"ایک فوٹو گرافر بھی نیچے منڈلا رہا ہے، اس نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے تمہارے متعلق دریافت کیا کہ تم فلاں فلم سٹار تو نہیں ہو"۔

نوجوان نے کرسی پر بیٹھ کر چائے بناتے ہوئے کہا۔

لڑکی ہنس پڑی۔ وہ ایک نامور رقاصہ تھی۔ مگر اس جگہ پر کسی نے ان کا نام بھی نہ سنا تھا۔ نوجوان لڑکی سے بھی زیادہ مشہور موسیقار تھا۔ مگر اسے بھی یہاں کوئی نہ پہچان سکا تھا۔ ان دونوں کو اپنی اس عارضی گم نامی اور مکمل سکون کے یہ مختصر لمحات بہت بھلے معلوم ہوئے۔

کمرے کے دوسرے کونے میں ناشتہ کرتے ہوئے اکیلے یورپین نے آنکھیں اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا اور ذرا سا مسکرایا۔ وہ بھی ان دونوں کی خاموش مسرت میں شریک ہو چکا تھا۔

ناشتہ کے بعد وہ دونوں نیچے گئے اور باغ کے کنارے گل مہر کے نیچے کھڑے ہو کر جھیل کو دیکھنے لگے۔ فوٹوگرافر نے اچانک چھلاوے کی طرح نمودار ہو کر بڑے ڈرامائی انداز میں ٹوپی اتاری اور ذرا جھک کر کہا۔

"فوٹوگراف لیڈی ———؟"

لڑکی نے گھڑی دیکھی۔ "ہم لوگوں کو ابھی باہر جانا ہے۔ دیر ہو جائے گی"۔

"لیڈی ———" فوٹوگرافر نے پاؤں منڈیر پر رکھا اور ایک ہاتھ پھیلا کر باہر کی دنیا کی سمت اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "باہر کارزارِ حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے۔ مجھے معلوم ہے اس گھمسان سے نکل کر آپ دونوں خوشی کے چند لمحے چرانے کی کوشش میں مصروف ہیں دیکھئے اس جھیل کے اوپر دھنک پل کی پل میں غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا ——— ادھر آئیے"۔

"بڑا لسان فوٹوگرافر ہے"۔ لڑکی نے چپکے سے اپنے ساتھی سے کہا۔

مالی جو گویا اب تک اپنے کیو کا منتظر تھا دوسرے درخت کے پیچھے سے نکلا اور لپک کر ایک اور گلدستہ لڑکی کو پیش کیا۔ لڑکی کھِل کھِلا کر ہنس پڑی وہ اور اس کا ساتھی

امر سندری پاروتی کے مجسمے کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ لڑکی کی آنکھوں میں دھوپ آ رہی تھی اس لیئے اس نے ذرا مسکراتے ہوئے آنکھیں ذرا سی چندھیا دی تھیں۔

کلک .... کلک .... تصویر اتر گئی۔

"تصویر آپ کو شام کو مل جائے گی .... تھینک یو لیڈی .... تھینک یو سر...."

فوٹوگرافر نے ذرا سا جھک کر دوبارہ ٹوپی چھوئی۔

لڑکی اور اس کا ساتھی کار کی طرف چلے گئے۔

سیر کر کے وہ دونوں شام پڑے لوٹے اور سندھیا کی نارنجی روشنی میں دیر تک باہر گھاس پر پڑی کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ جب کہرہ گرنے لگا تو اندر نچلی منزل کے وسیع اور خاموش ڈرائنگ روم میں نارنجی قمقموں کی روشنی میں آ بیٹھے۔ نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے جو کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں کھانے کے وقت وہ اوپر چلے گئے۔ صبح سویرے وہ واپس جا رہے تھے اور اپنی باتوں کی محویت میں ان کو فوٹوگرافر اور اس کی کھینچی ہوئی تصویر یاد بھی نہ رہی تھی۔

صبح کو لڑکی اپنے کمرے ہی میں تھی جب بیرے نے اندر آ کر ایک لفافہ پیش کیا۔

"پھوٹوگرافر صاحب یہ رات کو دے گئے تھے"۔ اس نے کہا۔

"اچھا۔ اس سامنے والی دراز میں رکھ دو"۔ لڑکی نے بے خیالی سے کہا اور بال بنانے میں جٹی رہی۔

ناشتہ کے بعد سامان باندھتے ہوئے اسے وہ دراز کھولنا یاد نہ رہی اور جاتے وقت خالی کمرے پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر وہ تیز تیز چلتی کار میں بیٹھ گئی۔ نوجوان نے کار اسٹارٹ کر دی پھاٹک سے باہر نکلی۔ فوٹوگرافر نے پلیا پر سے اٹھ کر ٹوپی اتاری۔ مسافروں نے مسکرا کر ہاتھ ہلائے۔ کار ڈھلوان سے نیچے روانہ ہو گئی۔

وہ والرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹوگرافر اب بہت بوڑھا ہو چکا ہے اور اسی طرح اس گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک پر ٹین کی کرسی بچھائے بیٹھا ہے۔ اور سیاحوں کی تصویریں اتارتا رہتا ہے۔ جو اب نئی فضائی سروس شروع ہونے کی وجہ سے بڑی تعداد میں اس طرف آنے لگے ہیں۔

لیکن اس وقت ایئرپورٹ سے جو ٹورسٹ کوچ آکر پھاٹک میں داخل ہوئی ان میں سے صرف ایک خاتون اپنا اٹیچی کیس اٹھائے برآمد ہوئیں اور ٹھٹک کر انھوں نے فوٹوگرافر کو دیکھا، جو کوچ کو دیکھتے ہی فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر کسی جوان اور حسین لڑکی کے بجائے ایک ادھیڑ عمر کی بی بی کو دیکھ کر مایوسی سے دوبارہ جا کر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

خاتون نے دفتر میں جا کر رجسٹر میں اپنا نام درج کیا اور اوپر چلی گئیں گیسٹ ہاؤس سنسان پڑا تھا۔ سیاحوں کی ایک ٹولی ابھی ابھی آگے روانہ ہوئی تھی اور بیرے کمرے کی جھاڑ پونچھ کر چکے تھے۔ تانبے کے گلدان تازہ پھولوں کے انتظار میں ہال کے فرش پر رکھے جھل جھل کر رہے تھے۔ اور ڈائننگ ہال میں دریچے کے نیچے سفید براق میز پر چھری کانٹے جگمگا رہے تھے نووارد خاتون درمیانی بیڈروم میں سے گذر کر پچھلے کمرے میں چلی گئیں۔ اور اپنا سامان رکھنے کے بعد پھر باہر آکر جھیل کو دیکھنے لگیں۔ چائے کے بعد وہ خالی سٹنگ روم میں جا بیٹھیں اور رات ہوئی تو جا کر اپنے کمرے میں سوگئیں گلیارے میں ــــ سے کچھ پرچھائیوں نے اندر جھانکا تو وہ اٹھ کر دریچے میں گئیں جہاں مزدور دن بھر کام کرنے کے بعد سیڑھی دیوار سے لگی چھوڑ گئے تھے۔ گلیارہ بھی سنسان پڑا تھا۔ وہ پھر پلنگ پر آکر لیٹیں تو چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ انھوں نے دروازہ کھولا باہر کوئی نہ تھا سٹنگ روم بھائیں بھائیں کر رہا تھا، وہ پھر آکر لیٹ رہیں، کمرہ بہت سرد تھا۔

صبح کو اٹھ کر انھوں نے اپنا سامان باندھتے ہوئے سنگھار میز کی دراز کھولی تو اس

کے اندر بچھے پہلے کاغذ کے نیچے سے ایک لفافے کا کونا نظر آیا جس پر اس کا نام لکھا تھا۔ خاتون نے ذرا تعجب سے لفافہ باہر نکالا۔ ایک کاکروچ کاغذ کی تہہ میں سے نکل کر خاتون کی انگلی پر آگیا انھوں نے دہل کر انگلی جھٹکی اور لفافے میں سے ایک تصویر سرک کر نیچے گر گئی۔ جس میں ایک نوجوان اور ایک لڑکی امر سندری پاروتی کے مجسمے کے قریب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ تصویر کا کاغذ پیلا پڑ چکا تھا۔ خاتون چند لمحوں تک گم سم اس تصویر کو دیکھتی رہیں پھر اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

بیرے نے باہر سے آواز دی کہ ایئر پورٹ جانے والی کوچ تیار ہے خاتون نیچے گئیں۔ فوٹو گرافر نئے مسافروں کی تاک میں باغ کی سڑک پر ٹہل رہا تھا اس کے قریب جا کر خاتون نے بے تکلفی سے کہا۔

"کمال ہے پندرہ برس میں کتنی بار سنگھار میز کی صفائی کی گئی ہوگی مگر یہ تصویر کاغذ کے نیچے اسی طرح پڑی رہی۔" پھر ان کی آواز میں جھلاہٹ آگئی۔ ـــــ "اور یہاں کا انتظام کتنا خراب ہو گیا ہے۔ کمرے میں کاکروچ ہی کاکروچ۔"

فوٹو گرافر نے چونک کر ان کو دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی پھر خاتون کے جھریوں والے چہرے پر نظر ڈال کر الم سے دوسری طرف دیکھنے لگا، خاتون کہتی رہیں ـــــ ان کی آواز بھی بدل چکی تھی چہرے پر درشتی اور سختی تھی اور انداز میں چڑچڑاپن اور بے زاری اور وہ سپاٹ آواز میں کہے جا رہی تھیں۔

"میں اسٹیج سے ریٹائر ہو چکی ہوں اب میری تصویریں کون کھینچے گا بھلا، میں اپنے وطن واپس جاتے ہوئے رات کی رات یہاں ٹھہر گئی تھی۔ نئی ہوائی سروس شروع ہو گئی ہے۔ یہ جگہ راستے میں پڑتی ہے۔"

"اور ۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔ آپ کے ساتھی؟" فوٹو گرافر نے آہستہ سے پوچھا۔

کوچ نے ہارن بجایا۔

"آپ نے کہا تھا ناکہ کارزارِ حیات' میں گھمسان کا رن پڑا ہے اسی گھمسان میں وہ کہیں کھو گئے"۔

کوچ نے دوبارہ ہارن بجایا۔

"اور ان کو کھوئے ہوئے بھی مدت گزر گئی ——— اچھا خدا حافظ"۔ خاتون نے بات ختم کی اور تیز تیز قدم رکھتی کوچ کی طرف چلی گئیں۔

والرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹو گرافر پھاٹک کے نزدیک جا کر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

زندگی انسانوں کو کھا گئی۔ صرف کاکروچ باقی رہیں گے۔

حسب نسب

لمبے چوڑے سیلے ہوئے غسل خانے میں دن کو بھی اندھیرا رہتا تھا۔ پیتل کے جھال پال تیسترے، اونچا حمام، مٹکے، چوکی، رنگ برنگی صابن دانیاں، بیسن، ابٹن، جھانوے، لوٹے، آفتابے، مگے، کھونٹیوں پر غراروں اور میلے دوپٹوں کا انبار، آنولوں ریٹھوں سے بھری طشتریاں، اندھیرا خنداں ہوا علی بابا چالیس چور کا غار لیکن یہی غسل خانہ چھمی بیگم کی دکھی زندگی میں وقت بے وقت جائے پناہ کا کام دیتا تھا۔ اسی کی ہرے شیشوں والی بند کھڑکی کا رخ چنبیلی والے مکان کی طرف تھا۔ اس کے ایک شیشے کا رنگ ناخن سے ذرا سا کھرچ کر چھمی بیگم نے باہر جھانکنے کا انتظام بھی کر رکھا تھا کہ چھمی بیگم کے لاڈلے ابن عم اچو بھائی چنبیلی والے مکان میں رہتے تھے۔ پہروں وہ اس شیشے میں سے سامنے والے گھر کو اس طرح تکتیں جیسے شاہ جہاں اپنے قید خانے میں سے تاج محل کو دیکھا کرتا تھا۔

اوسط درجے کے اس زمیندار خاندان کے آبائی گھر کے دو حصے تھے۔ باہر والا مردانہ حصہ جس کے صحن میں چنبیلی کی گھنی جھاڑیاں تھیں "چنبیلی والا مکان" کہلاتا تھا۔ زنانے حصے کے آنگن میں املی کا سایہ دار درخت کھڑا تھا۔ اس لئے سارے محلے میں اس کا نام "املی والا مکان" پڑ گیا تھا۔ دونوں آنگنوں کی درمیانی دیوار میں آمد و رفت کے لئے ایک کھڑکی تھی۔

چھمی بی کے ابا اور اجو بھائی کے ابا ایک ساتھ رہتے تھے۔ چھمی بی کے پیدا ہوتے ہی اجو بھائی سے منگنی ہو چکی تھی۔ نو دس سال کی عمر میں منگیتر سے کا نا پردہ کرا دیا گیا تھا۔ اجو بھائی بلا کے خوبصورت اور کھلنڈرے تھے۔ اکلوتے لاڈلے بیٹے اور دو بھائیوں کے گھر کا واحد چراغ اس لئے وہ تو جی بھر کے بگڑے۔ پتنگ بازی، کبوتر بازی، یہ بازی وہ بازی لیکن بڑے ابا اور اماں کو اطمینان تھا کہ بیاہ ہوتے ہی سدھر جائیں گے۔ چھمی بیگم تو ہوش سنبھالتے ہی انھیں اپنا مجازی خدا سمجھنے لگی تھیں۔ ماں باپ کی اکلوتی وہ بھی تھیں۔ ان کے ناز بھی کم نہ اٹھائے جاتے۔ ضدی، غصیلی اور طنطنے والی چھمی بیگم سولہ سال کی ہوئیں تو شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ دونوں طرف دھوم دھام سے تیاریاں ہونے لگیں کہ اچانک موت نے اس سکھی اور خوشحال گھرانے کی بساط الٹ دی۔ اس سال شاہجہاں پور میں جو ہیضے کی وبا پھیلی اس میں پندرہ دن کے اندر اندر چھمی بیگم کے اماں اور ابا دونوں چٹ پٹ۔ چھمی بیگم پر قیامت گزر گئی لیکن ابھی تایا تائی کا سایہ سر پر سلامت تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اجو بھائی سے بیاہ ہونے والا تھا۔ چھمی بیگم ماں باپ کا سوگ منانے کے بعد پھر مستقبل کے سہانے خواب دیکھنے میں مصروف ہو گئیں۔

شادی کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دی گئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ بڑے ابا کوئی تاریخ مقرر کریں ان کا بیٹھے بٹھائے ہارٹ فیل ہو گیا۔

بڑے ابا کے مرتے ہی اجو بھائی نے کہا کہ وہ چند مقدموں کے معاملات سنبھالنے لکھنؤ جا رہے ہیں اور مصاحبوں کے ساتھ اڑنچھو ہوئے۔ اب املی والے مکان میں رہ گئیں بڑی اماں جو بالکل باؤلی ہو رہی تھیں اور چھمی بیگم۔ مردانہ سونا ہو گیا۔ ڈیوڑھی پر پرانے ملازم دھمو خاں ڈنڈا سنبھالے بیٹھے رہ گئے۔ اندر سلامت بوا اور ان کی لڑکیاں روتی ناک سنکتی کھانا پکانے میں جٹی رہتیں۔ گھر کی حفاظت کے لئے بڑی اماں نے ایک بوڑھے رشتے دار ملن خاں کو بریلی سے بلوا بھیجا جو چنبیلی والے مکان کے دالان میں کھٹیا ڈال کر پڑ رہے۔

اجو بھائی لکھنؤ گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ ہر خط میں اماں کو لکھ بھیجتے کہ مقدمے کی تاریخ

ڑھ گئی ہے۔ مہینے دو مہینے میں آجاؤں گا۔ پورے چھ مہینے بعد واپس آئے تو بڑی اماں نے شادی کا ذکر چھیڑا۔ بولے جب تک زمینوں کے معاملات نہیں سدھر جاتے۔ میں شادی وادی نہیں کرنے کا۔
جبھی سے چھمی بیگم تاریک غسل خانے کے کونے میں میلے کپڑوں کے ڈھیر پر بیٹھ کر چپکے چپکے رونے لگیں۔

اب چھمی بیگم انیس سال کی ہو چکی تھیں۔ اجو بھائی نے شاید طے کر لیا تھا کہ لکھنؤ ہی میں رہیں گے۔ لوگوں نے آکر بتایا تھا کہ وہاں خوب رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ چھمی بیگم بھی نہ جانے کیسا نصیبہ لے کر آئی تھیں۔ ایک دن بڑی اماں پر دل کا دورہ پڑا اور وہ بھی چل بسیں۔

اب چھمی بیگم تن تنہا حق حیران رہ گئیں۔ آنگن میں الّو بولنے لگا۔ مزید حفاظت کے خیال سے اندھے دھندے ممّن میاں چنبیلی والے مکان سے املی والے مکان میں منتقل ہو گئے۔ ادھر دالان میں پڑے وہ کھانسا کرتے، ڈیوڑھی میں دھمّو خاں کھانستا رہتا۔

اجو بھائی ماں کے مرنے میں آئے تھے۔ تیجا کرتے ہی واپس چلے گئے۔ کس طرح انھوں نے بیچ منجدھار میں چھمی بیگم کا ساتھ چھوڑا۔ اللہ اللہ! جب وہ یہ سب سوچتیں تو کلیجہ پھٹنے لگتا۔ مہینے کے مہینے لکھنؤ سے دو سو روپے کا منی آرڈر آجاتا یا کبھی کبھار ممّن خاں کے نام خیر خبر پوچھنے کا خط۔

ممّن خاں کی بیوی اور بیٹی بھی بریلی سے آگئی تھیں لیکن اپنی تنک مزاجی کی وجہ سے چھمی بیگم کی ان دونوں سے ایک دن نہ بنی۔ دن بھر رشتے داروں سے لڑنے جھگڑنے یا آپ ہی آپ تلملانے اور کلپنے کے بعد چھمی بیگم پھر غسل خانے میں گھس جاتیں اور روتیں یا "شاہجہانی شیشے" میں سے چنبیلی والے مکان کو تکا کرتیں۔ یہ زندگی بھی کیسی زندگی ہے! وہ سوچتیں۔ ابھی سب کچھ ہے ابھی کچھ بھی نہیں۔ کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ اس گھر پر کتنی رونق تھی۔ دالان میں آرام کرسیاں پڑی ہیں۔ صحن میں مونڈھے بچھے ہیں۔ گیس کے ہنڈے سنسنا رہے ہیں۔ ابّا اور بڑے ابّا کے دوستوں کی محفل جمی ہے۔ مشاعرے ہو رہے ہیں۔ قوال گا رہا ہے۔ جب اجو بھائی کے دوست

احباب آتے تو اجو آنگن والی کھڑکی میں آکر کھنکارتے اور ایک مخصوص آواز میں آہستہ سے پکارتے۔
"اے بھئی چھمو! ذرا چائے تو بھجوا دو۔"

اس بھرے پرے گھر کو کس کی نظر کھا گئی؟

اپنی اس شدید یاس و ناامیدی کے باوجود چھمی بیگم کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اجو واپس آئیں گے۔ چنبیلی والا مکان پھر آباد ہوگا۔

جمعے کے جمعے وہ مردانے مکان میں جاتیں۔ دھموں خاں اور سلامت بوا کی لڑکیوں کے ساتھ مل کر باغ کے جھاڑ جھنکاڑ کی صفائی کرواتیں۔ دالان کے جالے صاف کئے جاتے۔ اندر کے کمرے مقفل تھے۔ دروازوں کے شیشوں میں سے جھانک کر وہ بڑے ابا، ابا اور اجو کے کمروں پر نظر ڈالتیں اور سر ہلاتی، ٹھنڈی آہیں بھرتی واپس آجاتیں۔

چھمی بیگم تیس سال کی ہوگئیں۔ بال وقت سے پہلے سفید ہو چلے۔ اب انھوں نے چنبیلی کے باغ کی دیکھ بھال بھی چھوڑ دی۔ دل دنیا سے اچاٹ سا ہوگیا لیکن غصے اور طنطنے کا عالم وہی رہا بلکہ اب عمر کی پختگی کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ان کی اس تمکنت اور طنطنے کے لئے وجوہات کچھ کم نہ تھیں۔ ماں باپ خالص اصل نسل روہیلے پٹھان، دادا پر دادا ہفت ہزاری نہ سہی ایک ہزاری، دو ہزاری (یا نگوڑے جو کچھ بھی وہ ہوتے تھے) ضرور ہی رہے ہوں گے۔ سارے کنبے کا سرخ و سپید رنگ اور پٹھانی خودداری اور غصہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت تھا کہ اس خاندان میں کھیل کبھی نہ ہوئی۔ ماضی کے ان جغادری روہیلہ سرداروں کے نام لیوا اس کنبے کے حسب نسب پر کوئی آنچ نہ آنے پائے اس فکر میں وہ بالکل قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہیں۔ محلے کی عورتوں سے ملنا جلنا بھی کم کر دیا۔ بیواؤں کے سے سفید کپڑے پہننے لگیں ان کا زیادہ وقت مصلے پر گزرتا۔ اکثر دوپہر کے سناٹے میں سلامت بوا آنگن کی کھڑکی میں بیٹھ کر زردہ پھانکتے ہوئے بڑی ڈراونی آواز میں آپ سے آپ بڑبڑاتیں ـــــ "باری تالا فرماتا ہے مجھے دو درخت اپنے بندوں پر ہنسی آتی ہے ایک جب جسے میں بنا رہا ہوں اسے کوئی بگاڑنے

کی کوشش کرے اور وہ جب جسے میں بگاڑ رہا ہوں وہ اپنے آپ کو بنانے کی کوشش کرے بس وہ وخت' ـــ" اور چھمی بیگم دہل کر ڈانٹتیں "اے سلامت بوا! نحوست کی باتیں مت کرو"۔ لیکن سلامت بوا اطمینان سے اسی طرح بڑبڑاتی رہتیں۔

○

اس روز نوچندی جمعرات تھی۔ چھمی بیگم غسل خانے میں نہا رہی تھیں۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ حمام کے نیچے سلگتے انگارے کب کے بجھ چکے تھے اور چھمی بیگم کو کپکپی سی چڑھ رہی تھی۔ جلدی سے بال تولیہ میں لپیٹ کر کھڑاویں پہن رہی تھیں جب باہر سے سلامت بوا کی سڑبلی نواسی نے زور سے غسل خانے کے دیمک لگے کواڑ کی کنڈی کھڑکھڑائی "آپا! اے آپا! جلدی نکلو"۔

"ارے کیا ہے باؤلی!" چھمی بیگم نے جھنجھلا کر آواز دی۔

"آپا! چنبیلی والے مکان میں آپ سے کہا ہے کہ چار پانچ جنوں کے لئے چائے بھجوا دو جلدی"

"کیا ـــ کیا؟" چھمی کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ انھوں نے جلدی سے شاہجہانی شیشے سے آنکھ لگا دی۔

صحن کا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ باہر دو تانگے کھڑے تھے۔ دو تین لقندرے سامان اتروا رہے تھے۔ ایک سیاہ فام لیکن تیکھے نقش والی عورت سرخ جارجٹ کی ساڑھی پہنے ہری بنارسی شال میں لپٹی دالان میں مونڈھے پر بیٹھی اطمینان سے گھٹنے ہلا ہلا کر نوکروں کو احکام دے رہی تھی۔ ایک اس کی ہم شکل تیرہ چودہ سالہ ڑی شکل والی اچھال چھکّا سی لڑکی کاسنی شلوار قمیص پہنے فرش پر اکڑوں بیٹھی ایک بکس کھولنے میں مشغول تھی۔ اتنے میں اندر سے اجو بھائی ـــ جی ہاں ہمیشہ کی طرح بانکے چھبیلے اجو بھائی دالان میں آئے۔ جھک کر اس لال چڑیل سے کچھ کہا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسی چھمی بیگم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ نیم تاریک غسل خانہ اب بالکل اندھا کنواں بن گیا۔ انھوں نے جلدی سے ایک کھونٹی پکڑ لی، لڑکھڑاتی ہوئی باہر آئیں اور بے سدھ ہو کر اپنے بستر پر گر گئیں۔

بات یہ تھی کہ اجو بھائی جنھوں نے برسوں سے لکھنؤ والی کلّو کو گھر ڈال رکھا تھا اب باقاعدہ نکاح کرکے اسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ کاسنی شلوار والی لڑکی اشرفی کلّو اپنے ساتھ لائی تھی، اجو بھائی کی نہیں تھی۔

شام کو اجو بھائی پردہ کروائے بغیر درّانہ زنانے میں چلے آئے اور دالان میں پہنچ کر پکارا۔

"ارے بھئی چھمو ــــ آؤ اپنی بھابی سے مل لو۔"

چھمی بیگم کانپ کر رہ گئیں۔ پلنگ سے اٹھ کر پھر غسل خانے میں جا گھسیں اور زور سے چٹخنی چڑھا دی۔ اجو بھائی ذرا چورے بنے دالان کے ایک در میں کھڑے رہے۔ کلّو ان کے پیچھے کھڑی تھی۔ دونوں میاں، بیوی چند منٹ تک اسی طرح چپ چاپ کھڑے رہے اور پھر سر جھکائے چنبیلی والے مکان واپس چلے گئے۔

اس دن کے بعد سے چھمی بیگم کی دنیا بدل گئی۔ اب وہ سارا دن قرآن شریف ہی پڑھا کرتیں۔ اجو نے انھیں اتنے برسوں ہوا میں معلق رکھ کے ان کی زندگی تباہ کرکے کسی اور سے شادی کرلی۔ اس ناقابلِ برداشت صدمے سے زیادہ دہشت انھیں اس بات کی تھی کہ انھوں نے کلّو بائی طوائف سے نکاح کرکے خاندان کا حسب نسب برباد کر دیا۔ چھمی بیگم اس جرم کے لئے انھیں مرتے دم تک معاف نہ کر سکتی تھیں۔ کلّو نے کئی بار ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا۔ اکثر وہ آنگن کی کھڑکی میں آہستہ سے کہتی "بٹیا! کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجئے۔" کبھی کوئی خاص کھانا پکتا تو نوکر کے ہاتھ سینی بھجواتی لیکن چھمی بیگم نے دھمّو خاں کو حکم دے رکھا تھا کہ چنبیلی والے مکان سے کوئی چڑیا کا بچہ بھی اس طرف آئے تو اس کی ٹانگیں توڑ دو۔ گھر واپس آنے کے دوسرے مہینے اجو بھائی نے ملّن خاں کے ہاتھ دو سو روپے بھجوائے جو وہ اب تک لکھنؤ سے بھیجا کرتے تھے۔ لیکن اب صورتِ حال بدل چکی تھی۔

چھمی بیگم کھڑکی میں جا کر للکاریں۔ "جمعہ خاں مرحوم کی بیٹی اور شبّو خاں مرحوم کی بھتیجی چکلے سے آیا ہوا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر حرام سمجھتی ہے! ملّن خاں! غیرت والے پٹھان ہو تو جا کر یہ دو سو روپئے بھیجنے والوں کے منھ پر دے مارو۔" یہ رجز پڑھ کر انھوں نے کھڑکی کا دروازہ بند کیا

اور اس میں یہ موٹا قفل ڈال دیا۔

اب چھمی بیگم اپنے زیور بیچ کر گزر بسر کرنے لگیں۔ زیور ختم ہو گئے تو گھر کا قیمتی پرانا سامان کباڑی کے ہاتھ فروخت کر ڈالا لیکن بھوک ایک دائمی مرض ہے جس کا وقتی علاج کافی نہیں اور چھمی بیگم کو دھمّو خاں، مّمن خاں، سلامت بوا اور ان کے چینگڑ پوٹوں کا پیٹ بھرنا تھا۔ انھوں نے گھر میں قرآن شریف اور اردو پڑھانے کے لئے بچیوں کا مکتب کھول لیا۔ محلے والوں کی سلائی کرنے لگیں۔ جب محنت کرتے کرتے بیمار پڑ گئیں اور ہلہلا کر بخار چڑھ آیا تو سلامت بوا ہڑبڑا گئیں اور غصّے سے بولیں: "بی بی! کیا آن پر جان دے دوگی؟ ایسی بھی کیا نگوڑی آن!" لیکن چھمی بیگم پر غنودگی طاری تھی۔ سلامت بھاگی بھاگی چنبیلی والے مکان پہنچیں۔

کلّو فوراً سر پر برقع ڈال گلی کے راستے اندر آئی۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ کلّو ساری رات نند کی پٹی سے لگی بیٹھی رہی۔ اجّو بھائی نے کئی بار آکر دکھیاری چچازاد بہن کی حالت دیکھی لیکن شاید اب بھی اس بے انصافی کا احساس انھیں نہ ہوا جو انھوں نے چھمی بیگم کے ساتھ کی تھی کیوں کہ بقول سلامت بوا اس کالی کلوٹی کلّو نے انھیں الّو کا گوشت کھلا رکھا تھا۔

چھمی بیگم کو جوں ہی ہوش آیا۔ آنکھیں کھولیں اور کلّو کا متفکر چہرہ سامنے دیکھا ان پر غم و غصّے کا بھوت پھر سوار ہو گیا۔ کلّو ان کے پٹھانی جلال سے بے حد خوف زدہ تھی۔ فوراً کان دبا کر اپنے گھر واپس بھاگ گئی۔

بیشتر طوائفوں کی طرح جو شادی کر کے بے حد وفاشعار بیویاں ثابت ہوتی ہیں، کلّو بھی بڑی پتی ورتا عورت تھی۔ اس کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ چھمی بیگم اسے کنبے کی بہو اور اپنی بھاوج سمجھ کر املی والے مکان میں داخل کر لیں۔ اس کی تمنا کبھی نہ پوری ہوئی۔

دس سال نکل گئے۔ اجّو بھائی کو چھمی بیگم کے رشتے کی فکر بھی تھی لیکن چھمی بیگم ادھیڑ ہو چکی تھیں۔ اب ان سے شادی کون کرے گا۔

چھمی بیگم ان سے اور کلّو سے اسی طرح شدید پردہ کرتی تھیں۔ اسی طرح مدرسہ چلاکر گزر کر رہی تھیں کہ ملک تقسیم ہوگیا۔ آدھا شاہجہاں پور مجھو خالی ہوگیا۔ ان کے مکتب کی ساری لڑکیاں اپنے اپنے ماں باپ کے ساتھ پاکستان چلی گئیں۔ چھمی بیگم کے ہاں روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ اسی زمانے میں شامت اعمال کہ کسی کام سے اجو بھائی دلّی گئے اور فسادوں میں وہ بھی اللہ کو پیارے ہوئے جب ان کی سناؤنی آئی ہے کلّو پچھاڑیں کھانے لگی۔ چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ آنگن کی کھڑکی پر مکّے مار مار کر ہاتھ لہولہان کرلئے۔ "بٹیا! — بٹیا! دروازہ کھولئے — ہائے بٹیا — بٹیا — ارے میں کہیں کی نہ رہی!"

چھمی بیگم دالان کے تخت پر بے خبر سو رہی تھیں۔ بین سن کر جاگ اٹھیں۔ دیوار کی کیل سے ٹنگی کنجی اتاری۔ تالا کھولا۔ کلّو بال بکھرائے بھتنی کی طرح کھڑی چیخ رہی تھی "ارے لوگو! میرا سہاگ لٹ گیا — ہائے بٹیا میری مانگ اجڑ گئی!!" اس نے آگے بڑھ کر چھمی سے لپٹنا چاہا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ نیند سے بوجھل آنکھیں ملیں اور اچانک ان کی سمجھ میں بات آگئی۔ تب وہ بھی کھڑکی میں بیٹھ گئیں۔ سفید دوپٹہ منہ پر رکھ لیا۔ سسک سسک کر رونے لگیں۔ اور روتے روتے بولیں "اری مردار تو تو آج بیوہ ہوئی ہے۔ میں بدبخت تو سدا کی بیوہ ہوں۔"

اجو بھائی کے چالیسویں کے بعد ہی کلّو نہ جانے کہاں غائب ہوگئی۔ اس کی لڑکی اشرفی جس کا چند سال پہلے اجو بھائی مرحوم نے اپنے کسی مصاحب سے نکاح کروادیا تھا، لکھنؤ سے آئی اور چنبیلی والے مکان کے ساز و سامان پر قبضہ کیا اور سب چیزیں چھکڑوں پر لدواکر چلتی بنی۔ چھمی بیگم غسل خانے کے شیشے میں سے بے نیازی کے ساتھ فانی دنیا کے یہ سارے تماشے دیکھتی رہیں۔

چنبیلی والے مکان پر کسٹوڈین کا تالا پڑ گیا کیوں کہ چھمی بیگم عدالت میں یہ کسی طرح ثابت نہ کرپائیں کہ اجو بھائی پاکستان نہیں گئے بلوے میں مارے گئے ہیں۔ خود کسی پرانے آسیب کی طرح وہ املی والے مکان میں موجود رہیں۔ للّن خاں اور دھمّو خاں دونوں بڑھاپے اور فاقہ کشی

کی وجہ سے مر گئے ۔ سلامت بوا پر فالج گر گیا ۔ ان کی لڑکیاں اور داماد پاکستان چلے گئے ۔ چھمی بیگم سلائی کرکے پیٹ پالتی رہیں ۔ تن تنہا مکان میں رہتے اب انھیں ڈر نہیں لگتا تھا کیوں کہ سر سفید ہو چکا تھا بہت جلد محلے کی بڑی بوڑھی کہلائیں گی ۔ کچھ عرصے بعد چنبیلی والے مکان میں ایک سکھ شرنارتھی ڈاکٹر آن بسے ۔ کبھی کبھی سردارنیاں آنگن کی کھڑکی میں آن بیٹھتیں اور وہ اور چھمی بیگم اپنے اپنے دکھ سکھ کی باتیں کرتیں ۔ ڈاکٹر صاحب کی لڑکی چرن جیت کی شادی نئی دہلی میں کسی سرکاری افسر سے ہوئی تھی ۔

اب کی بار وہ میکے آئی تو اس نے اپنی ماں سے کہا کہ اس کے شوہر کے مسلمان افسر اعلیٰ کی بیگم کو استانی کی ضرورت ہے جو گھر پر رہ کر ان کے بچوں کو اردو اور قرآن پڑھائے ۔" میں تو چھمی ماسی سے کہتے ڈرتی ہوں ۔ انھیں جلال آجائے گا ، آپ کہہ کر دیکھئے ۔"

بڑی سردارنی نے چھمی بیگم سے اس ملازمت کا ذکر کیا ۔ سمجھایا بجھایا ۔ بہن جی اس تنگ دستی اور تنہائی میں کب تک بسر کرو گی ۔ دلّی چلی جاؤ ۔ صبیح الدین صاحب کے ہاں عزت و آرام سے بڑھاپا کٹ جائے گا ۔

چھمی بیگم کا غصہ کب کا دھیما پڑ چکا تھا ۔ جوش و خروش ، طنطنے اور جلال میں کمی آ گئی تھی ۔ ان کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی کہ اگر کل کلاں کو مر گئیں تو آخر وقت میں لیسین شریف پڑھنے والا تو کوئی ہونا چاہیے ۔

قصہ مختصر یہ کہ چھمی بیگم برقعہ اوڑھ صرف ایک بکس اور بستر اور لوٹا ساتھ لے کر گھر سے نکلیں جو اب تک بالکل کھنڈر ہو چکا تھا اور جس کے کھنڈر ہونے کا اب انھیں قطعی غم نہ تھا کیوں کہ وہ تیاگ اور سنیاس کی اسٹیج پر پہنچ چکی تھیں ۔ وہ ریل میں بیٹھ کر دلّی پہنچیں جہاں ریلوے اسٹیشن پر بے چاری بیگم صبیح الدین چرن جیت سنگھ کا خط ملنے پر کار لے کر خود انھیں گھر لے جانے کے لئے آ گئی تھیں ۔

اس روز سے چھمی بیگم بنت جمعہ خاں زمیندار شاہجہاں پور مغلانی جی بن گئیں ۔

چھمی بیگم نے پورے بارہ سال سفید براق دوپٹہ ماتھے سے لپیٹے صبیح الدین صاحب کے گھر میں گزار دیئے ۔ بچے جنھیں وہ اردو اور قرآن شریف پڑھانے آئی تھیں بڑے ہوگئے ۔ بڑا لڑکا بی ۔ اے ۔ کے بعد اپنے چچا کے پاس پاکستان بھیج دیا گیا منجھلی لڑکی بھی کراچی چلی گئی ۔ چھوٹی لڑکی کالج میں پہنچ گئی ۔ اب بیگم صبیح الدین کو چھمی بیگم کی ضرورت نہیں تھی ۔ صبیح الدین صاحب ریٹائر ہوکر اپنے وطن مرزاپور جانے والے تھے ۔ دہلی سے روانہ ہونے سے پہلے بیگم صبیح الدین نے چھمی بیگم کو اپنی دوست بیگم راشد علی کے ہاں رکھوا دیا ۔ راشد علی صاحب بھی حکومت ہند کے ایک اعلیٰ افسر تھے ۔

چھمی بیگم صبیح الدین صاحب کے ہاں بہت سکھ چین سے رہی تھیں ۔ ان سے گھر کے بزرگوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا ۔ انھیں تینوں بچوں سے بے حد محبت ہوگئی تھی ۔ غصہ بھی بہت کم آتا تھا ۔ اگر آتا بھی تو اپنی مجبوریوں کا خیال کرکے پی جاتیں تھیں ۔ اب وہ نخرا دکھاتیں بھی کس پر ۔ ناز اٹھانے ، خفگی برداشت کرنے والے سب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے ۔ کبھی کبھی انھیں کلو کا خیال بھی آجاتا اور سوچتیں نہ جانے کمبخت اب کہاں اور کس حال میں ہوگی یا شاید وہ بھی مرکھپ گئی ہو ۔ آج کل زندگیوں کا کیا بھروسہ ہے ۔

بیگم راشد علی بیگم صبیح الدین کی طرح دردمند اور دیندار خاتون تو نہ تھیں ۔ آج کل کی ماڈرن لڑکی تھیں لیکن عزت انھوں نے بھی چھمی بیگم کی بہت کی ۔ یہاں بھی وہ گھر کے فرد کی حیثیت سے رہتیں ۔ راشد علی ان کا بہت خیال رکھتے ۔ ان کے بارعب ، پروقار شکل وصورت اور اعلیٰ نسبی سے سب ہی متاثر تھے ۔ بیگم راشد اکثر سہیلیوں سے کہتیں "کبھی واقعی زندگیوں میں کیسے کیسے انقلاب آتے ہیں ۔ پل کی پل میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے ۔ ہماری مغلانی بی کا قصہ سنا ہے آپ نے ؟ شاہجہاں پور کے فلاں خاندان ۔۔" اور سننے والی خواتین سر ہلاکر ٹھنڈی سانسیں بھرتیں اور دوسرے اسی طرح کے عبرت انگیز ، نصیحت آموز واقعات سناتیں ۔

بیگم راشد علی کے بچے بہت خورد سال تھے ۔ ان پر حیدر آبادی "آیاماں" مامور تھیں ۔ چھمی بیگم ہاؤس کیپر بن گئیں ۔ گھر سنبھالنے کے لئے بیگم راشد کو چھمی بیگم کی بے حد ضرورت تھی کیوں کہ ان کا اپنا وقت زیادہ تر کلبوں، پارٹیوں اور سرکاری تقریبات میں گزرتا تھا۔

پانچ برس چھمی بیگم نے راشد علی صاحب کے گھر میں کاٹ دیئے ۔ جب راشد صاحب کا تبادلہ ہندوستانی سفارت خانے واشنگٹن ہونے لگا، ان کی بیگم کو فکر ہوئی کہ چھمی بیگم کا کہیں اور ٹھکانہ بنائیں ۔ ایک دن وہ اپنے ایک الوداعی لنچ کے لئے روشن آرا کلب گئی ہوئی تھیں اور چھمی بیگم سے کہتی گئی تھیں کہ فلاں وقت کار لے کر منّی کو میرے پاس لے آیئے گا۔

جب چھمی بیگم روشن آرا کلب پہنچیں لنچ ابھی ختم نہ ہوا تھا ۔ چھمی بیگم بچی کی انگلی پکڑے سبزے پر ٹہلتی رہیں ۔ چھمی بیگم اب پردہ نہیں کرتی تھیں اور ساڑھی پہنتی تھیں ۔ اس نگوڑی دلی میں انھیں پہچاننے والا اب کون رکھا تھا ۔ سامنے برآمدے میں ایک طرف رمی کی محفل جمی ہوئی تھی اور ایک بے حد فیشن ایبل چالیس پینتالیس سالہ حقّاقہ دقّاقہ خاتون پانچ چھ مردوں کے ساتھ قہقہے لگا لگا کر تاش کھیلنے میں مصروف تھیں ۔

سترہ برس نئی دلی میں رہ کر چھمی بیگم اس نئی "اعلیٰ سوسائٹی" اور جدید ہندوستانی خواتین کی الٹرا ماڈرن طرز زندگی کی بھی عادی ہو چکی تھیں اس لئے چھمی بیگم اطمینان سے گھاس پر ٹہلا کیں ۔ چند منٹ بعد اس خاتون نے سر اٹھا کر چھمی بیگم کو ذرا غور سے دیکھا ۔ کچھ دیر بعد پھر نظر ڈالی اور اپنے ایک ساتھی سے کچھ کہا تب چھمی بیگم نے دیکھا ایک مردُوا تاش کی میز سے اٹھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کی طرف آ رہا ہے ۔

قریب آ کر اس نے کہا "بڑی بی ! ذرا ادھر آیئے"۔

چھمی بیگم متانت سے برآمدے میں پہنچیں ۔ اجنبی خاتون نے پوچھا یہ بچی کس کی ہے اور وہ کس کی ملازمہ ہیں ؟ چھمی بیگم نے بتایا ۔ خاتون نے کہا کہ وہ بمبئی میں رہتی ہیں اور آج کل انھیں بھی ایک قابلِ اعتبار بڑی بی کی تلاش ہے ۔ اگر وہ اپنی جیسی کسی بڑی بی کو جانتی ہوں تو بتائیں ۔

چھمی بیگم فوراً دل میں اس ربِ کریم کا لاکھ لاکھ شکر بجا لائیں جو رزق کا ایک دروازہ بند کرتا ہے تو دوسرا کھول بھی دیتا ہے۔ پھر انھوں نے اسی وقار سے جواب دیا کہ وہ خود بہت جلد اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے والی ہیں۔ "میری بیگم ابھی باہر آتی ہوں گی۔ ان سے بات کر لیجیے"۔ اتنا کہہ کر وہ بیگم راشد کے انتظار میں وہیں برآمدے کے ایک در میں ٹک گئیں۔ جب بیگم راشد لنچ روم سے نکلیں تو میز سے اٹھ کر اجنبی خاتون نے فوراً اپنا تعارف کرایا۔ اپنا نام مسز رضیہ بانو بتایا اور چھمی بیگم کے متعلق ان سے بات کی۔ بیگم راشد بھی بہت خوش ہوئیں اور وعدہ کیا کہ واشنگٹن روانہ ہونے سے پہلے وہ چھمی بیگم کو خود بمبئی کی ریل میں بٹھا دیں گی۔ رضیہ بانو نے بتایا تھا کہ وہ آج شام ہی بمبئی واپس جا رہی ہیں۔ اپنے گھر کا پتہ لکھ کر انھوں نے چھمی بیگم کو دے دیا لیکن بیگم راشد نے ذرا متفکر ہو کر پوچھا "خالہ تم اکیلی اتنی دور کا سفر کر لو گی؟" چھمی بیگم نے فوراً اقرار میں سر ہلا دیا۔ چھمی بیگم کو اب زندگی میں کسی بات کے لئے "نہیں" کہنے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ انھوں نے رضیہ بانو سے تنخواہ کا فیصلہ بھی نہ کیا۔ کیوں کہ انھوں نے ہمیشہ کے لئے ایک تنخواہ مقرر کر لی تھی۔ چالیس روپے ماہوار اور کھانا۔ یہ چالیس روپے ان کی ذاتی ضروریات کے لئے ضرورت سے زیادہ تھے۔ کپڑے ہمیشہ انھیں اپنی بیگموں سے مل جاتے تھے۔ عرصہ ہوا انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ کپڑے لتے، گہنے پاتے، جائداد املاک، رشتے ناطے، دوستی محبت، سب بے معنی اور فانی چیزیں ہیں۔

بیگم راشد علی اور چھمی بیگم برآمدے سے اترنے لگیں تو رضیہ بانو نے بیگ کھول کر فوراً ڈیڑھ سو روپے کے نوٹ نکال کر چھمی بیگم کے حوالے کر دیئے "سفر خرچ اور دوسرے اخراجات" انھوں نے ذرا بے پروائی سے کہا۔ بیگم راشد کو ان کی اس دریا دلی پر حیرت ہوئی لیکن انھیں خود معلوم تھا کہ بمبئی میں ایک سے ایک بڑی سیٹھانی بستی ہے۔ چھمی بیگم نے خاموشی سے نوٹ صدری کی جیب میں اڑس لئے۔ انھوں نے اب زندگی کے انوکھے واقعات پر متعجب ہونا بھی چھوڑ دیا تھا۔

مسٹر و مسز راشد علی کے امریکہ روانہ ہونے سے دو دن پہلے چھمی بیگم نے بھی ٹرین میں سوار ہو کر بمبئی کا رخ کیا۔

بمبئی سنٹرل پہنچ کر وہ پہلی بار ذرا گھبرائیں کیوں کہ نئی دلی کی پرسکون کوٹھیوں میں انھوں نے اب تک بہت محفوظ اور مامون زندگی گزاری تھی۔ اللہ کا نام لے کر پلیٹ فارم سے باہر نکلیں۔ قلی کے سر سے اپنا ٹین کا بکس اور دری میں لپٹا بستر اتروایا۔ اپنا لوٹا، دستی پنکھا اور پندنیا ہاتھوں میں سنبھال کر ٹیکسی کی۔ سردار جی کو پتہ بتایا "گلزار" جاڈن روڈ"۔

چند منٹ میں ٹیکسی ایک بلند و بالائی عمارت کی برساتی میں جا رکی۔ چھمی بیگم نے بوڑھے سردار جی کو کرایہ دیا جو راستے میں ان سے دنیا کے حالات پر تبادلہ خیالات کرتے آئے تھے۔ اسی وقت دو بے حد اسمارٹ لڑکیاں لفٹ سے نکل کر سردار جی کی ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔ سردار جی نے خاموشی سے فلیگ گرایا اور پھاٹک سے باہر نکل گئے۔ کس قدر غیر شخصی منظم اور مکینکل زندگی اس شہر کی تھی۔

چھمی بیگم نے صدری کی جیب سے میلا کاغذ کا ٹکڑا نکال کر پھر آنکھیں چندھیائیں اور پتہ پڑھا گیارہویں منزل فلیٹ نمبر ۳۔ اسٹول پر بیٹھے چوکیدار نے اکتائے ہوئے انداز میں خاموشی سے اٹھ کر ان کا سامان لفٹ میں رکھ دیا۔ لفٹ آٹومیٹک تھا۔ چھمی بیگم بہت گھبرائیں چوکیدار جلدی سے اندر آیا اور انھیں گیارہویں فلور تک پہنچا کر واپس نیچے چلا گیا۔ اب چھمی بیگم اپنے سامان سمیت طویل گیلری میں اکیلی کھڑی تھیں۔ پھر ان کی نظر ایک نزدیکی دروازے پر پڑی جس کے اوپر نمبر ۳ لکھا تھا۔ دروازے پر ایک اور آہنی جالی دار دروازہ چڑھا تھا جو اندر سے مقفل تھا جیسے بنکوں کے دروازے ہوتے ہیں۔ چھمی بیگم نے آگے بڑھ کر گھنٹی بجائی۔ چند لمحوں بعد ایک بھوری آنکھ نے اندرونی کواڑ کے جالی دار سوراخ کا پٹ ہٹا کر جھانکا۔ چھمی بیگم کو دفعتاً برسوں بعد اپنے غسل خانے کی کھڑکی کا کھرچا ہوا شیشہ یاد آگیا جس میں سے انھوں نے پہلی بار اس منحوس لال چڑیل کو دیکھا تھا۔ مزید توقف کے بعد دونوں دروازے کھلے اور ایک غصیلا سا گورکھا باہر نکلا۔ اس نے مشکوک اور بے رحم نظروں سے چھمی بیگم کو دیکھا۔ چھمی بیگم ڈر گئیں لیکن پھر یاد آیا وہ بھی پٹھان ہیں۔ سر اٹھا کر وقار سے کہا "بیگم صاحب

سے کہو چھمی بیگم دلّی سے آگئی ہیں۔"

"مالوم ہے۔ تم دلّی سے آیا ہے اندر آجاؤ۔" گورکھے نے خشکی سے جواب دیا اور باہر نکل کر ان کا بکس بستر اٹھالیا۔ اس کے پیچھے پیچھے چھمی بیگم اندر آگئیں تو اس نے کھٹلے سے دونوں دروازے مقفل کر دیئے۔

اب چھمی بیگم ایک نیم تاریک، ایرکنڈیشنڈ عالی شان ڈرائنگ روم میں کھڑی تھیں۔ ایسا شاندار ڈرائنگ روم تو نہ بیچارے صبیح الدین صاحب کا تھا اور نہ راشد علی صاحب کا۔ ایک طرف کی دیوار پر سیاہ پردہ پڑا تھا جو ذرا سا سرکا ہوا تھا اور اس کے پیچھے دیوار میں نصب سینما کی چھوٹی سی اسکرین نظر آرہی تھی۔ کمرے کے دوسرے حصے میں بار تھی۔

"بیگم صاحبہ ہیں؟" چھمی بیگم نے دونوں ہاتھوں میں لوٹا، پندنیا اور پنکھا اٹھائے اٹھائے دریافت کیا۔

"میم صاحب سو رہا ہے۔"

"اور صاحب؟" ملازمت شروع ہونے سے پہلے گھر کے صاحب کے انٹرویو سے وہ ہمیشہ جھجکتی تھیں۔

گورکھے نے کوئی جواب نہ دیا اور ڈرائنگ روم سے نکل کر ایک گیلری کی طرف چلا۔ چھمی بیگم اس کے پیچھے پیچھے دونوں طرف دیکھتی ہوئی۔ گیلری میں دورویہ چار دروازے تھے جو سب اندر سے بند تھے۔ یہ بہت بڑا اور پرشکوہ فلیٹ تھا۔

آگے جاکر گیلری بائیں طرف کو مڑ گئی تھی۔ یہاں باورچی خانہ اور نوکروں کے دو مختصر سے کمرے تھے جن کے باہر بالکنی تھی۔ نوکروں کے استعمال والے زینے میں بھی اندر سے تالا پڑا تھا۔ ایک صاف ستھری اور روشن خالی کوٹھری میں جاکر گورکھے نے بکس بستر ا دھم سے زمین پر رکھ دیا اور اسی طرح چپ چاپ باہر چلا گیا۔

چھمی بیگم نے پندنیا بڑے طاق کے تختے پر رکھ کر اپنی نئی جائے پناہ، نئے ٹھکانے پر

نظر ڈالی ۔ کونے میں لوہے کا ایک پلنگ پڑا تھا۔ انھوں نے دل میں سوچا یہ بہت چبھے گا۔ دیواروں پر پچھلے شوقین مزاج ملازم کی چپکائی ہوئی فلم ایکٹرسوں کی تصویر مسکرا رہی تھیں۔ کوٹھری میں حبس طاری تھا۔ چھمی بیگم نے کھڑکی کھولی تو اچانک سمندر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ نیلا، وسیع، بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مارتا، غیر متوقع، زندگی کے واقعات کی مانند اچانک۔ انھوں نے سمندر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ دفعتاً خیال آیا اس کارساز کے قربان جاؤں۔ سمندر تک پہنچ گئی۔ اب انشاء اللہ حج بھی کر آؤں گی۔ اسی سمندر کے اس پار مکہ مدینہ ہے۔ یہ سوچ کر ان کا جی بھر آیا۔

کوٹھری سے ملحق نوکروں کا غسل خانہ تھا۔ چھمی بیگم نے بکسا کھولا، کپڑے نکالے غسل خانے میں گئیں۔ اپنے آبائی مکان کا وہ طویل وعریض نیم تاریک غسل خانہ، مامائیں، اصیلیں وہ برسوں کی کوشش کے بعد بھلا چکی تھیں کہ انسان زندگی کی پیہم تبدیلیوں کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے ورنہ مر جائے۔

نہا دھو، کپڑے بدل وہ پھر اپنی کوٹھری میں آئیں۔ سارا گھر سنسان پڑا تھا۔ نوکر نہ چاکر۔ صاحب دفتر گئے ہوں گے۔ بچے اسکول۔ میم صاحب سو رہی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اب انھیں چائے کی طلب ستانے لگی۔ ساری عمر شدید ذہنی اور جذباتی صدمے سہتے رہنے سے چھمی بیگم کی تیزی طراری کب کی ہوا ہو چکی تھی اور — وہ بڑھاپے کی وجہ سے ستری بہتری بھولی بھٹکی ہو کر بھی رہ گئی تھیں۔ سادگی سے سوچا اب کچن میں جا کر چائے بناؤں۔

سنسان باورچی خانے میں پہنچیں تو وہاں گیس کے چولھے نظر آئے جو استعمال کرنا نہ جانتی تھیں۔ ذرا جھنجھلا کر گیلری میں آئیں جس کے چار دروازوں میں سے ایک کھل چکا تھا اور اس پر پڑا بیش قیمت پردہ دکھائی دے رہا تھا۔

ان کے قدموں کی چاپ سن کر پردے کے پیچھے سے کسی نے آواز دی — "کون ہے ؟"

"چھمی بیگم — دلی سے آئی ہوں" انھوں نے اسی سادگی سے جواب دیا۔

"اوہو — آگئیں، آؤ آجاؤ"

پردہ سرکا کر اندر گئیں۔ ایک بالکل شاہانہ خواب گاہ میں وسیع وعریض امریکن

چھپر کھٹ پر رضیہ بانو گلابی نائیلون کا نائٹ گون پہنے نیم دراز تھیں۔ انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ چھمی بیگم کو ان کا یہ ننگا پہناوا ذرا بھی پسند نہ آیا۔ لیکن سوچا کبھی اپنا اپنا دستور ہے اس شہر کے یہی رنگ ڈھنگ ہیں۔ رضیہ بانو کا سگریٹ بھی انھیں اچھا نہ لگا۔ بیگم صبیح الدین اور بیگم راشد دونوں سگریٹ نہیں پیتی تھیں۔ بہرحال انھوں نے بردباری سے کہا "السلام علیکم"۔

"آجاؤ — بُوا۔ بیٹھو" رضیہ بانو نے فرش کی طرف اشارہ کیا۔

جب سے چھمی بیگم برقع سر پر ڈال کر حق حلال کی روزی کمانے باپ دادا کی دہلیز سے باہر نکلی تھیں آج تک انھیں کسی نے بُوا نہیں کہا تھا۔ صبیح الدین صاحب اور راشد صاحب دونوں کے ہاں انھیں چھمی خالہ یا صرف خالہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ وہ تمکنت سے دیوان کے کنارے پر ٹک گئیں۔

رضیہ بانو کے سرہانے دو ٹیلی فون رکھے تھے۔ ایک سفید ایک سرخ۔ سفید والے کی گھنٹی بجی۔ رضیہ بانو نے ریسیور اٹھا کر انگریزی میں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کیں۔ ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل سے ایک بڑی سی مجلّد نوٹ بک اٹھائی، اس میں کچھ لکھا پھر ریسیور رکھ کر سرخ رنگ کے ٹیلی فون کا ایک نمبر ملایا اور آہستے سے کہا "مادھو — چار نمبر — نائن تھرٹی"۔ اور فون بند کر دیا۔ چھمی بیگم خاموش بیٹھی کمرے کی آرائش دیکھتی رہیں۔ مرمریں مجسمے، بڑی بڑی تصویریں، ریڈیوگرام طول طویل سفید رنگ کا وارڈروب۔ اتنے میں پردہ سرکا کر ایک طرحدار لڑکی ہاؤس کوٹ پہنے اندر آئی۔ گیلری کے بند دروازوں میں سے ایک کھلا۔ کمرے میں سے زور سے "ہائی فائی" کی آواز سنائی دی۔ لڑکی نے رضیہ بانو سے کچھ گٹ پٹ کی الٹے پاؤں واپس گئی اور گیلری والا دروازہ پھر بند ہو گیا۔

"اللہ رکھے کتنے بچے ہیں؟" چھمی بیگم نے دریافت کیا۔

"میرے ہاں کوئی اولاد نہیں۔ یہ میری بھانجیاں ہیں میرے ساتھ رہتی ہیں"۔ رضیہ بانو نے مختصراً جواب دے کر پھر مجلد نوٹ بک کھول لی۔

"کالج میں پڑھتی ہوں گی" چھمی بیگم نے کہا۔

"کون؟" رضیہ بانو نے بے خیالی سے پوچھا۔

"بھانجیاں آپ کی"

"ہوں"

"اللہ رکھے آپ کے میاں بزنس کرتے ہیں؟" چھمی بیگم کو معلوم تھا کہ بمبئی میں سب لوگ بزنس کرتے ہیں۔

"ہیں — کیا —؟" رضیہ بانو نے نوٹ بک سے سر اٹھا کر ذرا ناگواری سے پوچھا — "میاں؟ — میاں مر گئے"

"انا للہ وانا الیہ راجعون" چھمی بیگم کے منہ سے نکلا۔ لحظہ بھر کے لئے اچھو بھائی اللہ بخشے کی موت کا زخم پھر ہرا ہو گیا۔ ہر موت کی خبر پر ہرا ہو جاتا تھا۔ کوئی کیا جان سکتا تھا کہ چھمی بیگم نے اپنی ساری عمر کیسے بے پایاں اندوہ میں مبتلا رہ کر اسے کس طرح ضبط کر کے گزار دی۔ صبر شکر۔ صبر شکر۔

چوڑی دار پاجامہ پہنے ایک اور مجسم قیامت نوجوان لڑکی لہراتی، بل کھاتی کمرے میں آئی۔ رضیہ بانو نے اس سے انگریزی میں کچھ کہا۔ لڑکی اسی طرح لہراتی مسکراتی باہر چلی گئی۔ اب رضیہ بانو چھمی بیگم کی طرف متوجہ ہوئیں جنھیں چائے کی طلب میں جمائیاں آنے لگی تھیں۔ رضیہ بانو نے ایک تکیہ کہنیوں کے نیچے دبا کر کہنا شروع کیا "بوا (چھمی بیگم پھر کلبلائیں) آپ نے بہت اچھا کیا جو میرے ہاں آگئیں۔ میں نے پہلی نظر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ بے سہارا اور دکھی ہیں۔ اب آپ اس گھر کو اپنا گھر سمجھئے۔ میں ہمیشہ یہ چاہتی ہوں کوئی بزرگ بی بی میرے گھر میں نماز قرآن پڑھتی رہا کریں۔ برسوں سے میرے پاس ایک حیدرآبادی بڑی بی تھیں۔ وہ پچھلے سال بے چاری حج کرنے گئیں وہیں انتقال ہو گیا — اچھا" رضیہ بانو نے پہلو بدل کر بات جاری رکھی "میں اب آپ کو بتانا یہ چاہتی ہوں بوا کہ یہ بمبئی شہر میدانِ حشر ہے۔ طرح طرح کی باتیں، طرح طرح کے لوگ۔ آپ کسی بات پر کان نہ دھریئے۔ بس اپنے کام سے کام رکھئے۔ کچن کی نگرانی

کر لیجئے۔ باقی وقت اپنے نماز روزے میں گزاریئے۔ اب آپ کے لئے محنت کا نہیں آرام کا وقت ہے۔ قرآن شریف پڑھئے۔ میرے حق میں دعائے خیر کرتی رہئے۔ باقی یہ کہ لڑکیوں — میری بھانجیوں کے لئے دوسری آیا موجود ہے۔ ابراہیم خانساماں کا نام ہے۔ بشن سنگھ گو رکھا ہے۔ مادھو میرا ڈرائیور ہے — لیکن کسی کے جھگڑوں قصیوں میں نہ پڑیئے۔"

"میں خود —" چھمی بیگم نے کہنا چاہا لیکن رضیہ بانو نے ان کی بات کاٹی۔

"میری اللہ کے فضل سے بہت بڑی بزنس ہے۔" کچھ توقف کے بعد اضافہ کیا "ایکسپورٹ امپورٹ جانتی ہیں، ایکسپورٹ امپورٹ؟"

"جی ہاں" چھمی بیگم نے سر ہلایا۔ صبیح الدین صاحب محکمہ تجارت کے افسر تھے اور اس طرح کے الفاظ چھمی بیگم کے کانوں میں پڑتے رہتے تھے۔ رضیہ بانو چھمی بیگم کو بہت سمجھ دار اور نیک بی بی معلوم ہوئیں اور اس قدر خدا پرست۔ چھمی بیگم نے ان کا باریک نائٹ گاؤن اور سگریٹ نوشی معاف کر دی۔

"میں عورت ذات تن تنہا اتنا بڑا کاروبار چلا رہی ہوں۔ اس کی وجہ سے دس طرح کے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ بھانجیاں بھی آج کل کی لڑکیاں ہیں۔ ان کے دوست احباب بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ پھر میری بزنس کی وجہ سے دو مرتبہ پولیس ریڈ کر چکی ہے۔"

"پولیس؟" چھمی بیگم نے ذرا دہل کر دہرایا۔

رضیہ بانو ہنس پڑیں "ڈریئے نہیں۔ یہاں بڑے بڑے تاجروں کو پولیس اور انکم ٹیکس والے اکثر پریشان کرتے ہیں۔ میں اکیلی عورت، دسیوں دشمن پیدا ہو گئے۔ کسی نے جا کر پولیس والوں سے جڑ دی کہ میں نے انکم ٹیکس نہیں دیا ہے، بس دوڑ آ گئی۔ اسی وجہ سے میں نے باہر لوہے کا دروازہ لگوا لیا ہے تو اب آپ سے کہنا یہ ہے کہ جب باہر کی گھنٹی بجے تو آپ پہلے سوراخ میں سے دیکھ اطمینان کر لیجئے۔ کبھی کبھی یہ پولیس والے سادہ کپڑوں میں بھی آ جاتے ہیں۔"

چھمی بیگم سفر کی تکان اور چائے کی طلب میں نڈھال ہوئی جا رہی تھیں۔ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

اور بولیں "بی بی گیس کا چولھا کیسے جلتا ہے؟"

رضیہ بانو نے سرہانے ایک برقی بٹن دبایا۔ ایک منٹ میں ابراہیم باورچی دروازے میں نمودار ہوگیا۔

"ابراہیم! یہ ہماری نئی بوا ہیں۔ ان کے لئے چائے تو بنا دو جھٹ پٹ!"

چھمی بیگم جلدی سے اٹھ کر ابراہیم کے پیچھے پیچھے کچن کی طرف روانہ ہوگئیں۔

○

ظہر، عصر، مغرب ساری نمازیں پڑھ کر وہ پھر بالکنی میں جا کھڑی ہوئیں۔ گھر میں کرنے کے لئے کچھ کام ہی نہ تھا۔ رضیہ بانو بن سنور کر باہر جا چکی تھیں۔ دو "بھانجیوں" کے کمروں میں روشنی جل رہی تھی۔ تیسری بھانجی غائب تھی۔ تینوں چاروں ملازم بھی فلیٹ میں نہ تھے۔ اس لئے گھنٹی بجی تو بجتی ہی چلی گئی۔ چھمی بیگم نئی دلّی کی عادت کے مطابق فوراً دروازہ کھولنے کے لئے ڈرائنگ روم کی طرف لپکیں اور جلدی سے اندر والا دروازہ کھول دیا۔ باہر کا آہنی دروازہ اس وقت پہلے سے ایک طرف کو سرکا ہوا تھا اور جس طرح صبیح الدین صاحب اور راشد صاحب کی کوٹھیوں میں ڈرائنگ روم کی دہلیز پر آکر وہ مہمانوں سے بہت اخلاق سے کہتی تھیں "تشریف لائیے" اسی عادت کے مطابق انھوں نے اخلاق سے کہا "تشریف لائیے۔"

دو فربہ مارواڑی اور ایک معطر نوجوان امیر زادہ اندر داخل ہوئے۔ امیر زادہ سیدھا بار کی طرف چلا گیا۔ فربہ مارواڑی دھم سے ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ صبیح الدین صاحب کے ہاں بھی اکثر اس وضع قطع کے کاروباری اپنی غرض سے آیا کرتے تھے۔ معطر نوجوان کو دیکھ کر البتہ ذرا تعجب ہوا۔ پھر سوچا اس شہر کا یہی دستور ہوگا۔ ابھی وہ یہی طے کر رہی تھیں کہ معزز مہمانوں سے چائے کے لئے پوچھیں یا کافی کے لئے کہ سونے کے بٹنوں اور ہیرے کی انگوٹھیوں والے فربہ مارواڑی نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"میڈم کدھر ہے؟"

چھمی بیگم بخوبی جانتی تھیں کہ بیگم کو انگریزی میں میڈم کہتے ہیں۔ سلیقے سے جواب دیا۔

"میڈم باہر گئی ہیں۔"

"سالا چھوکری لوگ کدھر گیا؟"

چھمی بیگم کو غصہ آگیا۔ یہ صحیح ہے کہ اہلِ بمبئی تمیز دار اور اہل زبان نہیں لیکن یہ گالی گلوج کیا معنی؟ انھوں نے ہونٹ پچکا کر پوچھا "بیگم صاحب کی بھانجیاں؟" اتنے میں دروازہ کھلا اور رضیہ بانو سُرعت سے خود اندر آگئیں۔ چھمی بیگم نے کہا "بوا تم جاکر اپنی کوٹھری میں بیٹھو، آرام کرو۔"

"جی اچھا" انھوں نے جواب دیا۔ ان کے گیلری میں سے گزر جانے کے بعد ایک بھانجی کے کمرے سے ایک صاحب نکل کر باہر چلے گئے۔

چھمی بیگم نے اپنی کوٹھری میں جاکر ایک بار پھر جا نماز نکالی، وضو کیا، نفلیں پڑھنے لگیں اور اس رب ذوالجلال کا شکریہ ادا کیا جسے اپنے بندوں پر صرف دو وَخت ہنسی آتی ہے اور اسی پاک پروردگار نے ان کے باپ دادا کی لاج، ان کے حَسب نَسب کی عزت رکھ لی اور ایک بار پھر ایک شریف گھرانے کی حق حلال کی کمائی میں ان کا حصّہ بھی لگا دیا۔

سکریٹری

اودھ کے ضلع سیتاپور میں میرے ایک پھوپھا کورٹ آف وارڈز کے منیجر تھے۔ وہاں پھوپھی کے زنانہ ڈرائنگ روم کی ایک دیوار پر سنہرے منقش فریم میں ایک نوعمر رانی صاحبہ کی قدِ آدم رنگین تصویر لگی ہوئی تھی۔ تصویر نے سچ مچ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ تصویر کو اصلی کپڑوں اور زیوروں سے آراستہ کرنا اس زمانے کا شاید ایک خاص فن تھا، کیوں کہ اس طرح کی ایک بنگالی خاتون کی تصویر میں نے کلکتے میں بھی دیکھی تھی۔ بہرحال ——— بھری دوپہر کو یا شام کے وقت اس نیم تاریک کمرے میں جاتے پر اچانک ایسا لگتا تھا جیسے کوئی جیتی جاگتی لڑکی سامنے کھڑی ہے۔ ڈر سا لگتا تھا ——— اندھیرا پڑے جب مٹی کے تیل کے بڑے بڑے لیمپ جلائے جاتے تو ان کی روشنیوں میں جھلملاتی یہ تصویر اور زیادہ عجیب، ڈرامائی اور سہانی سی معلوم ہوتی۔

سیتاپور کی گرمیوں کی شامیں بھی بے حد سہانی ہوتی تھیں۔ وسیع اور پر فضا باغ پر وہ پرفسوں خاموشی طاری ہوتی جو یوپی کے موسم گرما کی خصوصیت ہے، جب پھولوں اور آم کے درختوں کی مہک اور گھاس کی خنکی اور فضا کی حدت سب مل جل کر ایک ہو جاتے ہیں۔

ایسی ہی ایک شام ہم سارے بچّے لان پر کھیل رہے تھے، جب ایک "سیلون کار" برساتی میں آکر رکی، جس کی کھڑکیوں میں چینی ریشم کے نیلے پردے لگے ہوئے تھے۔ فوراً پردہ کرایا گیا اور وہ تصویر والی گوری چٹّی رانی صاحبہ سہج سہج چلتی گھاس پر آگئیں ـــــ تصویر میں ان کی مانگ میں سیندور لگا ہوا تھا، بالوں کے گچھے سے بنے تھے، اور جھالر دار بلاؤز کے ساتھ عنابی رنگ کی بنارسی ساری پہن رکھی تھی جس پر جڑاؤ بروچ چمک رہا تھا (بلاؤز، ساری اور بروچ سب اصلی تھے اور بڑی چابک دستی سے تصویر پر چپکائے گئے تھے۔) لیکن اس وقت ان کی مانگ سُونی تھی اور وہ سفید ریشمی ساری پہنے ہوئے تھیں۔ ایک اینگلو انڈین گورنس ان کے اکلوتے تین سالہ لڑکے کی انگلی تھامے ان کے پیچھے پیچھے کار سے برآمد ہوئی۔ رانی صاحبہ پھوپھی اور پھوپھا کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گئیں اور ہم بچّوں کو وہاں سے ہانک دیا گیا۔

یہ دمینتی دیوی آف رام کوٹ راج تھیں، جن کو اس روز میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ میری عمر جب کوئی چھ برس تھی۔ ان کی وہ کپڑوں والی تصویر اور ان کا لان پر آنا آج تک مجھے اسی طرح یاد ہے۔ اس وقت راجہ صاحب کے انتقال کو سال بھر ہوا تھا، اور علاقہ کورٹ میں تھا ـــــ پھوپھی سے ان کی بہت دوستی تھی اور پھوپھا ان کا بہت خیال رکھتے تھے وہ بے چاری زمینداری کے جھگڑوں میں گھری ہوئی تھیں اور رشتے دار ان کی مدد کرنے کی بجائے ان سے مقدمے لڑ رہے تھے۔ عدالتی معاملات کی دیکھ بھال کی غرض سے وہ اینگلو انڈین گورنس سے انگریزی بھی سیکھ رہی تھیں۔ دمینتی دیوی خود ایک پابند وضع تعلقے دار کی بیٹی تھیں اور پردے میں رہتی تھیں۔

○

میرے ہائی اسکول کے امتحان ہونے والے تھے اور میں اکثر پڑوس کی خالی کوٹھی کے کسی ڈھنڈار کمرے میں بیٹھ کر کلاسیکل موسیقی کے پرچے کے لئے زور زور سے سبق یاد کیا کرتی تھی۔

جب آآآ کرتے کرتے میرا ناک میں دم آجاتا تو کوئی ہلکا پھلکا گیت الاپنا شروع کر دیتی۔ اس روز میں بھوپالی کے تان پلٹے یاد کرنے کی بجائے نہایت خشوع و خضوع سے جو تھیکا رلئے کے "ٹھاکر روٹھ گئے ہیں کیسے انھیں مناؤں" کا وظیفہ کر رہی تھی کہ اچانک ایسا محسوس ہوا کہ پیچھے کوئی کھڑا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ ترا شیدہ بالوں والی ایک بے حد اسمارٹ خاتون بغیر آستین کے بلاؤز اور سفید جارجٹ کی ساری میں ملبوس، دروازے سے لگی میری "نغمہ سرائی" سن رہی ہیں اور ان کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ہے۔ میں تو ان کو پہچانی نہیں، مگر انھوں نے برابر کے پھاٹک پر والد کے نام کا بورڈ دیکھ لیا تھا۔ میں جھینپ کر اٹھ کھڑی ہوئی تو انھوں نے کہا۔ "بیٹا تم ہمیں پہچانیں نہیں —— ہم تمھاری ٹوا کی سہیلی ہیں ——"

"رانی صاحب ——!" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں بیٹا —— اب ہم تمھاری پڑوسی ہیں ——" انھوں نے جواب دیا۔

اسی وقت فرنیچر کا ٹرک باہر آکر رکا اور غل غپاڑہ شروع ہوگیا۔

"چلو ہم تمھارے یہاں سب سے مل آئیں ——" رانی صاحبہ نے کہا۔ ملازموں کو چند احکام دینے کے بعد وہ باہر آئیں اور میرے ساتھ ساتھ باڑ پھلانگ کر ہمارے احاطے میں داخل ہوگئیں۔

ہمارے یہاں اس وقت پچھلے برآمدے میں سہ پہر کی چائے پی جا رہی تھی۔ ابھی رانی صاحبہ کو بیٹھے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ ایک بے حد خوبصورت نوجوان سیڑھیوں پر نمودار ہوا۔ اس نے ادب سے سب کو تسلیم کی اور رانی صاحب سے کہا "مصرا صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں"۔

"ابھی آتے ہیں —— اور دیکھو سکرٹری —— مدار بخش سے کہو وہ بھی ٹھہرے"۔

"یس رانی صاحب ——" لڑکے نے جواب دیا اور الٹے پاؤں واپس ہوگیا۔

دمینتی دیوی پھر باتوں میں مصروف ہوگئیں، مگر انھوں نے جس تحکم اور سنجیدگی سے

اس لڑکے کو "سکرٹری" کہا وہ مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوا، کیوں کہ دبلا پتلا حسین لڑکا جو شکل سے کشمیری معلوم ہوتا تھا۔ سکرٹری کسی طرح نہ لگتا تھا۔

رانی صاحب نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور واپس چلی گئیں۔

اس وقت رانی صاحبہ کوئی پینتیس برس کی رہی ہوں گی۔ وہ روانی سے انگریزی بول رہی تھیں۔ علاقے کا کام خود سنبھالتی تھیں۔ فراٹے سے کار چلاتی تھیں اور مسوری کا "سیزن" بال روم رقص اور برج میں گذارتی تھیں وہ باوقار پردہ نشین بی بی جن کو میں نے سیتاپور میں دیکھا تھا۔ وہ بنارسی ساری میں لپٹی ہوئی تصویر جو پھوپھا کے لکھنؤ والے گھر کے ڈرائنگ روم میں اب بھی موجود تھی۔ ان میں اور اس ماڈرن خاتون میں بڑا فرق تھا۔ سات سال میں کایا پلٹ گئی تھی۔ دمینتی دیوی "سوسائٹی ٹائپ" بن چکی تھیں۔

والد آزادیٔ نسواں کے جوشیلے علم بردار اور حامی تھے۔ مگر ان کو یہ بے حد جدید ٹائپ بہت ناپسند تھا۔ اس وجہ سے ہماری ملاقات اب رانی صاحب سے بہت کم ہوتی تھی۔ اکثر ان کے یہاں سے رات گئے تک پارٹیوں کے شور و شغب کی آواز آتی رہتی۔ جب رانی صاحبہ علاقے پر چلی جاتیں تو ان کا سکرٹری ان کی غیر موجودگی میں ایک فلمی ریکارڈ بار بار بجاتا۔

آرام کہاں دل جو پڑا غیر کے پالے
مفلس کو خدا عشق کے پھندے میں نہ ڈالے

اکثر گراموفون کی سوئی ایک جگہ پر اٹک کر "مفلس کو خدا مفلس کو خدا مفلس کو خدا" کی تکرار کرتی جو کانوں کو سخت ناگوار گزرتا۔

مگر ایک خاصے ڈرامائی واقعہ نے اس غل غپاڑے کا خاتمہ بالخیر کر دیا۔

ایک روز صبح سویرے والد اپنے کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ رانی صاحبہ نے سراسیمگی کے عالم میں دریچے میں سے اندر جھانکا اور بولیں۔ "بڑا غضب ہو گیا —— میرے ساتھ چلئے —— فوراً —— بڑا غضب ہو گیا۔"

والد گھبرا کر فوراً برآمدے میں گئے۔

"سکرٹری نے خودکشی کرلی ___ فوراً میرے ساتھ چلئے ___ اومائی گاڈ ___ اب تک مربھی چکا ہوگا ___ اوہ ___ اوہ ___ کہہ رہا تھا ریل کی پٹری پر جا لیٹوں گا ___ اوہ ___"

"ٹھیریئے میں کپڑے تبدیل کرلوں ___" والد بےچارروں نے پریشانی سے کہا۔

"نہیں ___ نہیں ___ ایسے ہی چلئے ___ جلدی"۔ رانی صاحبہ نے بدحواسی سے جواب دیا۔ والد قمیص پاجامہ پہنے پہنے ہی ان کی کار میں بیٹھ گئے اور کار زن سے پھاٹک سے باہر نکل گئی۔ انھوں نے جاکر بارہ بنکی جانے والے قریبی ریلوے لائن کا ناکام جائزہ لیا ___ جہاں رانی صاحبہ کے بیان کے مطابق سکرٹری نے جان شیریں، جان آفریں کے سپرد کردی تھی۔ آخر پولیس چوکی پر اس کی گمشدگی کی اطلاع کرانے کے بعد جب وہ واپس لوٹیں تو مصراجی ان کے منشی نے پان چباتے ہوئے اطمینان سے خبر سنائی کہ سکرٹری حضرت گنج کے کافی ہاؤس میں قہوہ پیتا ہوا اور نمکین مونگ پھلی کھاتا پایا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہ کافی میں زہر نہیں ملا تھا ___ اس کے بعد وہ ہونہار نوجوان بالکل غائب ہوگیا۔

سکرٹری کے جانے کے بعد دمینتی دیوی بہت دنوں تک اپنے لان پر نظر نہیں آئیں۔ ڈنر اور پارٹیاں موقوف ہوئیں۔ ان کے گھر پر سناٹا سا چھا گیا۔

گرمیاں نکلیں ___ جاڑے آگئے ___ ایک روز میں پچھلے باغ میں ایک درخت کی شاخ پر بیٹھی بہت عرصہ بعد "ٹھاکر روٹھ گئے ہیں" الاپ رہی تھی کہ رانی صاحبہ مہندی کی باڑ کے نزدیک آکر کھڑی ہوگئیں ___ کچھ دیر یوں ہی چپ کھڑی رہیں، اور پھر اپنے مکان کی طرف واپس چلی گئیں۔

اس دوران میں ان کی ذاتی کوٹھی ٹبلر گنج میں تعمیر ہوچکی تھی۔ چند روز بعد وہ وہاں منتقل ہوگئیں اور مدتوں کہیں دکھائی نہ دیں۔

نفیسہ نامی ایک لڑکی بی۔اے میں میری ہم جماعت تھی ــــــ اس کی جن بزرگوار سے منگنی ہوئی وہ بھی بڑے سخت "سوسائٹی ٹائپ" تھے۔ منگنی کے بعد انھوں نے نفیسہ اور اس کی سہیلیوں کو ایک ڈنر پر مدعو کیا جو پروفیسر کھوچڑ کے گھر پر دیا گیا تھا۔ پروفیسر کھوچڑ یونی ورسٹی کے ایک نامور سائنسدان تھے۔ ان کی لڑکیاں بہت خوبصورت تھیں اور ان کی برج پارٹیوں میں لکھنؤ کے سارے فیشن ایبل رؤسا اور امراء آیا کرتے تھے۔ نفیسہ کا منگیتر حامد زبردست اسنوب (SNOB) تھا، اور بات اس طرح شروع کرتا تھا "کل میں اور غوث محمد لیڈی مہاراج سنگھ کے ہاں چائے پی رہے تھے تو وہاں لیڈی سرلیواستوا مجھ سے کہنے لگیں ...." یا "اس مرتبہ مسوری میں ہز ہائی نس آف راج پیپلا نے بتایا کہ ...."

لہذا جب ہم لوگ پروفیسر کھوچڑ کے ہاں پہنچے تو حامد اس محفل میں اس طرح جا شامل ہوا جس طرح بطخ پانی پر تیرنے لگتی ہے۔ مختلف راجاؤں، نوابوں اور آئی سی ایس افسروں کے کندھوں پر بے تکلف تھپکیاں لگانے اور ان کی خواتین کی طرف مسکراہٹیں پھینکنے کے بعد وہ اس گوشے میں پہنچا جہاں ایک طویل القامت، خوب رو شخص کاک ٹیل کا گلاس ہاتھ میں تھامے، آتش دان پر کہنی ٹکائے، پوز بنائے کھڑا مالتی کھوچڑ سے باتیں کر رہا تھا۔

"ارے یار منظور ــــــ" حامد نے قریب پہنچ کر کہا "یار تم پرسوں سرجے پی کے لنچ پر نہیں آئے؟ خانم حاجی بھی مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ اپنا منظور آج کل کہاں غائب ہے"۔

منظور صاحب نے ایک ابرو اٹھا کر اپنی بلندی سے حامد کو دیکھا اور مسکرائے "ہلو ــــــ یو سو اینڈ سو ــــــ!" (HELLO, YOU SO AND SO) انھوں نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"ہاہاہا ــــــ" حامد نے منظور صاحب کے کندھے پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا اور دو چار باتیں کر کے ہماری طرف لوٹا۔

"یہ منظور صاحب کون ہیں؟" نفیسہ نے پوچھا۔

"ارے وہی ——"

"وہی کون ——"

"ارے بھئی اپنی دمینتی کے سکرٹری ——"

"دمینتی کون —— ؟" نفیسہ نے پوچھا۔

"رانی صاحبہ رام کوٹ راج —— مگر اب کچھ مغرور سا ہو گیا ہے سالا۔ کونسل کی ممبر تو ہوئی ہیں رانی صاحبہ اور دماغ اس کے آسمان پر چڑھ گئے" حامد نے جواب دیا۔

"اچھے خاندان کا لڑکا ہے۔ مگر جب مفت کا عیش ملے تو ہماری تمھاری طرح محنت مزدوری کی اسے کیا ضرورت ہے"۔ ہم لوگوں کے قریب بیٹھے ہوئے ایک مہمان نے کہا۔

"ارے بھئی ہمیں کوئی اپنا سکرٹری نہیں بناتا ——" دوسرے مہمان نے جو زیادہ پی گئے تھے، آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

یہ مکالمہ میری سمجھ میں نہیں آیا، لیکن چند لمحوں بعد ہی کھانا شروع ہو گیا۔ اور منظور احمد صاحب جب خالی پلیٹیں باٹتے ہوئے میرے پاس آئے تو میں نے ان سے دمینتی دیوی کی خیریت دریافت کی۔ منظور صاحب نے بڑے اخلاق سے بتایا کہ رانی صاحبہ کا لڑکا رندھیر جو اب تک کالون تعلقدارز کالج میں پڑھ رہا تھا۔ ایر فورس کی ٹریننگ کے لئے کل انبالے جا رہا ہے۔ رانی صاحبہ اس کی روانگی کی تیاریوں میں مصروف ہیں، اس لئے یہاں دعوت میں نہ آسکیں —— اس کے بعد منظور صاحب مجمع میں کھو گئے۔

○

کوئی دو تین برس ادھر کی بات ہے۔ میں اپنے میزبانوں، شوبھا اور ترلوک ماتھر اور شوبھا کی چھوٹی بہن نلنی کے ساتھ دلی کے میڈنز ہوٹل کے ایک تقریباً سنسان ڈرائنگ روم میں آتش دان کے قریب بیٹھی تھی۔ باہر کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ آتش دان میں تیز آگ لہک رہی تھی اور ہم لوگ کافی ختم کر کے گھر جانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ ایک عمر رسیدہ امریکن

جوڑا قریب سے گذرا۔ اس کے بعد ستر برس سے اوپر کی عمر والے امریکن سیاحوں کی ایک پوری ٹولی ڈرائنگ روم میں سے گزر کر برابر کے کمرے میں چلی گئی

"آج کل اینٹی بایوٹکس (ANTI-BIOTICS) نے عمریں بڑھادی ہیں۔ وافر عمر، وافر دولت، وافر عیش و عشرت۔ کیا زندگیاں ہیں، ان لوگوں کی!" ترلوک نے کہا۔

اینٹی بایوٹکس کے لفظ پر بایوکیمسٹری میرے ذہن میں آئی، جس کا نام بھی میرے لئے ناقابل فہم ہے۔ شوبھا کی بہن نلنی بایوکیمسٹری میں پی ایچ۔ڈی کر رہی تھی۔

"تم کس مضمون پر ریسرچ کر رہی ہو"۔ میں نے جماہی لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"چوہے کے جگر پر"۔

"غضب خدا کا"۔

"نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں چوہے کا جگر پیدا"

ترلوک نے لہک کر کہا۔

"کیا مہمل بات ہے"۔ میں نے اکتا کر کہا ــــــ مجھے زور کی نیند آرہی تھی۔

"وافر عمر، وافر دولت، وافر عیش"۔ ترلوک نے دہرایا۔

"غلط ــــ بالکل غلط ــــ" ڈرائنگ روم کے ایک کونے سے ایک بھاری آواز بلند ہوئی۔ ہم لوگوں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ وسیع کمرے کے دوسرے سرے پر ایک اسٹینڈرڈ لیمپ کے سائے میں ایک ہندوستانی اور ایک یوریشین جوڑا برج میں مصروف تھا۔ ہندوستانی خاتون کی پشت ہماری طرف تھی اور ان کے سفید بال جو جدید فیشن کے مطابق نیلے رنگے ہوئے تھے مدھم روشنی میں چمک رہے تھے۔ بھاری آواز والے ہندوستانی مرد نے پائپ کی راکھ جھٹکتے ہوئے ہماری طرف سرسری نگاہ ڈالی۔ مجھے ان کا جھرّیوں والا چہرہ ذرا مانوس سا معلوم ہوا۔ پھر وہ کوشش سے چھڑی کے سہارے اٹھے۔ ذرا لنگڑاتے ہوئے گیلری کے دروازے

پر جاکر انھوں نے بیرے کو آواز دی اور واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ (وہ کھیل میں "ڈمی" تھے۔) چند لمحوں کے بعد انھوں نے پہلو بدل کر اپنی رِسٹ واچ پر نظر ڈالی۔

"کیا بات ہے ؟" یورپین عورت نے پوچھا۔

"کچھ نہیں ، انسان فانی ہے۔ اس لئے بار بار گھڑی دیکھتا ہے"۔ انھوں نے اسی گمبھیر آواز میں جواب دیا۔

کمرے میں عجیب سا سناٹا چھا گیا۔ نیلے بالوں والی ضعیفہ خاموشی سے کھیل میں منہمک رہیں۔ بیرا اندر آیا۔ اس نے مشروبات کی کشتی قریب کی تپائی پر رکھی اور واپس چلا گیا۔

اتنے میں ایک خوش شکل نوجوان ، سرخ "ٹرٹل نیک" سوئیٹر اور سیاہ پتلون میں ملبوس کوٹ کندھوں پر ڈالے ، ہوا کے جھونکے کی طرح اندر آیا۔ ذرا ادا سے چلتا ، ہم لوگوں کو نگاہِ غلط انداز سے دیکھتا ہوا وہ برج ٹیبل کے پاس گیا اور پیانو سے ٹک کر کھیل دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ نیلے بالوں والی خاتون نے سر اٹھا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک ادائے دلبری کے ساتھ نوجوان نے نفی میں سر ہلایا اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر دیوار پر لگی ہوئی تصویریں دیکھنے لگا۔

ہم لوگ گھر جانے کے لئے اٹھے اور دروازے کی سمت جاتے ہوئے برج ٹیبل کے پاس سے گذرنے لگے تو نیلے بالوں والی خاتون نے سر اٹھایا اور تیوری پر بل ڈال کر مجھے غور سے دیکھا۔

"ارے —— یہ تو رانی صاحبہ رام کوٹ ہیں"۔ شوبھا نے آہستہ سے کہا "بے چاری کا اکلوتا لڑکا پچھلے سال ہوائی جہاز کے حادثے میں مارا گیا۔ بہترین پائلٹ تھا"۔

میں ان کے قریب گئی۔ چند لمحے مجھے دیکھتے رہنے کے بعد پہچان گئیں اور کرسی سے اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئیں —— پھر انھوں نے میرے خاندان والوں کی خیریت دریافت کی۔ میں قریب کے صوفے کے ہتھے پر ٹک گئی۔ رانی صاحبہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا

"تمھاری بُوا سے کبھی کبھار لکھنؤ میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ جب سے تمھارے پھوپھا کا انتقال ہوا ہے وہ کہیں آتیں جاتیں نہیں ـــــ"

"کس کا انتقال ہوا ہے؟" بھاری آواز والے مرد نے تاش سمیٹتے ہوئے بے دھیانی سے سوال کیا۔

"خان بہادر صاحب بے چارے کا ـــــ" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں "میرے ساتھ تو تم جانتی ہو بٹیا انھوں نے ساری عمر سگے بھائیوں سے بڑھ کر سلوک کیا"۔

اب میں بھی پہچان گئی۔ بھاری آواز والے صاحب منظور احمد تھے۔ مگر اب وہ بے حد دبلے پتلے مریض، بدمزاج چڑچڑے سے نظر آتے تھے۔ رانی صاحبہ بات کرتے کرتے ان کی طرف اس طرح دیکھ لیتی تھیں جیسے بیوی اپنے شوہر کی بدمزاجی برداشت کرنے کی عادی ہو جاتی ہے۔

میں نے ترلوک، شوبھا اور نلنی کا رانی صاحبہ سے تعارف کرایا رانی صاحبہ نے ڈچ جوڑے کو ہم لوگوں سے ملوایا۔

"تمھاری بُوا بے چاری بھی بوڑھی ہو گئیں ـــــ اتنی سندر تھیں جوانی میں ـــــ" وہ اسی اداس آواز میں کہتی رہیں۔

"ہم سب بوڑھے ہو گئے ہیں بی بی ـــــ" منظور صاحب نے جھنجھلا کر ان سے کہا اور زور سے پائپ جھٹکنے لگے۔

سرخ سوئٹر والا شکیل نوجوان اٹھلاتا ہوا آکر دوبارہ کھیل دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اسے دیکھ کر دمینتی دیوی کے تھکے ہوئے چہرے پر اجالا سا پھیل گیا۔ آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ وہ جوانی میں حسین نہیں تھیں لیکن اب نیلے بالوں کے ساتھ ان میں ایک خاص وقار سا آگیا تھا۔

ڈچ میاں بیوی خاموش بیٹھے تھے۔ اب ڈچ خاتون نے لڑکے کو نظر بھر کے دیکھا اور ذرا ہلکی سی سوالیہ نگاہ منظور صاحب پر ڈالی۔

"میراری پلیسمنٹ (REPLACEMENT)" منظور صاحب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے ڈچ جوڑے سے کہا ـــــــ "گوگل چڈہ رانی صاحبہ کے اسسٹنٹ پرائیویٹ سکرٹری ـــــــ مسٹر اینڈ مسز فان ٹوک ـــــ"

نوجوان نے مسکرا کر سر خم کیا اور منظور صاحب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ منظور صاحب لنگڑاتے ہوئے ایک طرف کو چلے گئے۔ رانی صاحبہ پھر تاش میں محو ہو گئیں۔

"ون نو ٹرمپ"۔

"ٹو ہارٹس"۔

"ٹو نو ٹرمپس"۔

"تھری ہارٹس"۔

میں نے رانی صاحبہ کو خدا حافظ کہا اور دروازے پر پہنچ کر ایک بار پھر کمرے پر نظر ڈالی۔ کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا اور ایک میز کے گرد چار سر جھکے ہوئے تھے۔ ڈینتی دیوی کے نیلے بال زرد روشنی میں جھلملا رہے تھے اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تاش میں مستغرق ہو چکی تھیں۔ منظور احمد وسیع، گہرے کمرے کی پرچھائیوں میں کہیں گم ہو گئے تھے اور اسسٹنٹ سکرٹری اپنے گھنگریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اپنے ہاتھ کے پتّوں پر غور کر رہا تھا۔

جب ہم لوگ کمرے سے باہر نکلنے لگے تو عنابی بنارسی ساری اور جھالر دار بلاؤز میں ملبوس ایک بھولی سی لڑکی دروازے میں مجھ سے ٹکرا گئی۔ اس نے بالوں کے گچھے سے بنا رکھے تھے اور اس کی ساری میں جڑاؤ بروچ چمک رہا تھا۔ میں نے چونک کر آنکھیں پوری طرح کھولیں اور شوبھا نے کہا "واقعی تم تو نیند سے لڑکھڑائے جا رہی ہو۔ چلو جلدی سے گھر پہنچیں"۔

چنانچہ، ہم لوگ تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگے۔

نظارہ درمیاں ہے

تارا بائی کی آنکھیں تاروں کی ایسی روشن ہیں اور وہ گرد و پیش کی ہر چیز کو حیرت سے تکتی ہے۔ دراصل تارا بائی کے چہرے پر آنکھیں ہی آنکھیں ہیں۔ وہ قحط کی سوکھی ماری لڑکی ہے جسے بیگم الماس خورشید عالم کے ہاں کام کرتے ہوئے صرف چند ماہ ہوئے ہیں، اور وہ اپنی مالکن کے شاندار فلیٹ کے ساز و سامان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھتی رہتی ہے کہ ایسا عیش و عشرت اسے پہلے کبھی خواب میں بھی نظر نہ آیا تھا۔ وہ گورکھ پور کے ایک گاؤں کی بال وِدھوا ہے، جس کے سسر اور ماں باپ کے مرنے کے بعد اس کے ماما نے جو بمبئی میں دودھ والا بھیّا ہے، اسے یہاں بلا بھیجا تھا۔

الماس بیگم کے بیاہ کو ابھی تین چار مہینے ہی گزرے ہیں۔ ان کی منگلورین آیا جو ان کے ساتھ میکے سے آئی تھی "ملک" چلی گئی تو ان کی بے حد منتظم خالہ بیگم عثمانی نے جو ایک نامور سوشل ورکر ہیں، ایمپلائمنٹ ایکس چینج فون کیا اور تارا بائی پٹ بیجنے کی طرح آنکھیں جھپکاتی کمبالا ہل کے "اسکائی اسکریپر" گل نسترن کی دسویں منزل پر آن پہنچیں۔ الماس بیگم نے ان کو ہر طرح قابلِ اطمینان پایا، مگر جب دوسرے ملازموں نے انھیں تارا بائی کہہ کر پکارا تو وہ بہت بگڑیں "ہم کوئی پتریا ہوں ؟" انھوں نے احتجاج کیا۔ مگر اب ان کو تارا دئی کے بجائے تارا بائی

کہلانے کی عادت ہو گئی ہے اور وہ چپ چاپ کام میں مصروف رہتی ہیں اور بیگم صاحب اور ان کے صاحب کو آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھا کرتی ہیں۔

الماس بیگم کا اگر بس چلے تو وہ اپنے طرحدار شوہر کو ایک لمحے کے لئے اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں اور وہ جوان جہان آیا کو ملازم رکھنے کی ہرگز قائل نہیں۔ مگر تارا بائی جیسی بے جان اور سگھڑ خادمہ کو دیکھ کر انھوں نے اپنی تجربہ کار خالہ کے انتخاب پر اعتراض نہیں کیا۔

تارا بائی صبح کو بیڈروم میں چائے لاتی ہے۔ بڑی عقیدت سے صاحب کے جوتوں پر پالش اور کپڑوں پر استری کرتی ہے۔ ان کے شیو کا پانی لگاتی ہے۔ جھاڑ پونچھ کرتے وقت وہ بڑی حیرت سے ان خوبصورت چیزوں پر ہاتھ پھیرتی ہے جو صاحب اپنے ساتھ پیرس سے لائے ہیں۔ ان کا وائلن وارڈروب کے اوپر رکھا ہے۔ جب پہلی بار تارا بائی نے بیڈروم کی صفائی کی تو وائلن پر بڑی دیر تک ہاتھ پھیرا کی۔ مگر پرسوں صبح جب وہ حسب معمول بڑی نفاست سے وائلن صاف کر رہی تھی تو نرم مزاج اور شریف صاحب (بیگم صاحب تنیا مرچ ہیں) اسی وقت کمرے میں آگئے اور اس پر برس پڑے کہ وائلن کو ہاتھ کیوں لگایا اور تارا بائی کے ہاتھ سے چھین کر اسے الماری کے اوپر پٹخ دیا۔ تارا بائی سہم گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور صاحب ذرا شرمندہ سے ہو کر باہر برآمدے میں چلے گئے جہاں بیگم صاحب بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ ویسے بیگم صاحب کی صبحیں عموماً ہیئر ڈریسر کے ہاں اور بیوٹی سیلون میں گزرتی ہیں۔ مینی کیور، پیڈی کیور، مساج، فیشل، سونا باتھ —— ایک سے ایک بڑھیا ساڑھیاں، درجنوں رنگ برنگے سلیکس اور عطر کے ڈبے اور گہنے ان کی الماریوں میں پٹے پڑے ہیں۔ مگر تارا بائی سوچتی ہے۔ بھگوان نے میم صاحب کو دولت بھی دی، عزت بھی اور ایسا سندر پتی بھی۔ بس شکل دینے میں کنجوسی کر گئے۔

صاحب سنا ہے میم صاحب مِس صاحب لوگ کی سوسائٹی میں بے حد مقبول تھے۔ مگر بیاہ کے بعد سے بیگم صاحب نے ان پر بہت سی پابندیاں لگا دی ہیں۔ دفتر جاتے ہیں تو

دن میں کئی بار فون کرتی ہیں۔ شام کو کسی کام سے اکیلے باہر جائیں تو بیگم صاحب کو پتہ رہتا ہے کہ کہاں کہاں گئے ہیں اور جگہوں پر بھی فون کرتی رہتی ہیں۔ شام کو سیر و تفریح یا ملنے ملانے کے لئے دونوں میاں بیوی باہر جاتے ہیں تب بھی بیگم صاحب بڑی کڑی نگرانی رکھتی ہیں۔ مجال ہے جو وہ کسی دوسری لڑکی پر نظر بھی ڈال لیں۔

صاحب نے یہ سارے قاعدے قانون، ہنسی خوشی قبول کر لئے ہیں کیوں کہ بیگم صاحب بہت امیر ہیں اور صاحب کو نوکری بھی ان کے دولتمند سسرے ہی نے دلوائی ہے۔ ورنہ بیاہ سے پہلے صاحب بہت غریب آدمی تھے۔ اسکالرشپ پر انجینئرنگ پڑھنے فرانس گئے تھے۔ واپس آئے تو روزگار نہیں ملا، پریشان حال گھوم رہے تھے۔ جب ہی بیگم صاحب کے گھر والوں نے انھیں پھانس لیا۔

بڑے لوگوں کے یہ عجیب و غریب قصے تارا بائی فلیٹ کے مستری (باورچی)، حمال اور دوسرے نوکروں سے سنتی ہے اور اس کی آنکھیں اچنبھے سے جھلملاتی رہتی ہیں۔

خورشید عالم بڑے اچھے وائلن نواز بھی تھے۔ مگر جب سے بیاہ ہوا ہے، بیوی کی محبت میں ایسے کھوئے کہ وائلن کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کیوں کہ الماس بیگم کو اس ساز سے دلی نفرت ہے۔ خورشید عالم بیوی کے بے حد احسان مند ہیں کیوں کہ اس شادی سے ان کی زندگی بدل گئی۔ اور احسان مندی ایسی شے ہے کہ ایک سنگیت کار اپنی سنگیت کی قربانی بھی دے سکتا ہے۔ خورشید عالم شہر کی ایک خستہ عمارت میں پڑے تھے، اور بسوں پر مارے مارے پھرتے تھے، اب لکھ پتی کی حیثیت سے کمبالاہل پر فروکش ہیں۔ مرد کے لئے اس کا اقتصادی تحفظ غالباً سب سے بڑی چیز ہے۔

خورشید عالم اب وائلن شاید کبھی نہیں بجائیں گے۔

○

یہ صرف ڈیڑھ سال پہلے کا ذکر ہے۔ الماس اپنے ملک التجار باپ کی عالی شان کوٹھی

میں مالا بار ہِل پر رہتی تھیں۔ وہ سوشل ورک کر رہی تھیں اور عمر زیادہ ہونے کے کارن شادی کی امید سے دست بردار ہو چکی تھیں۔ جب ایک دعوت میں ان کی ملاقات خورشید عالم سے ہوئی اور ان کی جہاں دیدہ خالہ بیگم عثمانی نے ممکنات بھانپ کر اپنے "جاسوسوں" کے ذریعہ معلومات فراہم کیں۔ لڑکا یوپی کا ہے۔ یورپ سے لوٹ کر تلاشِ معاش میں سرگرداں ہے، مگر شادی پر تیار نہیں۔ کیوں کہ فرانس میں ایک "لڑکی" چھوڑ آیا ہے، اور اس کی آمد کا منتظر ہے بیگم عثمانی فوراً اپنی مہم میں جُٹ گئیں۔ الماس کے والد نے اپنی ایک فرم میں خورشید عالم کو پندرہ سو روپے ماہ وار پر ملازم رکھ لیا۔ الماس کی والدہ نے انھیں اپنے ہاں مدعو کیا اور الماس سے ملاقاتیں خود بخود شروع ہو گئیں۔ مگر پھر بھی "لڑکے" نے "لڑکی" کے سلسلے میں مطلق کسی گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا۔ دفتر سے لوٹ کر بیشتر وقت انھیں الماس کے ہاں گزارنا پڑتا اور اس لڑکی کی سطحی گفتگو سے اکتا کر وہ اس پر فضا بالکنی میں جا کھڑے ہوتے جس کا رخ سمندر کی طرف تھا، پھر وہ سوچتے ـــــ ایک دن "اس" کا جہاز اس ساحل سے آن کر لگے گا۔ وہ بالکنی کے جنگلے پر جھکے افق کو تکتے رہتے۔ الماس اندر سے نکل کے شگفتگی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھتی "کیا سوچ رہے ہیں؟" وہ ذرا جھینپ کر مسکرا دیتے۔

رات کے کھانے پر الماس کے والد کے ساتھ ملکی سیاست سے وابستہ ہائی فنانس پر تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد وہ تھکے ہارے اپنی جائے قیام پر پہنچتے اور وائلن نکال کر وہ دھنیں بجانے لگتے جو "اس" کی سنگت میں پیرس میں بجایا کرتے تھے۔ وہ دونوں ہر تیسرے دن ایک دوسرے کو خط لکھتے تھے اور پچھلے خط میں انھوں نے اسے اطلاع دی تھی کہ انھیں بمبئی ہی میں بڑی عمدہ ملازمت مل گئی ہے۔ اس ملازمت کے ساتھ جو خوفناک شاخسانے بھی تھے اس کا ذکر انھوں نے خط میں نہیں کیا تھا۔

ایک برس گزر گیا مگر انھوں نے الماس سے شادی کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ آخر بیگم عثمانی نے طے کیا کہ خود ہی ان سے صاف صاف بات کر لینا اب عین مناسب ہے۔ مگر تب۔

ہی پرتاپ گڑھ سے تار آیا کہ خورشید عالم کے والد سخت بیمار ہیں اور وہ چھٹی لے کر وطن روانہ ہو گئے۔

ان کو پرتاپ گڑھ گئے چند روز ہی گذرے تھے کہ الماس جواب ان کی طرف سے نا امید ہو چکی تھی ایک شام اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک جرمن پیانسٹ کا کونسرٹ سننے تاج محل گئی، کرسٹل روم میں حسب معمول بوڑھے پارسیوں اور پارسنوں کا مجمع تھا۔ اور ایک بے حد حسین آنکھوں والی پارسی لڑکی کونسرٹ کا پروگرام بانٹتی پھر رہی تھی۔ ایک شناسا خاتون نے الماس کا تعارف اس لڑکی سے کرایا۔ "مس پیروجا جہانگیر دستور"۔ اور خود آگے چلی گئیں۔

الماس نے حسب عادت بڑی ناقدانہ اور تیکھی نظروں سے اس اجنبی لڑکی کا جائزہ لیا۔ لڑکی بے حد حسین تھی۔

"آپ کا کیا نام بتلایا مسز رستم جی نے ؟" الماس نے ذرا مشفقانہ انداز میں سوال کیا۔

"پیروجا دستور"۔ لڑکی نے سادگی سے جواب دیا۔

"میں نے آپ کو پہلے کسی کونسرٹ وغیرہ میں نہیں دیکھا"۔

"میں سات برس بعد پچھلے ہفتے ہی پیرس سے واپس آئی ہوں"۔

"سات برس پیرس میں! تب تو آپ فرنچ خوب فر فر بولتی ہوں گی"۔ الماس نے ذرا ناگواری سے کہا۔

"جی ہاں ——— !" پیروجا ہنسنے لگی۔

اب خاص خاص مہمان جرمن پیانسٹ کے ہمراہ سی لاؤنج کی سمت بڑھ رہے تھے۔ پیروجا الماس سے معذرت چاہ کر ایک انگریز خاتون سے اس پیانسٹ کی موسیقی پر ٹیکنکل قسم کا تبصرہ کرنے میں منہمک ہو گئی۔ لیکن سی لاؤنج میں پہنچ کر الماس پھر اس لڑکی سے ٹکرا گئی۔ کمرے میں چائے کی گہما گہمی شروع ہو چکی تھی۔

"آئیے یہاں بیٹھ جائیں"۔ پیروجا نے مسکرا کر الماس سے کہا۔ وہ دونوں دریچے سے

لگی ہوئی ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔

"آپ تو ویسٹرن میوزک کی ایکسپرٹ معلوم ہوتی ہیں"۔ الماس نے ذرا رکھائی سے بات شروع کی، کیوں کہ وہ خوبصورت اور کم عمر لڑکیوں کو ہرگز برداشت نہ کر سکتی تھی۔

"جی ہاں، میں پیرس پیانو کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ہی گئی تھی"۔

الماس کے ذہن میں کہیں دور خطرے کی گھنٹی بجی اس نے باہر سمندر کی شفاف نیلی سطح پر نظر ڈال کر دفعتاً بڑے اخلاق اور بے تکلفی سے کہا "ہاؤ انٹرسٹنگ۔ پیانو تو ہمارے ہاں بھی موجود ہے کسی روز آکر کچھ سناؤ"۔

"ضرور ——" پیروجا نے مسرت سے جواب دیا۔

"سنیچر کے روز کیا پروگرام ہے تمھارا؟ میں اپنے ہاں ایک ہین پارٹی (HEN PARTY) کر رہی ہوں، سہیلیاں تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی"۔

"آئی وڈ لو ٹو کم —— تھینک یو!"

"تم رہتی کہاں ہو، پیروجا؟"

پیروجا نے تارڈیو کی ایک گلی کا پتہ بتایا۔ الماس نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔ تارڈیو مفلوک الحال پارسیوں کا محلہ ہے۔

"میں اپنے چچا کے ساتھ رہتی ہوں۔ میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ میرے کوئی بھائی بہن بھی نہیں چچا چچی نے پالا ہے۔ وہ لاولد ہیں۔ چچا سنٹرل بینک میں کلرک ہیں۔" پیروجا سادگی سے کہتی رہی۔ پھر ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد سمندر کی پر سکون سطح کو دیکھتے ہوئے اس نے اچانک کہا "کسی عجیب بات ہے۔ پچھلے ہفتے جب میرا جہاز اس ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا تو میں سوچ رہی تھی کہ اتنے عرصے بعد اجنبیوں کی طرح بمبئی واپس پہنچ رہی ہوں، یہ بڑا کٹھور شہر ہے۔ تم کو تو معلوم ہی ہوگا الماس —— بہ مخلص دوست یہاں بہت مشکل سے ملتے ہیں۔ مگر میری خوش قسمتی دیکھو کہ آج ہی تم سے ملاقات ہو گئی"۔

الماس نے دردمندی کے ساتھ سر ہلایا۔ سی سی لاؤنج میں باتوں کی دھیمی دھیمی بھنبھناہٹ جاری تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے پوچھا "تم پیرس کیسے گئیں؟"

"مجھے اسکالرشپ مل گیا تھا۔ وہاں پیانو کی ڈگری لینے کے بعد چند سال تک ایک میوزک کالج میں ریسرچ کرتی رہی، میں وہاں بہت خوش تھی مگر میرے چچا، چچی یہاں بالکل اکیلے تھے۔ وہ دونوں بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ چچی بے چاری تو ضعیف العمری کی وجہ سے بالکل بہری ہو گئی ہیں ان کی خاطر واپس آ گئی۔ اور اس کے علاوہ ——"

"ہلو الماس! تم یہاں بیٹھی ہو! چلو جلدی۔ مسز ملگاؤں کر تم کو بلا رہی ہیں"۔ ایک خاتون نے میز کے پاس آ کر کہا۔ پیرو جا کی بات ادھوری رہ گئی۔ سنیچر کو صبح گیارہ بجے کار بھیج دوں گی۔ الماس نے کہا اور معذرت چاہ کر میز سے اٹھ کر مہمانوں کے مجمع میں کھو گئی۔

سنیچر کے روز پیرو جا الماس کے گھر پہنچی، جہاں مرغیوں کی پارٹی اپنے عروج پر تھی بیٹلز کے ریکارڈ بج رہے تھے۔ چند لڑکیاں جنھوں نے چند روز پہلے ایک فیشن شو میں حصہ لیا تھا، زور و شور سے اس کے واقعات پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ یہ سب لڑکیاں جن کی ماتر بھاشائیں اردو، ہندی، گجراتی اور مراٹھی تھیں، صرف انگریزی بول رہی تھیں، اور انھوں نے چست پتلونیں یعنی "اسٹریچ پینٹس" پہن رکھی تھیں۔ پیرو جا کو ایک لمحہ کے لئے محسوس ہوا کہ وہ ابھی ہندوستان واپس نہیں آئی ہے۔ اس کا اپنا فرقہ بے حد مغرب پرست تھا، مگر برسوں یورپ میں رہ کر اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اجنتا کی زندہ تصویروں کی بجائے ان مغرب زدہ ہندوستانی خواتین کو دیکھ کر اہل یورپ کو سخت افسوس اور مایوسی ہوتی ہے۔ چنانچہ پیرو جا حسبِ دستور پیرس اور روم میں اپنی ٹھیٹھ ہندوستانی وضع قطع پر بڑی نازاں رہتی۔ بمبئی کی ان نقلی امریکن لڑکیوں سے اکتا کر وہ بالکنی میں جا کھڑی ہوئی، جس کے سامنے سمندر تھا اور پہلو میں برج خموشاں کا جنگل نظر آ رہا تھا۔ وہ چونک اٹھی، گھنے جنگل کے اوپر کھلی فضاؤں میں چند گدھ اور کوّے منڈلا رہے تھے اور چاروں طرف بڑا ڈراؤنا سناٹا طاری تھا۔ وہ گھبرا کر واپس پلٹی اور زندگی سے گونجتے ہوئے کمرے میں آ کر ایک

صوفے پر ٹک گئی۔

کمرے کے ایک کونے میں غالباً بطورِ آرائش اسٹین وے کا گرینڈ پیانو رکھا ہوا تھا۔ لڑکیاں اب ریڈیوگرام پر ہیری بیلافونٹ کا پرانا کلیپسو "جمیکا فیرویل" بجا رہی تھیں۔ مغنی کی دلکش آواز گٹار کی جان لیوا گونج کے ساتھ ساتھ کمرے میں پھیلنے لگی۔

DOWN THE WAY WHERE THE NIGHTS ARE GAY

AND THE SUN SHINES DAILY ON THE MOUNTAIN TOP,

I TOOK A TRIP ON A SAILING SHIP

AND WHEN I REACHED JAMAICA I MADE A STOP

BUT I AM SAD TO SAY I AM ON MY WAY AND

WON'T BACK FOR MANY A DAY

MY HEART IS DOWN, MY HEAD IS TURNING AROUND

I HAD TO LEAVE A LITTLE GIRL IN KINGSTON TOWN

الماس چپ چاپ جاکر بالکنی میں کھڑی ہوگئی۔ ریکارڈ ختم ہوا تو اس نے اندر آکر پیرو جا سے کہا "ہم لوگ سخت بدمذاق ہیں ایک ماہر پیانسٹ یہاں بیٹھی ہے اور ہم ریکارڈ بجا رہے ہیں! چلو بھائی —— اٹھو ——"

پیرو جا مسکراتی ہوئی جاکر پیانو کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

"کیا سناؤں؟ میں تو صرف کلاسیکل میوزک ہی بجاتی ہوں۔"

"ہائے، پوپ (POP) نہیں؟" لڑکیوں نے غل مچایا —— "اچھا کوئی انڈین فلم سونگ بجاؤ۔"

"فلم سونگ بھی مجھے نہیں آتے —— مگر —— مگر ایک غزل یاد ہے جو مجھے —— جو مجھے"۔ وہ جھینپ کر ٹھٹھک گئی۔

"غزل ـــــ؟ اوہ! آئی لو اردو پوئیٹری"۔ ایک مسلمان لڑکی نے جس کے والدین زبان تھے، بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا۔

پیرو جا نے پردوں پر انگلیاں پھیریں اور اسے ایک انجانی مسرور پھریری سی آئی، اس نے آہستہ آہستہ ایک دلکش دھن بجانا شروع کی۔

"گاؤ بھی ساتھ ساتھ"۔ لڑکیاں چلائیں۔

"بھئی میں گا نہیں سکتی۔ میرا اردو تلفظ بہت خوفناک ہے"۔

"اچھا اس کے الفاظ بتا دو ـــــ ہم لوگ گائیں گے"۔

"وہ کچھ اس طرح ہے"۔ پیرو جا نے کہا۔

"تو سامنے ہے اپنے بتلا کہ تو کہاں ہے
کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے"

چند لڑکیوں نے ساتھ ساتھ گانا شروع کر دیا ـــ "نظارہ درمیاں ہے ـــ نظارہ درمیاں ہے"۔
غزل ختم ہوئی۔ تالیاں بجیں۔

"اب کوئی ویسٹرن چیز بجاؤ"۔ ایک لڑکی نے فرمائش کی۔

"شوپاں کی میڈنز فینسی (MAIDEN'S FANCY) بجاؤں؟ یہ نغمہ میں اور میرا بز ہمیشہ اکٹھے بجاتے تھے پیرس میں۔ وہ وائلن پر میری سنگت کرتے تھے"۔

"تمھارے منگیتر بھی میوزیشن ہیں؟" ایک لڑکی نے پوچھا۔

"پروفیشنل نہیں۔ شوقیہ"۔ پیرو جا نے جواب دیا اور نغمہ بجانے میں محو ہو گئی۔

اگلے دو ہفتوں میں الماس نے پیرو جا سے بڑی پکی دوستی گانٹھ لی، اس دوران میں پیرو جا کو ایک کانونٹ کالج میں پیانو سکھانے کی ملازمت مل چکی تھی جو تعطیلات کے بعد کھلنے والا تھا۔ ہفتے میں تین بار ایک امریکن کی دس سالہ لڑکی کو پیانو سکھانے کا ٹیوشن بھی اسے مل گیا

تھا۔ امریکن کی بیوی کا حال ہی میں انتقال ہو تھا اور وہ اپنا غم بھلانے کے لئے اپنے بچوں کے ہمراہ بغرض سیاحت ہندوستان آیا ہوا تھا اور جوہو سن اینڈ سینڈ میں مقیم تھا۔ تاردیو سے جوہو تک کا سفر خاصا طویل تھا مگر امریکن پیرو جا کو اچھی تنخواہ دینے والا تھا اور بڑی شفقت سے پیش آتا تھا۔ پیروجا اپنی زندگی سے فی الحال بہت خوش تھی۔ چند روز بعد "وہ" اپنے وطن سے واپس آنے والا تھا۔ پیروجا نے اسے بمبئی آتے ہی ملازمت اور ٹیوشن ملنے کی اطلاع نہیں دی تھی کہ وہ "اسے" ایک اچانک "سرپرائز" دینا چاہتی تھی۔

ایک روز وہ الماس کے ساتھ اس کی کوٹھی کے باغ میں ٹہل رہی تھی، کہ فوارے پر پہنچ کر الماس نے اس سے دفعتاً سوال کیا "تم نے وہ غزل کہاں سے سیکھی تھی؟ وہی جو تم اس روز گا رہی تھیں؟"

"اوہ ـــــ وہ؟ پیرس میں!"

"پیرس! ہاؤ انٹرسٹنگ! کس نے سکھائی؟"

"میرے منگیتر نے۔"

"اوہ پیروجا ـــــ یو ڈارک ہورس۔ چار سو بیس! مجھ کو بتایا بھی نہیں اب تک!"

"تمھاری ہی کمیونٹی کے ہیں وہ۔"

"اوہ ـــــ واقعی"۔ الماس فوارے کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔

"میرے باپ دادا دستور تھے۔ مگر میرے چچا بہت روشن خیال ہیں۔ انھوں نے اجازت دے دی ہے"۔

"کیا نام ہے صاحب زادے کا؟"

یہ ناموں کا بھی عجیب قصہ تھا، خورشید عالم اس کی نرگسی آنکھوں پر عاشق ہوئے تھے۔ جب پیرس کے ہندوستانی سفارت خانہ کی ایک تقریب میں پہلی بار ملاقات ہوئی اور کسی نے اس کا تعارف "پیروجا" کہہ کر ان سے کرایا تو انھوں نے شرارت سے کہا تھا "لیکن آپ کا نام نرگس ہونا چاہئے تھا۔"

"اوہ ـــــ نرگیش؟ نرگیش تو میری آنٹی کا نام ہے"۔

"لاحول ولاقوۃ ـــــ !" خورشید نے ایسی بے تکلفی سے کہا تھا جیسے اسے ہمیشہ سے جانتے ہوں ـــــ "نرگیش، کھورشیٹ، پیردجا۔ آپ لوگوں نے حسین ایرانی ناموں کی کیا ریڑھ ماری ہے۔ میں آپ کو فیروزہ پکاروں تو کوئی اعتراض ہے ؟" ـــــ "ہرگز نہیں" پیروجا نے ہنس کر جواب دیا تھا ـــــ اور پھر ایک بار خورشید عالم نے دریا کے کنارے ٹہلتے ہوئے اس سے کہا تھا "یہ تمھاری بہادر آنکھیں ـــــ ہفت زبان آنکھیں، جگنو ایسی، شہاب ثاقب ایسی ہیرے جواہرات ایسی، روشن دھوپ اور جھلملاتی بارش ایسی۔ نرگس کے پھول جو تمھاری آنکھوں میں تبدیل ہو گئے۔"

"میں نے پوچھا کیا نام ہے ان صاحب کا ؟" الماس کی تیکھی آواز پر وہ چونکی۔

"کھورشیٹ عالم" ۔ اس نے جواب دیا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد اس نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں۔ سیاہ ساری میں ملبوس، کمر پر ہاتھ رکھے سیاہ اونٹ کی طرح اس کے سامنے کھڑی الماس اس سے کہہ رہی تھی "کیسا عجیب اتفاق ہے پیردجا ڈیر ! میرے منگیتر کا نام بھی خورشید عالم ہے، وہ بھی وائلن بجاتے ہیں وہ بھی پیرس سے آئے ہیں اور ان دنوں اپنے والد سے ملنے وطن گئے ہوئے ہیں۔"

اگست کے آسمان پر زور سے بجلی چمکی۔ مگر کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ کڑکتی ہوئی بجلی آن کر پیردجا دستور پر گر گئی وہ کچھ دیر تک ساکت بیٹھی رہی، پھر اس نے اس عالی شان محل پر نظر ڈالی اور اپنے تاردیو کے تاریک فلیٹ کا تصور کیا۔ بجلی پھر چمکی اور مالا بار ہل کے اس منظر کو روشن کر گئی۔ چشم زدن میں ساری بات پیردجا کی سمجھ میں آ گئی، اور یہ بھی کہ اپنے خطوں میں خورشید عالم نے اس کا ذکر کیوں نہیں کیا تھا، اور کچھ عرصہ سے شادی کے تذکرہ کو وہ اپنے خطوں میں کس وجہ سے ٹال رہے تھے۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور اس نے آہستہ سے کہا "اچھا بھئی الماس، منگنی مبارک ہو۔ خدا حافظ۔"

"جا رہی ہو پیردجا ؟ ٹھہرو، میری کار تم کو پہنچا آئے گی ـــــ ڈرائیور !" الماس

نے سکون کے ساتھ آواز دی۔

"نہیں الماس —— شکریہ"۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی پھاٹک سے نکلی۔ سڑک کی دوسری طرف اسی وقت بس آن کر رکی تھی، وہ تیزی سے سڑک پار کر کے بس میں سوار ہو گئی۔

فوارے کے پاس کھڑی الماس پھاٹک کی طرف دیکھتی رہی۔ بارش کی زبردست بوچھار نے پام کے درختوں کو جھکا جھکا دیا۔ وہ جلدی سے قدم اٹھاتی کیچڑ سے بچتی برساتی کے اندر چلی گئی۔

اس واقعے کے تیسرے روز خورشید عالم کا خط الماس کے والد کے نام آیا۔ جس میں انھوں نے اپنے ابا میاں کی شدید علالت کی وجہ سے رخصت کی معیاد بڑھانے کی درخواست کی تھی۔ انھوں نے الماس کے والد کو یہ نہیں لکھا کہ، اس خبر سے کہ ان کا اکلوتا لڑکا کسی مسلمان رئیس زادی کے بجائے ایک غریب پارسن سے شادی کر رہا ہے ان کے کٹر مذہبی ابا جان صدمے سے جاں بلب ہو چکے ہیں۔ خورشید عالم کے خط سے ظاہر تھا کہ وہ بے حد پریشان ہیں۔ جواب میں الماس نے خود انھیں لکھا۔

"آپ جتنے دن چاہیں وہاں رہئے۔ ڈیڈی آپ کو غیر تو نہیں سمجھتے۔ ہم سب آپ کی پریشانی میں شریک ہیں۔ آپ ابا میاں کو علاج کے لئے یہاں کیوں نہیں لے آتے۔

"برسبیل تذکرہ —— کل میں سوئمنگ کے لئے سن اینڈ سینڈ گئی تھی۔ وہاں ایک بڑی دلچسپ پارسن مس پیرو جا دستور سے ملاقات ہوئی جو پیانو بجاتی ہے اور پیرس سے آئی ہے، اور شاید کسی امریکن کی گرل فرینڈ ہے اور شاید اسی کے ساتھ سن اینڈ سینڈ میں ٹھہری ہوئی ہے۔ میں نے آپ کو اس لئے لکھا کہ غالباً آپ بھی اس سے کبھی ملے ہوں پیرس میں۔

"اچھا اب آپ ابا میاں کو لے کر آجائیے، تار دے دیجئے تاکہ یہاں بریچ کینڈی ہسپتال میں ان کے لئے کمرہ ریزرو کر لیا جائے۔

آپ کی مخلص الماس

○

شام پڑے تار دیو کی ایک خستہ حال عمارت کے سامنے ٹیکسی آن کر رکی اور خورشید عالم باہر اترے۔ جیب سے نوٹ بک نکال کر انھوں نے پتے پر نظر ڈالی اور عمارت کے لب سڑک برآمدے کی دھنسی ہوئی سیڑھی پر قدم رکھا۔ سامنے ایک دروازے کی چوکھٹ پر چونے سے جو "چوک" صبح بنایا گیا تھا وہ اب تک موجود تھا۔ اندر نیم تاریک کمرے کے سرے پر کھڑکی میں ایک بوڑھا پارسی صدرا اور میلی سفید پتلون پہنے، سر پر گول ٹوپی اوڑھے، کمر میں بندھی "کستی" کھول کر اس میں گرہیں لگاتے ہوئے زیر لب دعائیں پڑھ رہا تھا۔ ایک طرف میلی سی آرام کرسی پڑی تھی۔ وسطی میز پر رنگین موم جامہ بچھا تھا۔ دیوار پر زرتشت کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ کمرے میں ناریل اور مچھلی کی تیز باس امنڈ رہی تھی۔ ایک بوڑھی پارسن سرخ جارجٹ کی ساری پہنے، سر پر رومال باندھے منڈیا ہلاتی اندر سے نکلی۔

"مس دستور ہیں؟"

"پیر دجا؟" پارسن نے دھندلی آنکھوں سے خورشید عالم کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "جو ہو گئی ——— سن اینڈ سینڈ۔"

"کیا؟ کیا مس دستور سن اینڈ سینڈ میں منتقل ہو گئی ہیں؟"

بہری پٹ ضعیفہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

"کس کے ——— کس کے ساتھ؟" خورشید عالم نے ہکلا کر پوچھا۔

بوڑھی غڑاپ سے اندر گئی اور ایک وزٹنگ کارڈ لا کر خورشید عالم کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ کارڈ پر کسی امریکن کا نام درج تھا۔

"تم مسٹر کھورشیٹ عالم ہو؟ پیر دجا نے کہا تھا کہ تم آنے والے ہو۔ اگر اسے ڈھونڈھتے ہوئے یہاں آؤ تو میں فوراً اس کو جوہو فون کر دوں۔ اور تم کو یہ نہ بتاؤں کہ وہ کہاں گئی ہے!" اس نے بلاؤز کی جیب سے پچیس پیسے نکالے۔

خورشید عالم نے ہکا بکا ہو کر بوڑھی کو دیکھا۔

"آپ کو اس صورتِ حال پر کوئی اعتراض نہیں ؟"

بھری بھنڈ ضعیف نے نفی میں سر ہلایا "ہم بہت غریب لوگ ہیں مگر اب پیروجا کو ایک امریکن ـ"

دفعتاً مسز دستور کو یاد آیا کہ انھوں نے مہمان کو اندر ہی نہیں بلایا ہے، اور انھوں نے پیٹھ جھکا کر کہا "آؤ ــــ اندر آجاؤ"۔

خورشید عالم مبہوت کھڑے رہے پھر تیزی سے پلٹ کر ٹیکسی میں جا بیٹھے۔

"بائی بائی"۔ ضعیف نے ہاتھ ہلایا۔

بوڑھا پارسی دعا ختم کر کے باہر لپکا، مگر ٹیکسی زن سے آگے جا چکی تھی۔

○

جس روز الماس اور خورشید عالم کی منگنی کی دعوت تھی ایسی ٹوٹ کے بارش ہوئی کہ جل تھل ایک ہو گئے۔ ڈنر سے ذرا پہلے بارش تھمی اور الماس کے والد کے دوست ڈاکٹر صدیقی جو حال ہی میں تبدیل ہو کر بمبئی آئے تھے، بالکنی میں جا کھڑے ہوئے جس سے کچھ فاصلے پر برجِ خموشاں کا اندھیرا جنگل بھیگی ہوئی ہوا میں سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اندر ڈرائنگ روم میں مہمانوں کے قہقہے گونج رہے تھے اور گرینڈ پیانو پر رکھے ہوئے نقرئی شمعدان میں موم بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ بڑا سخت رومینٹک اور پر کیف وقت تھا۔ اتنے میں گیلری میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ایک ملازم نے اندر آ کر الماس سے کہا "خورشید صاحب کے لئے فون آیا ہے"۔ دلہن بنی ہوئی الماس لپک کر فون پر پہنچی۔ ایک مقامی ہسپتال سے ایک نرس پریشان آواز میں دریافت کر رہی تھی ــــ "کیا مسٹر عالم وہاں موجود ہیں ؟"

"آپ بتائیے آپ کو مسٹر عالم سے کیا کام ہے ؟" الماس نے درشتی سے پوچھا۔

"مس پیروجا دستور ایک مہینے سے یہاں سخت بیمار پڑی ہیں۔ آج ان کی حالت زیادہ نازک سے زیادہ نازک ہو گئی ہے۔ انھوں نے کہلوایا ہے کہ اگر چند منٹ کے لئے مسٹر عالم یہاں آسکیں"۔

"مسٹر عالم یہاں نہیں ہیں"۔

"آر یو شیور؟"

"یس آئی ایم ویری شیور"۔ الماس نے گرج کر جواب دیا۔ "کیا آپ سمجھتی ہیں میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔ اور ذرا سراسیمگی سے مہمانوں میں آشامل ہوئی۔

دو گھنٹے بعد پھر فون آیا۔

"ڈاکٹر صدیقی آپ کی کال"۔ گیلری میں سے کسی نے آواز دی۔ "آپ کو فوراً ہسپتال بلایا گیا ہے"۔

ڈاکٹر صدیقی جلدی سے ٹیلیفون پر گئے۔ پھر انھوں نے الماس کو آواز دی۔ "بھئی معاف کرنا۔ مجھے بھاگنا پڑ رہا ہے"۔

الماس دروازے تک آئی۔ "کل آئیے گا۔ ہم لوگ ویک اینڈ کے لئے پونا جا رہے ہیں"۔

"ضرور —— ضرور —— گڈ نائٹ"۔ ڈاکٹر صدیقی نے کہا اور باہر نکل گئے۔

○

بریچ کینڈی ہسپتال میں صحت یاب ہو کر خورشید عالم کے ابا میاں خوش خوش پرتاپ گڑھ واپس جا چکے تھے۔ جب تک کمبالاہل والا فلیٹ تیار نہیں ہوا جو دلہن کو جہیز میں ملا تھا، شادی کے بعد دولہا میاں سسرال ہی میں رہے۔ اکثر وہ صبح کو دفتر جانے سے قبل بالکنی میں جا کھڑے ہوتے۔ نیچے پہاڑی کے گھنے باغ سے گذرتی بل کھاتی سڑک برج خموشاں کی طرف جاتی تھی۔ وقتاً فوقتاً سفید براق کپڑوں میں ملبوس پارسی "نسیار" سفید رومالوں کے ذریعہ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے قطار بنائے جنازہ اٹھائے دور پہاڑی پر چڑھتے نظر آتے۔ کوّے اور گدھ درختوں پر منتظر بیٹھے رہتے برج خموشاں کے احاطے کا پھاٹک دور کیمپس کارنر پر کھلتا تھا۔ پھاٹک پر ایک جھاڑ جھنکاڑ داڑھی والا خوفناک بوڑھا پھونس پارسی دربان ساکت بیٹھا رہتا۔ سفید ساریوں اور سفید دگلوں میں ملبوس سوگوار پارسی "میت چڑھانے" کے بعد سرسبز پہاڑی سے اتر کر اپنی اپنی موٹروں میں بیٹھ جاتے۔ پھاٹک کے باہر زندگی کا

پرجوش سمندر اسی طرح ٹھاٹیں مارتا رہتا۔ مقابل کی عمارت پر ایر انڈیا کے "مہاراجہ" کا اشتہار نت نئے پرلطف انداز میں ان زندہ انسانوں کو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ایک سے ایک دلچسپ شہروں تک سفر کرنے کی دعوت دینے میں مصروف رہتا۔

"اس" نے ایک بار خط میں لکھا تھا ــــــ "ذہن کی ہزاروں آنکھیں ہیں۔ دل کی آنکھ صرف ایک ہے۔ لیکن جب محبت ختم ہو جائے تو ساری زندگی ختم ہو جاتی ہے"۔

سمندر کی موج پل کی پل میں فنا ہو گئی۔ آسمان پر سے گزرنے والے بادل فضا میں تحلیل ہو چکے۔ جب وہ مری ہوگی تو کوؤں اور گدھوں نے اس کا کس طرح سواگت کیا ہوگا؟ اس طوفانی رات ہسپتال کے وارڈ سے نکل کر اس کی روح جب آسمانوں پر پہنچی ہوگی اور عالم بالا کے گھپ اندھیرے میں کسی دوسری روح نے اس سے ٹکرا کر پوچھا ہوگا "تم کون ہو؟" تو اس جواب دیا ہوگا "پتہ نہیں ــــــ میں ابھی تو مری ہوں"۔

اب تک اس کی روح کہاں سے کہاں نکل گئی ہوگی ــــــ مرے ہوئے انسان زیادہ تیزی سے سفر کرتے ہیں۔

○

تارا بائی اپنی روشن آنکھوں سے صاحب کے گھر کی ہر چیز کو ارمان اور حیرت سے دیکھتی ہے۔ وہ صاحب کو حیرت سے تکا کرتی ہے۔ الماس بیگم اب امید سے ہیں۔ بہت جلد تارا بائی کا کام دوگنا ہو جائے گا۔

آج صبح صبح آئی اسپشلسٹ ڈاکٹر صدیقی آئے تھے۔ جب تارا بائی چائے لے کر برآمدے میں گئی تو وہ چونک پڑے اور خوشی سے پوچھا "ارے تارا دئی ــــــ تم یہاں کام کر رہی ہو؟"

"جی داگدر صاحب"۔ تارا بائی نے شرما کر جواب دیا۔

"اب صاف سجھائی دیتا ہے؟"

"جی داگدر صاحب ــــــ اب سب کچھ صاف سجھائی دیت ہے"۔

"گڈ ـــــ" پھر وہ مسٹر دمسز خورشید عالم سے مخاطب ہوئے۔ "بھئی یہ لڑکی دس سال کی عمر میں اندھی ہو گئی تھی مگر خوش قسمتی سے اس کا اندھا پن عارضی ثابت ہوا تمھیں یاد ہے الماس! تمھاری انگیجمنٹ پارٹی کی رات مجھے ہسپتال بھاگنا پڑا تھا؟ وہاں ایک خاتون مس پیر وجا دستور کا انتقال ہو گیا تھا۔ انھوں نے مرنے سے چند روز قبل اپنی آنکھیں آئی بنک کو ڈونیٹ کرنے کی وصیت کی تھی۔ لہٰذا ان کے مرتے ہی مجھے فوراً بلایا گیا کہ ان کی آنکھوں کے ڈیلے نکال لوں۔ بے حد نرگسی آنکھیں تھیں بے چاری کی۔ جانے کون تھی غریب، ایک بھری بھنڈ پارسن پلنگ کے سرہانے کھڑی بُری طرح روئے جا رہی تھی۔ بڑا المناک منظر تھا۔ خیر تو چند روز بعد اس تارا دئی کا ماموں اسے میرے پاس لایا۔ اسے کسی ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ نیا کورینا لگانے سے اس بچی کی بینائی واپس آسکتی ہے، میں نے وہی مس دستور کی آنکھیں ذخیرے میں سے نکال کر ان کا کورینا اس لڑکی کی آنکھوں پر گرافٹ کر دیا۔ دیکھو کیسی تارا ایسی آنکھیں ہو گئیں اس کی۔ واقعی میڈیکل سائنس آج کل معجزے دکھا رہا ہے۔"

ڈاکٹر صدیقی نے بات ختم کر کے اطمینان سے سگریٹ جلا لیا ہے۔ مگر الماس بیگم کا چہرہ بھیانک ہو گیا ہے۔ خورشید عالم لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کر جیسے اندھوں کی طرح ہوا میں کچھ ٹٹولتے ٹٹولتے اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں۔ تارا بائی ان کی یہ کیفیت دیکھ کر بھاگی بھاگی اندر جاتی ہے تو صاحب پلٹ کر باؤلوں کی طرح اسے تکنے لگتے ہیں۔ تارا بائی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ وہ بوکھلائی ہوئی باورچی خانے میں جا کر برتن دھونے میں مصروف ہو جاتی ہے۔

دور برج خموشاں پر گدھ اور کوّے منڈلا رہے ہے اسی طرح منڈلا رہے ہیں۔

کاگا سب تن کھائیو چُن چُن کھائیو ماس،
دو دئی نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس

دو سیّاح

ستمبر ۱۹۶۵ء کے دوسرے ہفتے میں ایک روز صبح آگرے کے ایک مغربی ہوٹل میں بریک فاسٹ کی سُریلی گھنٹی بج چکی تھی اور چند یوروپین اور امریکن سیاح برآمدے میں اور گھاس پر بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ ایک سفید رنگ کی رولز رائس پھاٹک میں داخل ہوکر برآمدے کے سامنے رکی۔ سفید براق وردی میں جھلملاتے گورے چٹے شوفر نے جس کی پلکیں اور بال بادلوں کی طرح روپہلے تھے، اتر کر پچھلا دروازہ کھولا۔ سرمئی رنگ کے سوٹ میں ملبوس ایک وجیہہ گیہواں رنگت، سفید مونچھوں، پرسکون چہرے اور مضبوط ڈیل ڈول والا پچپن سالہ شخص اور ہرے رنگ کے سلیکس اور سفید سوئٹر پہنے ایک شان دار عورت جو چہرے مہرے سے برطانوی معلوم ہوتی تھی، کار سے برآمد ہوئے۔ مرد کے داہنے ہاتھ کی انگوٹھی کا بہت بڑا ہیرا دھوپ میں بجلی کے کوندے کی طرح چمکا۔ باریک بھوؤں، لپ اسٹک سے عاری پتلے پتلے ہونٹوں اور سنہرے بالوں والی عورت بھی چالیس پنتالیس کے پیٹے میں تھی۔ دوسرے سیاحوں نے رولز کو چونک کر دیکھا ان دو شان دار نو واردوں پر نظر ڈالی، اور اپنے اپنے اخباروں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان دونوں کے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے کے کاؤنٹر کی طرف بڑھے۔ مرد کے بائیں پاؤں کے خفیف سے لنگ کے باوجود اس کی چال میں شاہانہ دبدبہ تھا۔ عورت بھی بے حد

باوقار تھی۔

"گڈ مارننگ سر ـــــ میڈیم۔" ریسپشن کلرک نے مسکرا کر کہا "ویلکم ٹو آگرہ ـــــ"

مرد نے جواباً سر کو خفیف سی جنبش دی۔ کلرک نے رجسٹر کا ورق پلٹتے ہوئے دریافت کیا، "ڈبل روم سر؟"

"دو سنگل روم۔" مرد نے تمکنت سے جواب دیا۔ کلرک نے قلم پیش کیا۔ مرد نے ہلکی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ قلم پکڑا اور رجسٹر پر اس طرح نظر ڈالی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اپنی انگریز ساتھی کے ہمراہ ذرا مشکوک حالات میں یہاں آیا ہے۔ اور شاید قلم سنبھالنے کی اسے عادت بھی نہیں ہے۔ گھاگ اور تجربہ کار کلرک نے آہستہ سے کھانس کر کہا ـــــ "آپ کا پاسپورٹ نمبر سر؟"

"پاسپورٹ؟" مرد نے دفعتاً غصے اور حیرت سے دہرایا۔ اب عورت نے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی۔ قلم اس کے ہاتھ سے لیا اور ذرا سوچتے ہوئے رجسٹر میں لکھا:

شری ایم۔ اے۔ مرزا، قومیت: ہندوستانی۔

مس ای۔ ہنری، قومیت: برطانوی۔

"آپ کا پاسپورٹ نمبر اور پورا پتہ میڈیم ـــــ؟" کلرک نے استفسار کیا۔

"پاسپورٹ اور پتہ؟ میں ـــــ میں اپنا پاسپورٹ ـــــ دلی بھول آئی ہوں۔" عورت نے ذرا گھبرا کر مگر فوراً بڑی گمبھیرتا سے جواب دیا۔

"سوری میڈیم ـــــ یہ ہوٹل کا قانون ہے۔ دوسرے یہ کہ آج کل انڈو پاک جنگ کی وجہ سے ہمیں زیادہ احتیاط برتنی پڑ رہی ہے ـــــ" کلرک نے کہا۔

"میں نئی دلی برطانوی ہائی کمیشن کو فون کر کے آپ کے متعلق چیک کر لوں ـــــ معاف کیجئے گا میڈیم ـــــ یہ محض رسمی خانہ پری ہے۔"

"برطانوی ہائی کمیشن؟ ہرگز نہیں ـــــ" عورت نے بڑے پرشکوہ انداز میں غصے اور جھنجلاہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ کلرک اب اس نووارد، شان دار جوڑے کو باقاعدہ شک بھری

نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

مرد نے اب اپنی ساتھی کی مدد کرنا چاہی اور ذرا ملائمت سے کہا "ہم یہاں رات کو قیام نہیں کریں گے۔"

کلرک نے مرد پر نظر ڈالی جو اپنے داہنے شانے کی طرف سر کو عادتاً خم کیے ذرا اکتایا ہوا سا کھڑا تھا۔ اس کی بارعب اور دل نشیں شخصیت سے یک لخت بھونچکا سا ہو کر کلرک نے جلدی سے کہا "بہت اچھا۔ میں منیجر سے بات کرتا ہوں۔" اور کمروں کی کنجیاں مہمانوں کو پیش کرتے ہوئے بیرے کو آواز دی "عبدالشکور۔"

عبدالشکور کی قیادت میں مہمان کمروں کی طرف بڑھنے لگے تو عورت راستے میں ہندوستانی مصنوعات اور ساریوں کی دوکان کے سامنے ٹھٹھک گئی۔

"سوئیٹ چیزس! ہاؤ بیوٹی فل! نہ جانے اس نیلے ریشم کی قیمت کیا ہوگی ——" اس نے ایک کپڑے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مرد کو حیرت سے مخاطب کیا۔

"....کل ہمارے مجاہدوں نے بھارت کے ——" دوکان کے ریڈیو میں سے آواز آئی۔

"ہمارے جوانوں نے کل سیالکوٹ سیکٹر.... ایک ٹرانزسسٹر میں سے آواز آئی۔

"آج لڑائی زوروں پر ہے صاحب —— آگرے پر بھی بمباری کا خطرہ ہے ——" دوکان دار نے کہا۔ "آگرے پر بمباری ——" مہمان نے دہرایا۔ وہ اور اس کی برطانوی رفیق سفر آہستہ آہستہ چلتے لاؤنج میں جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

مرد باہر باغ کے درختوں پر منڈلاتی زرد تتلیوں کو دیکھتا رہا۔ عورت نے دیوار پر آئینے کے سامنے جا کر بڑی احتیاط سے لپ اسٹک لگائی۔

"صاحب —— تاج جانے کے لئے کوئی چھوکرا ساتھ کردوں؟" عبدالشکور بیرے نے آکر دریافت کیا۔

"نہیں ——" مرد نے چونک کر، اور بیرے پر نظر ڈال کر نرمی سے جواب دیا۔ "ہم آگرے

کے راستوں سے واقف ہیں۔"

"آپ کے سانولے رنگ کے باوجود آپ کے ہم وطن نہ جانے کیوں آپ کو غیر ملکی سمجھنے پر مصر ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ ہیں آپ غیر ملکی ہی۔ پکّا ہندوستانی بننے کی کوشش تو ضرور کی آپ نے، مگر ناکام رہے!" عورت نے مسکرا کر کہا اور میز پر سے لندن کا تازہ "ابزرور" اٹھا لیا۔

"ہندو انڈیا اور مسلم پاکستان میں مذہبی جنگ" اس نے اخبار کی ایک سرخی پڑھ کر سنائی۔

"تشریف لایئے، تاج محل دیکھ آئیں"، مرد نے سکون سے کہا۔

"ذرا ٹھیریئے۔ میں ہاتھ منھ دھولوں ــــ آپ کے پیارے ہندوستان کی خاک دھول ــــ!" وہ سر اٹھائے، وقار کے ساتھ چلتی ہوئی اپنے کمرے کی سمت روانہ ہوگئی۔

○

رولز تاج کے سامنے جا کر رکی۔ وہ دونوں کار سے اترے۔ امریکن سیاحوں کی ٹولیاں اور ہندوستانیوں کے گروہ ــــ نائیلون کی ساریاں اور شوخ رنگوں کی شلواریں پہنے، نئے متوسط طبقے کی عورتیں اسکول کی لڑکیاں، کالج کی طلبا، جنتا کے عام افراد، جوق در جوق اندر جا رہے تھے۔ ایک درخت کے نیچے ایک کانسٹبل ایک مسکین سے، پھٹے ہوئے سیاہ سوٹ اور بو ٹائی والے فوٹوگرافر کو پھٹکارنے میں مصروف تھا۔ ایک گائیڈ نے رولز رائیس سے اترنے والوں کا تعاقب کیا ــــ "گائیڈ میڈیم تاج محل بلٹ بائی شاہ جہاں۔ گریٹ لو اسٹوری۔"

"بھاگ جاؤ ــــ" انگریز عورت نے غصے سے پیر پٹخا۔

گائیڈ نے حیرت سے نک چڑھی میم صاحب پر نظر ڈالی۔ "چلے آتے ہیں تھُرڈ لے ــــ کنجوس۔" وہ بڑبڑاتا ہوا آگے چلا گیا۔

سرمئی سوٹ والا شخص عالم حیرت میں کھویا تاج محل اور اس کے پیش منظر کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اور اس کی ساتھی چبوترے پرے گذر کر جمنا کے رخ ایک منڈیر پر ٹک گئے۔

ان سے کچھ فاصلے پر تین چار صحافی زور زور سے تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔

"یہ ہے نیا سماجی انقلاب ـــــ" ان میں سے ایک کہہ رہا تھا "آج سے دس سال قبل عوام کی اتنی بڑی تعداد کے پاس پہننے کے لئے ریشمی کپڑے نہیں تھے، اتنے بچے اسکول نہیں جاتے تھے، دیہاتیوں کے پاس اتنی سائیکلیں نہیں تھیں۔"

"جی ہاں ـــــ لیکن آپ بھولتے ہیں کہ آج ہر تیسری چپاتی جو ہر ہندوستانی کھا رہا ہے امریکن گیہوں کی ہے ـــــ" دوسرے نے کہا۔

"نہرو کو صرف خواب دیکھنے آتے تھے ـــــ" تیسرے نے کہا۔

"..... تاج یقیناً ہندو محل ہے۔ اب وقت آگیا ہے ہمیں ہندوستان کی تاریخ از سر نو لکھنا چاہیے۔" ایک یونیورسٹی کا طالب علم اپنے ہم جماعت سے بات کرتا ہوا پاس سے گذرا۔

"ارے بھائی شیخ صاحب! وہ آپ کے دوست شرما جی تو بڑے سخت جن سنگھی نکلے، مجھ سے بحث کر رہے تھے چنیں و چناں ـــــ میں بھی پرانا مسلم لیگی۔ میں نے جواب دیا، حضرت، ایک بڑا بادشاہ تو آپ لوگوں نے پیدا نہیں کیا۔ اشوک بودھ تھا۔ چندر گپت موریہ جین تھا۔ اکبر مسلمان تھا ـــــ قائل ہو گئے! کیوں شیخ صاحب ـــــ کیسی رہی؟" مینار کی دوسری طرف ایک صاحب اپنے دوست سے کہہ رہے تھے۔

"ہاں بھئی، مسلمان کی بھی کیا شان ہے۔" دوست نے جواب دیا۔

سرمئی سوٹ اور سفید مونچھوں والے شخص کی ساتھی ہونٹ پچکا کر مسکرائی۔ اور پوچھا "شام کو پھر یہاں آئیں گے نا؟ میں تاج کو چاندنی میں بھی دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"حد ہے۔" اس کے ساتھی نے نرمی اور اداسی سے مسکرا کر کہا۔ "اپنے جاں نثاروں کو قتل کرتے رہنے کی بجائے آپ کو چاہیے تھا کہ ان میں سے ایک سے شادی کر لیتیں۔"

"شادی؛ ہاہا ——" انگریز عورت نے ہونٹ بچکا کر کہا۔

"آپ جیسی پریشان کن بیبیوں کو ہمارے یہاں کوار کوٹلے میں بند کر دیا جاتا تھا!"

"اب قلعہ؛" عورت نے گائیڈ بک کھولتے ہوئے کہا۔

O

وہ دونوں ثمن برج میں بیٹھے تھے۔ قلعہ میں بھی غیر ملکی اور ہندوستانی سیاحوں کا میلہ سا لگا تھا۔ دور جمنا کے گھاٹ پر دھوبنیں کپڑے دھو رہی تھیں۔ ستمبر کی دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"جھروکہ درشن —— دیوان عام —— بیگمات —— مینا بازار —— کنیزیں —— منصب دار —— خواجہ سرا —— جو کچھ رالف نے یہاں سے جا کر مجھے بتایا تھا، آنکھیں بند کر لوں تو سب سامنے آ جاتا ہے ——" عورت نے آہستہ سے کہا، "وہ سامنے سنگی تخت پر شاہ جہاں بیٹھا کرتا تھا؟"

"سامنے مہتابی پر؟ نہیں —— وہ خرم کا نہیں، سلیم —— سلیم کا تخت ہے۔" مرد نے چونک کر جواب۔

برابر کی برجی میں دو انگریز اور دو امریکن آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"..... ہندوستانیوں کی مجموعی نااہلی دیکھ کر مجھے اس مغربی نظریہ پر یقین آ گیا ہے کہ تاج ایک اطالوی معمار نے بنایا تھا۔" انگریزی کی آواز آئی۔ انگریز عورت ذرا خجل سی نظر آئی۔

وہ دونوں نیچے اترے۔ نچلی منزل میں چگی ڈاڑھی والا ایک گائیڈ غسل خانے کے دروازے میں کھڑا ایک ہندوستانی جوڑے کو بتا رہا تھا —— "یہ دیکھئے —— یہ کمرہ

"مغل اعظم" کے نمونے پر ــــ میرا مطلب ہے "مغل اعظم" کا شیش محل اس کمرے کے نمونے بنایا گیا تھا ــــ"

سرمئی سوٹ والے نے اچانک ایک تلخ قہقہہ لگایا وہ دونوں قلعہ کا طویل عرض طے کر کے پھاٹک پر پہنچے۔

"کوک، میڈیم؟" چائے اور شربت، اسٹال والے نے سوال کیا۔ وہ دونوں تھکے ہارے ٹین کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

چند فرنچ سیاح برابر کی کرسیوں پر ستا رہے تھے۔ ایک گائیڈ ان کے سامنے کھڑا بے تکان بولے جا رہا تھا ــــ "انڈیا کے دو پیریڈ ہیں ــــ سر ــــ ہندو پیریڈ، اینڈ مسلم پیریڈ۔ ہندو پیریڈ کا گریٹ رولر ہے اشوک دی گریٹ۔ مسلم پیریڈ میں چھ کنگ ہوئے بابر دی فاؤنڈر آف دی مغل امپائر، ہمایوں، اکبر دی گریٹ، جہانگیر دی ڈرنکر (DRUNKARD) شاہ جہاں دی بلڈر (BUILDER) اور اورنگ زیب دی فناٹک (FANATIC) اورنگ زیب کے بعد دی اینڈ ہو گیا۔"

سرمئی سوٹ والا شخص سر پیچھے ڈالے آسمان کو تکتا رہا۔ اسٹال کا لڑکا کوکا کولا کی دو بوتلیں لے کر آیا۔ سرمئی سوٹ والا شخص اور اس کی ساتھی اسی طرح بیٹھے رہے۔

"صاحب ــــ کوکا کولا ــــ میم صاحب ــــ"

دونوں نے ذرا ناچاری سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر عورت نے کن انکھیوں سے برابر بیٹھی ہوئی فرنچ لڑکی پر نظر ڈالی جو تیلی کے ذریعے کوکا کولا پینے میں مشغول تھی۔ عورت نے آنکھوں آنکھوں میں اپنے ساتھی کو اشارہ کیا دونوں بڑی نفاست کے ساتھ کوکا کولا پینے میں مصروف ہو گئے۔

اب زوال کا وقت تھا۔ بوتلیں زمین پر رکھ کر وہ دونوں اٹھے۔ مرد نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک نوٹ نکالا اور بوائے کی پلیٹ میں رکھ دیا۔ وہ سَو کا نوٹ تھا۔ پل بھر

میں اس کے چاروں طرف بھیڑ لگ گئی ـــــ بھکاری، گائیڈ، آوارہ لونڈے، بے کار نوجوان چیتھڑوں میں لپٹے بچے۔

"بخشیش بخشیش ـــــ راجہ صاحب ـــــ نواب صاحب حضور ـــــ اللہ بھلا کرے ـــــ بھگوان بھلی کریں ـــــ"

ایک امریکن سیاح نے جلدی سے کیمرہ فوکس کر کے اس منظر کی تصویر کھینچی۔

"بخشیش ـــــ بخشیش ـــــ بخشیش ـــــ" کورس بلند ہوا۔ سرمئی سوٹ والے شخص نے گھبرا کر اپنی جیبوں میں دوبارہ ہاتھ ڈالا لیکن نوٹ کے بجائے مٹھی بھر سکے نکل آئے اس نے سکوں کو غور سے دیکھا اور سراسیمہ ہو کر اپنی جیب میں واپس ڈال دیا۔ مگر دو سکے اس کی انگلیوں سے پھسل کر زمین پر گر پڑے اور لڑھکتے ہوئے ایک فرانسیسی کی کرسی کے نزدیک جا پہنچے۔ یہ دیکھ کر سرمئی سوٹ والے اور اس کی انگریز ساتھی نے وہاں سے سرپٹ دوڑنا شروع کیا۔ فرانسیسی نے جو صورت شکل سے سوربون کا جغادری پروفیسر معلوم ہوتا تھا جھک کر وہ سکے اٹھا لئے۔ ان کو ایک لمحے کے لئے غور سے دیکھا اور آنکھیں پھیلا کر چلایا "گڈ نس ـــــ یہ تو ـــــ یہ تو ـــــ"

وہ سرمئی سوٹ والے شخص کے پیچھے پیچھے دوڑا مگر اس دوران میں وہ دونوں غائب ہو چکے تھے۔

○

فتح پور سیکری میں سیاحوں کا مجمع نسبتاً کم تھا۔ سنگ سرخ کے محلات ڈھلتی دھوپ میں کسی مطمئن فن کار کے تخیل کی طرح پر سکون نظر آ رہے تھے۔ اکبر کا محل سنسان پڑا تھا۔ اتنے میں دو سائے صحن سے گذر کر وسطی حوض کی جانب بڑھتے نظر آئے۔ سرمئی سوٹ والا مرد اور اس کی ساتھی میم پل پر سے گذر کر سنگی تخت پر بیٹھ گئے۔ مرد ویران آنکھوں سے چاروں طرف کی ویرانی کو دیکھ رہا تھا، اس کا چہرہ سُت گیا تھا اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

رفتہ رفتہ سناٹا گہرا ہو گیا۔ دور کسی کونے میں کوئی آہستہ سُروں میں درباری الاپ رہا تھا۔

"بادشاہ صبح سویرے موسیقی کی آواز پر جاگتا ہے۔ عبادت کرتا ہے۔ اس کے بعد جھروکے میں جا کر رعایا کو درشن دیتا ہے، عورتیں بیمار بچوں کو لے کر آتی ہیں کہ بادشاہ کے درشن سے انھیں شفا ملے۔ دیوان عام میں جلوہ افروز ہونے کے بعد وہ ملکی معاملات میں مصروف ہو جاتا تھا۔ پھر اپنے کمروں میں جا کر بے حد سادہ کھانا نوش کرتا ہے۔ سہ پہر کو قلعہ کی افواج، شاہی اسلحہ فیکٹری اور زیر تعمیر عمارتوں کا معائنہ کرتا ہے۔ میکنیکل ایجادوں میں مصروف رہتا ہے، شام کو چوگان، پچیسی، یا جانوروں کی لڑائی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ رات کو محفل موسیقی آراستہ ہوتی ہے۔ داستانیں چھڑتی ہیں۔ علمی اور ادبی مباحثے ہوتے ہیں۔

"سیکری لندن سے زیادہ پر رونق ہے۔ شاہی تقریبات اور جشن، ہندو اور مسلم تہوار، جلسے اور جلوس، خوش حال متوسط طبقہ، باکمال کاریگر، علما، شعرا، مدارس کے طالب علم، اہل سیف اور تاجر اور منصب دار، سادھو سنت اور صوفیا و فقرا۔۔۔۔ آگرے سے سیکری تک راستے بھر بازار اور دوکانیں تھیں۔ اس سارے ہنگامے اور گہما گہمی میں، ۱۵۸۵ء میں ایک روز تین نخیرا ہم سے انگریز اس خاموشی سے فتح پور پہنچے کہ کسی نے ان کی آمد کا مطلق نوٹس نہ لیا یہ تینوں ولیم لیڈز، رالف فچ اور جان نیوبری، انگلستان کی حکمراں کی طرف سے اس درخواست کا خط لے کر یہاں پہنچے تھے کہ بادشاہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور تجارت کی اجازت مرحمت فرمائے۔ بادشاہ نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ولیم لیڈز کو دربار میں جوہری کا کام مل گیا۔ رالف فچ آٹھ سال بعد لندن واپس لوٹا اور اپنی رپورٹ پیش کی، جس کی بنا پر ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو چارٹر ملا۔"

انگریز عورت نے پڑھتے پڑھتے کتاب بند کر دی، کیونکہ اوپر سے ایک طیارہ گڑگڑاتا ہوا گذر رہا تھا۔ جودھا بائی کے محل میں گھومتے ہوئے سیاحوں میں بھنبھناہٹ سی بلند ہوئی

—— "پاکستانی بمبار —— ؟ پاکستانی بمبار۔

طیارہ زن سے گذر گیا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

اب سلئے طویل ہو رہے تھے۔ محل کی دیواروں کے باہر حکیم کے مکان، شفا خانے مدراس، ٹکسالوں، حماموں اور رانیوں کے محلوں کی غلام گردشیں تاریک ہو چلی تھیں۔ دور اصطبل کی ڈیوڑھی کے باہر ایک بوڑھا ہندو گھڑا اور گلاس لئے صبر کے ساتھ سیاحوں کا منتظر تھا۔ کوئی ہندوستانی سیاح پانی پی کر اسے پانچ یا دس پیسے دیتا تو وہ "اللہ بھلا کرے —— اللہ بھلا کرے" دہرانے لگتا۔

شیخ سلیم چشتی کی درسگاہ کی اونچی فصیل کے پیچھے ایک صحن میں ابوالفضل اور فیضی کے مکان کے برابر برابر خاموش کھڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کے مکین ابھی ابھی گھر خالی کر کے کہیں گئے ہیں۔ فیضی کے مکان کی دیواروں پر سیاحوں نے پنسل سے جو نام لکھے تھے، ان میں صدر دروازے پر "ساجد پہلوان مراد آباد" سب سے جلی حروف میں نظر آرہا تھا۔ ایک آوارہ کتا ابوالفضل کے مکان کے چبوترے سے اترا اور خراماں خراماں چلتا ہوا فیضی کے صدر دالان میں آیا اور پڑ کر سو گیا۔ صحن کی گھاس اور بڑا درخت ہوا میں سرسرایا کئے۔

اکبر کے محل میں چبوترے پر بیٹھے ہوئے سرمئی سوٹ والے شخص نے آزردگی سے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اور اٹھا پنج محل کی آخری منزل پر پہنچ کر عورت نے سحر زدہ سی آواز میں اس سے پوچھا "فتح پور کیوں چھوڑ دیا تھا؟ اس لئے کہ پانی ختم ہو گیا تھا یا شمال مغرب کے مخدوش حالات کی وجہ سے لاہور جا کر رہنا پڑا تھا؟"

مرد نے بے دھیانی سے سر ہلایا دونوں نیچے اترے۔ مرد دیوان خاص کے اندر چلا گیا۔

ایک خستہ حال نوجوان طالب علم "آنکھ مچولی" کی سیڑھیوں پر بیٹھا اپنے ایک دوست سے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا: "ان حجروں اور پھاٹکوں سے نکل کر اس نے سارا ہندوستان فتح کیا۔ سارے ہندوستان کو متحد کیا۔ سولہویں صدی میں اس نے ایک سیکولر قومی ریاست کا

خواب دیکھا، لیکن ــــ اس شاداب، عظیم الشان، دولت مند ملک پر سورج ڈوب کر دور، اس اندھیرے، سرد کہر آلود، غریب جزیرے پر طلوع ہونے والا تھا ــــ کیوں ہارے ہم لوگ؟ ان حجروں اور ایوانوں میں وہ ساری آوازیں گونج رہی ہیں ــــ عرفی، نظیری، بیربل، فیضی، خان خاناں، ٹوڈر مل، مان سنگھ، تان سین، عبدالصمد، فرخ بیگ، مکند، کیشو ــــ حیرت انگیز ــــ۔"

سرمئی سوٹ اور سفید مونچھوں والا شخص دیوان خاص سے باہر نکلا۔ "سورج ڈوب رہا ہے" اس نے اچانک اپنی رفیق سفر سے کہا جو لڑکیوں کے مدرسے کی سیڑھیوں پر کھڑی تھی۔ "جلدی کرو ــــ جلدی ــــ" اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا صحن سے باہر لے گیا۔

دونوں درگاہ کی سیڑھیاں چڑھ کر صحن میں داخل ہوئے، ایک مجاور ان کے پیچھے پیچھے دوڑا ــــ "میم صاحب ــــ میم صاحب ــــ یہ پہن لیجیے ــــ" عورت نے گھبراہٹ میں اپنے جوتے اتار کر دور پھینکے اور ننگے پاؤں چلتی ہوئی اپنے ساتھی کے ہمراہ روضے کی سمت بڑھی، مزار کے سامنے پہنچ کر مرد خشوع و خضوع سے دعا مانگنے میں مصروف ہو گیا۔ چند ہندو عورتیں جالیوں سے لگی منتیں ماننے میں مشغول تھیں۔ ایک ہندو زائر نے دہلیز پر ماتھا ٹیک کر پرنام کیا۔ دور صحن کے ایک کونے میں ایک آدمی جھاڑو دیتے ہوئے ایک عورت سے کہہ رہا تھا "گرو کا دربار ہے اماں۔ کچھ دیتی جاؤ۔" ایک ٹرانزسسٹر پر جنگ کی تازہ ترین خبریں آرہی تھیں۔

سرمئی سوٹ والے شخص نے دعا ختم کی۔ وہ اور اس کی ہم سفر بلند دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ بلند دروازے کے نیچے سارا دیس، ساری دھرتی پھیلی ہوئی تھی۔ تہمد باندھے ہوئے ایک آدمی نے قریب آکر بڑی لجاجت سے کہا "صاحب آٹھ آنے دے دیجیے تو باولی میں کود کر دکھاؤں گا۔"

"روز کتنا کما لیتے ہو؟" سرمئی سوٹ والے نے دکھ سے پوچھا۔

"سرکار ہم چھ آدمی ہیں، جن کا ٹرن آجائے۔ روزانہ صاحب لوگ باؤلی میں کودنے کو کبھی تو نہیں کہتے۔ چار آٹھ آنے مل جاتے ہیں۔" غوطہ خور نے جواب دیا۔

"کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے؟" سرمئی سوٹ والے نے پوچھا۔

"روزگار کہاں ہے صاحب۔" غوطہ خور نے جواب دیا۔ سرمئی سوٹ والے نے بے ساختہ اپنی ہیرے کی انگوٹھی پر نظر ڈالی اور اسے اتارنا چاہا۔ مگر انگریز عورت نے فوراً اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اوپر سے ایک اور جنگی طیارہ گڑگڑاتا ہوا گذرا۔

"اتنے مر گئے اور ابھی اور مریں گے؟" مرد نے اپنے آپ سے پوچھا۔

عورت نے نظر اٹھا کر بلند دروازے کی محراب پہ لکھے ہوئے الفاظ پڑھے ——

"عیسیٰ ابن مریم نے کہا: دنیا ایک پل ہے اس پہ مکان نہ بناؤ۔ دنیا کی مدت محض ایک گھنٹے کی ہے۔ یہ ایک گھنٹہ عبادت میں صرف کرو۔ کیوں کہ اس کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے وہ کسی کو معلوم نہیں۔"

مرد نے بلند دروازے کے سامنے نظر ڈالی۔ نیچے حد نظر تک سارا دیس، ساری دھرتی پھیلی ہوئی تھی۔ کھیت جھونپڑیاں، انسانوں کی آبادی۔ نئی فیکٹریاں۔

"ان جھونپڑوں میں کتنی بھوک بلبلا رہی ہے۔" انگریز عورت نے ناگواری سے کہا "اور سرحد پہ، سرحد کے اس پار، توپیں گرج رہی ہیں۔"

○

آدھی رات کے قریب ہوٹل کے لاؤنج میں انگریز عورت پکچر پوسٹ کارڈوں، بنارسی ساڑیوں اور دوسرے تحفوں کے پیکٹ بنانے میں مصروف تھی۔

"کمال ہے۔ ان سب چیزوں کا کیا کریں گی آپ؟" اس کے ساتھی نے حیرت سے پوچھا۔

"واہ۔ واپسی پر سب پوچھیں گے نہیں کہ ہندوستان سے کیا لائیں، سڈنی، اسپنسر، سیسل فرانسس۔ سب کے سب۔ عورتیں الگ جان کھائیں گی یہ دیکھئے میں نے تو میریؔ تک کے لئے ہاتھی دانت کی کنگھی خریدلی۔ مگر اب یاد آیا کہ بے کار ہے، کیوں کہ میریؔ غریب کا سر ہی نہیں ہے۔"

ہوٹل کے باغ میں مرغ نے بانگ دی۔ وہ دونوں چونک پڑے۔ صوفے سے اٹھے اور خاموشی سے برآمدے میں آگئے۔ جہاں ایک میز پر وزٹرز بک کھلی رکھی تھی۔ مرد ٹھٹھک گیا۔ اس نے رجسٹر پر جھک کر ذرا دقت سے اس نے اپنے دستخط کئے

جلال الدین محمد اکبر ـــــ شہنشاہ ہند

پھر عورت نے قلم اس سے لے کر بڑی روانی سے لکھا ـــــ

ایلزبتھ اوّل ـــــ ملکۂ انگلستان

پورن ماشی کا چاند باغ کے اوپر تیر رہا تھا۔ وہ دونوں برآمدے سے سائے کی طرح اتر کر رولز میں بیٹھے ـــــ برف جیسی وردی اور رُپہلے بادلوں جیسے بالوں اور پلکوں والے شوفر نے انجن اسٹارٹ کیا۔ رولز چند گز آگے بڑھ کر دفعتاً چاندنی میں تحلیل

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے

ٹرین مغربی جرمنی کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی۔ حدِ نظر تک لالہ کے تختے لہلہا رہے تھے۔ دیہات کی شفاف سڑکوں پر سے کاریں زناٹے سے گذرتی جاتی تھیں۔ ندیوں میں بطخیں تیر رہی تھیں۔ ٹرین کے ایک ڈبے میں پانچ مسافر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایک بوڑھا جو کھڑکی سے سر لگائے باہر دیکھ رہا تھا۔ ایک فربہ عورت جو شاید اس کی بیٹی تھی اور اس کی طرف سے بہت فکرمند نظر آتی تھی۔ غالباً وہ بیمار تھا۔ سیٹ کے دوسرے سرے پر ایک خوش شکل طویل القامت شخص، چالیس سال کے لگ بھگ عمر، متبسم پرسکون چہرہ ایک فرنچ کتاب کے مطالعہ میں منہمک تھا۔ مقابل کی کرسی پر ایک نوجوان لڑکی جو وضع قطع سے امریکن معلوم ہوتی تھی، ایک باتصویر رسالے کے ورق گردانی کر رہی تھی اور کبھی کبھی نظریں اٹھا کر سامنے والے پرکشش شخص کو دیکھ لیتی تھی۔ پانچویں مسافر کا چہرہ اخبار سے چھپا تھا۔ اخبار کسی ادق اجنبی زبان میں تھا۔ شاید نارویجین یا ہنگیرین، یا ہو سکتا ہے آئس لینڈک۔ اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آئس لینڈک میں باتیں کرتے ہیں۔ پڑھتے لکھتے اور شعر کہتے ہیں۔ دنیا عجائب سے خالی نہیں۔

امریکن تماں لڑکی نے جو خالص امریکن تجسس سے یہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ کون سی زبان

ہے، اس خوبصورت آدمی کو اخبار پڑھنے والے نوجوان سے باتیں کرتے سنا۔ وہ بھی کسی اجنبی زبان میں بول رہا تھا۔ لیکن وہ زبان ذرا مانوس سی معلوم ہوئی۔ لڑکی نے قیاس کیا کہ یہ شخص ایرانی یا ترک ہے۔ وہ اپنے شہر ٹورانٹو میں چند ایرانی طلبا سے مل چکی تھی۔ چلو یہ تو پتہ چل گیا کہ یہ فیبولس گائے (FABULOUS GUY) پرشین ہے (اس نے انگریزی میں سوچا میں آپ کو اردو میں بتا رہی ہوں کیوں کہ افسانہ بہ زبان اردو ہے)

اچانک بوڑھے نے جو انگریز تھا۔ آہستہ سے کہا۔ "دنیا واقعی خاصی خوبصورت ہے"۔ یہ ایک قطعی برطانوی انڈر اسٹیٹمنٹ تھا۔ لڑکی کو معلوم تھا کہ دنیا بے انتہا خوبصورت ہے۔

بوڑھے کی بیٹی کینیڈین لڑکی کو دیکھ کر خفیف سی اداسی سے مسکرائی۔ باپ کی ٹانگوں پر کمبل پھیلا کر مادرانہ شفقت سے کہا۔ "ڈیڈ۔ اب آرام کرو"۔

اس نے جواب دیا۔ "ایڈنا۔ میں یہ مناظر دیکھنا چاہتا ہوں"۔

اس کی بیٹی نے رسان سے کہا۔ "اچھا اس کے بعد ذرا سو جاؤ"۔

اس کے بعد وہ آکر کینیڈین لڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ گو انگریز تھی مگر شاید اپنا دکھ بانٹنا چاہتی تھی۔

"میرا نام ایڈنا ہنٹ ہے۔ یہ میرے والد ہیں پروفیسر چارلس ہنٹ"۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"تمارا فیلڈنگ ٹورانٹو کینیڈا"۔

"کیمبرج۔ انگلینڈ۔ ڈیڈ وہاں پیٹر ہاؤس میں ریاضی پڑھاتے تھے"۔

"بیمار ہیں؟"

"سرطان۔ اور انھیں بتا دیا گیا ہے"۔ ایڈنا نے سرگوشی میں جواب دیا۔

"اوہ۔ آئی ایم سو سوری"۔ تمارا فیلڈنگ نے کہا۔ خاموشی چھا گئی۔ کسی اجنبی کے

ذاتی الم میں دفعتاً داخل ہو جانے سے بڑی خجالت ہوتی ہے۔

"اگر تم کو یہ معلوم ہو جائے" ایڈنا نے آہستہ آہستہ کہا۔ "کہ یہ دنیا بہت جلد فلاں مدت کے بعد اور ہمیشہ کے لئے چھوڑنی ہے تو جانے کیسا لگتا ہوگا"۔

"اس معاملے میں انسان کو بہت صابر اور فلسفی ہو جانا چاہئے"۔ تمارا نے کہا اور خفیف سی ہنسی۔

"حالانکہ یہ بھی بیکار ہے"۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ جیسے میں اس وقت خود صابر اور فلسفی بننے کی کوشش کر رہی ہوں"۔ تمارا نے کہا۔ ایڈنا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا گو بحیثیت ایک وضعدار انگریز خاتون وہ کسی سے ذاتی سوال کرنا نہ چاہتی تھی۔

اس بے تکلف کینیڈین لڑکی نے بات جاری رکھی۔ "میں جرمنی آنا نہ چاہتی تھی۔ اس ملک سے بہت خوفناک یادیں وابستہ ہیں۔ میری والدہ کے دو ماموں ایک خالہ ان کے بچے۔ سب کے سب۔ میری ممی آج بھی کسی فیکٹری کی چمنی سے دھواں نکلتا دیکھتی ہیں تو منہ پھیر لیتی ہیں"۔

"اوہ"۔

"حالانکہ یہ میری پیدائش سے بہت پہلے کے واقعات ہیں"۔

"اوہ۔ میں تمہارے کرسچین نام سے سمجھی تم روسی نژاد ہو۔ حالانکہ تمہارا خاندانی نام خالص اینگلو سیکسن ہے"۔

"میرے نانا روسی تھے۔ میرے والد کا اصل نام ڈیوڈ گرین برگ تھا۔ کینیڈا جا کر تعصب سے بچنے کے لئے بدل کر فیلڈنگ کر لیا لیکن میں"۔ اس نے ذرا جوش سے کہا۔ "میں اپنے باپ کی طرح بزدل نہیں۔ میں اپنا پورا نام اس طرح لکھتی ہوں۔ تمارا گرین برگ فیلڈنگ"۔

"واقعی"؟ برطانوی خاتون نے کہا۔ "کتنی دلچسپ بات ہے"۔

"اولادِ آدم کا شجرہ بہت گنجلک ہے"۔ تمارا نے غیر ارادی طور پر ذرا اونچی آواز میں کہا۔ کیوں کہ وہ اس وجہ سے ہمیشہ متحیّر رہتی تھی۔

سامنے والے دلکش آدمی نے اس کا فقرہ سنا اور سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔ گویا کہتا ہو "میں تمھاری بات سمجھتا ہوں"۔ لڑکی دل ہی دل میں اس کی مشکور ہوئی اور اسے دیکھ کر خود بھی مسکرائی اب غالباً میں اس اجنبی پر عاشق ہوتی جا رہی ہوں۔

برطانوی خاتون نے بھی یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک جگہ پر دو انسان ایک دوسرے کی طرف کھنچیں تو سمجھ لیجیے کہ اس انڈر کرنٹ کو حاضرین فوراً محسوس کرلیں گے۔ کیوں کہ اولادِ آدم کی باہم کشش کا عجب کھیلا ہے۔

بوڑھا پروفیسر آنکھیں کھول کر پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

○

"میرے نانا ——— جب کریمیا سے بھاگے انقلاب کے وقت تو اپنے ساتھ صرف قرآن لے کر بھاگے تھے"۔ تمارا نے آہستہ سے کہا۔

"کوران ——— ؟" ایڈنا نے تعجب سے دہرایا۔

"ہاں۔ وہ موزلم تھے اور میری نانی ممی کو بتاتی تھیں وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ قرآن میں لکھا ہے دنیا بہت خوبصورت ہے۔ اس میں خوشی سے رہو اور دوسروں کو بھی خوش رہنے دو۔ اور شاید موزلم پروفٹ نے کہا تھا کہ اس سے بہتر دنیا نہیں ہو سکتی"۔ سگریٹ سلگانے کے لئے تمارا نے حسبِ معمول لائٹر کی تلاش میں بیگ کھنگالنا شروع کیا۔ ایرانی نما شخص نے فوراً آگے جھک کر اپنا لائٹر جلایا۔ پھر اجازت چاہ کر تمارا کے پاس بیٹھ گیا۔

ایڈنا ہنٹ دوسری طرف سرک گئی۔ ایرانی نما شخص کھڑکی کے باہر گذرتے ہوئے سہانے منظر دیکھنے میں محو ہو گیا۔ تمارا نے اس سے آہستہ سے کہا۔ "یہ بزرگ سرطان میں مبتلا ہیں۔ جن لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ چند روز بعد دنیا سے جانے والے ہیں انھیں جانے کیسا

لگتا ہوگا۔ یہ خیال کہ ہم بہت جلد معدوم ہو جائیں گے۔ یہ دنیا پھر کبھی نظر نہ آئے گی"۔

ایرانی نما شخص دردمندی سے مسکرایا "جس انسان کو یہ معلوم ہو کہ وہ عنقریب موت کے منہ میں جانے والا ہے۔ وہ سخت دل ہو جاتا ہے"۔

"واقعی؟"

ہم سفر نے اپنا نام بتایا۔ دکتور شریفیان۔ تبریز یونی ورسٹی۔ شعبہ تاریخ۔ کارڈ دیا۔ اس پر نام کے بہت سے نیلے حروف چھپے تھے۔ لڑکی نے بشاشت سے دریافت کیا۔ "این۔ آئی کیو یعنی۔ نو۔ آئی۔ کیو؟"

"نصرت الدین امام قلی"۔

لڑکی نے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ اس نصرت الدین امام قلی سے اس کی پہلی اور آخری ملاقات ہرگز نہیں ہے۔

ایک قصبے کے اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ اخبار پڑھنے والا لڑکا اسی جگہ سرعت سے اتر گیا۔ دکتور شریفیان بھی لپک کر باہر گئے۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔ درخت اور پھول اور گھاس پانی میں جگمگا رہے تھے۔ اکادکا مسافر برساتیاں اوڑھے پلیٹ فارم پر چپ چاپ کھڑے تھے۔ چند لمحوں بعد ایرانی پروفیسر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمپارٹمنٹ میں واپس آیا اس کے ہاتھ میں لالہ کے گلدستے تھے جو اس نے بڑے اخلاق سے جھک کر دونوں خواتین کو پیش کیے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

آدھ گھنٹا گزر گیا۔ بوڑھا سو چکا تھا۔ دوسرے کونے میں اس کی فربہ بیٹی اپنی باہوں پر سر رکھ کر اونگھ رہی تھی۔ دفعتاً ایرانی دکتور نے کینیڈین لڑکی سے کہا۔ "تمارا خانم۔ کہاں تک میرے ساتھ رہو گی؟"

وہ اس سوال کا مطلب سمجھی اور اسے آج تک کسی نے تمارا خانم کہہ کر مخاطب نہ کیا تھا۔ دراصل وہ اپنے گھر اور کالج میں ٹم کہلاتی تھی۔ کہاں نامعقول ٹم! اور کہاں تمارا خانم۔

جیسے سرود بج رہا ہو یا عمر خیام کا مصرع۔ تمارا خانم کی ایران سے واقفیت محض ایڈورڈ فٹز جیرلڈ تک محدود تھی۔ اس نے اسی کیفیت میں کہا۔ "جہاں تک ممکن ہو"۔

بہر حال وہ دونوں ایک ہی جگہ جا رہے تھے۔ تمارا نے ایرانی پروفیسر کے سوٹ کیس پر چپکا ہوا لیبل پڑھ لیا تھا۔

"تم وہاں پڑھنے جا رہی ہو یا سیر کرنے؟"

"پڑھنے۔ بایوکیمسٹری۔ مجھے ایک اسکالرشپ ملا ہے۔ تم ظاہر ہے پڑھانے جا رہے ہو گے"۔

"صرف چند روز کے لئے۔ میری دانش گاہ نے ایک ضروری کام سے بھیجا ہے"۔

ٹرین قرونِ وسطیٰ کے ایک خوابیدہ یونی ورسٹی ٹاؤن میں داخل ہوئی۔

O

دوسرے روز وہ وعدے کے مطابق ایک کیفے ٹیریا میں ملے۔ کاؤنٹر سے کھانا لینے کے بعد ایک دریچے والی میز پر جا بیٹھے دریچے کے عین نیچے خوش منظر ندی بہہ رہی تھی۔ دوسرے کنارے پر ایک کائی آلود گوتھک گرجا کھڑا تھا۔ سیاہ گاؤن پہنے انڈر گریجویٹ ندی کے پل پر سے گذر رہے تھے۔

"بڑا خوبصورت شہر ہے"۔ تمارا نے بے ساختہ کہا۔ حالانکہ وہ جرمنی کی کسی چیز کی تعریف کرنا نہ چاہتی تھی۔

دکتور نصرت الدین ایک پرمذاق اور خوش دل شخص تھا۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے ہنساتا رہا۔ تمارا نے اسے یہ بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ جرمنی سے کیوں متنفر تھی۔

اچانک نصرت الدین نے خالص طہرانی لہجے میں اس سے کہا۔

"خانم جُون"۔

"ہوں۔؟ جُون کا مطلب؟"

"زندگی"۔!

"ونڈرفل۔ یعنی میں تمھاری زندگی ہوں"۔!

اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا۔ "ہاہا۔ میری زندگی! سنو خانم جُون۔ ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ تم مجھے بالکل میری دادی جیسی لگتی ہو"۔

"بہت خوب۔ آپ سے زیادہ بااخلاق شخص پورے یورپ میں نہ ہوگا۔ ایک چوبیس سالہ لڑکی کو آپ اپنی دادی بنائے دے رہے ہیں!"

"واللہ۔ کسی روز تمھیں ان کی تصویر دکھلاؤں گا"۔

دوسری شام وہ اس کے ہوسٹل کے کمرے میں آیا۔ تمارا اب تک اپنے سوٹ کیس بند کر کے سامان ترتیب سے نہیں جما سکی تھی۔ سارے کمرے میں چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔

"بہت پھوہڑ لڑکی ہو۔ کوئی سمجھدار آدمی تم سے شادی نہ کرے گا"۔ اس نے آتش دان کے سامنے چمڑے کی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

تمارا نے جلدی جلدی کچھ سامان اٹھا کر ایک طرف رکھا۔

"لوگ باگ مجھ سے ابھی سے جلنے لگے ہیں کہ میں نے آتے ہی کیمپس کی سب سے خوبصورت لڑکی چھانٹ لی"۔

"چھانٹ لی! عرب شیوخ کی طرح آپ بھی حرم رکھتے ہیں!" تمارا نے مصنوعی غصّے سے کہا۔

وہ زور سے ہنسا اور کرسی کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ دریچے کے باہر صنوبر کے پتے سرسرائے۔

"وہ بھی عجیب عیاش بزدل ظالم قوم ہے"۔ تمارا نے مزید اظہارِ خیال کیا اور ایک الماری کا پٹ زور سے بند کر دیا۔ الماری کے قدِ آدم آئینے میں پروفیسر کا دل نواز پروفائل نظر آیا اور اس پر مزید عاشق ہوئی۔

"تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ خانم جُون۔ ہم ایرانیوں کی بھی عربوں سے کبھی نہیں پٹی۔ ہم تو انھیں کاکروچ کھانے والا کہتے ہیں"۔ نصرت نے مسکرا کر پائپ جلایا۔

"کاکروچ کھاتے ہیں؟" تمارا نے حیرت سے پوچھا اور منھ بنایا۔ "وحشی۔ بدو۔ مشرقی۔ معاف کرنا۔ میرا مطلب ہے۔ تم تو ان سے بہت مختلف ہو۔ ایرانی تو مڈل ایسٹ کے فرنچ مین کہلاتے ہیں"۔ اس نے ذرا خجالت سے اضافہ کیا۔

"درست۔ تشکرم۔ تشکرم!"

"ترجمہ کرو۔"

"جی۔ تھینکس"۔ اس نے ناک میں بولنے والے امریکن لہجے میں کہا۔

وہ خوب کھلکھلا کر ہنسی۔ "تم بہت اچھے اداکار ہو۔ کم سے کم ٹی۔ وی اسٹار تو بن سکتے ہو۔"

"واقعی۔؟ بہت جلد تم مجھے ٹی۔ وی اسکرین پر دیکھ لوگی"۔

"کیا تم نے کبھی ایکٹنگ کی ہے؟"۔

"بہت۔ کالج میں ہمیشہ رومیو یہ خاکسار ہی بنا کرتا تھا اور فرہاد"۔

"فرہاد کون؟"

"تھے ایک صاحب۔ آغا فرہاد بیگ"۔ اس نے نظامی کے چند اشعار پڑھے۔ ان کا ترجمہ کیا۔ پھر پروفیسروں والے انداز میں جیسے کلاس کو پڑھاتا ہو، اس راستے کا نقشہ سمجھایا جدھر سے آرمینیا کی شہزادی شیریں اس کے اپنے وطن آذر بائیجان سے گذرتی خسرو کے دارالسلطنت پہنچی تھی۔ بعد ازاں کوہِ بے ستوں کا جغرافیہ اس کینیڈین دانش جو کو ذہن نشیں کرایا۔

ہفتے کی شام کو وہ پہلی بار دکتور شریفیان کی قیام گاہ پر اس کے ہمراہ گئی۔ کیمپس سے خاصی دور صنوبروں کے جھرمٹ میں چھپی ایک پرانی عمارت کی دوسری منزل پر اس کا دو کمروں کا اپارٹمنٹ تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر نصرت الدین نے لیمپ جلایا۔ تمارا نے کوٹ اتار کر کرسی پر رکھتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ فارسی کتابیں اور رسالے سارے میں بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے تھے۔

تمارا کو معلوم تھا اب وہ ہزاروں بار دہرایا ہوا ڈرامہ دہرایا جائے گا۔ وہ ریڈیو گرام پر ریکارڈ لگائے گا۔ پھر اس سے پوچھے گا اسے کون سی شراب پسند ہے۔ عین اسی وقت سارے مغرب کے ان گنت کمروں میں یہی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہوگا۔ اور وہ اس ڈرامے میں اس آدمی کے ساتھ حصہ لیتے ہوئے ناخوش نہ تھی۔

نصرت نے قیمتی فرانسیسی شراب اور دو گلاس سائڈ بورڈ سے نکالے اور صوفے کی طرف آیا۔ پھر اس نے جُھک کر کہا۔ "تمارا خانم اب وقت آگیا ہے کہ تم کو اپنی دادی سے ملواؤں۔"

وہ سرخ ہو گئی۔ "معلوم ہے ہمارے یہاں مغرب میں اس جملے کے کیا معنی ہوتے ہیں ؟"

"معلوم ہے"۔ اس نے ذرا بے پروائی سے کہا۔ لیکن اس کے لہجے کی خفیف سی بے پروائی کو تمارا نے شدت سے محسوس کیا۔ اب نصرت الدین نے الماری میں سے ایک چھوٹا سا البم نکالا اور ایک ورق الٹ کر اسے پیش کیا۔

ایک بے حد حسین لڑکی پچھلی صدی کے خاور میانہ کی پوشاک میں ملبوس ایک فرنچ وضع کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ پس منظر میں سنگترے کے درخت تھے۔

"دادی اماں۔ اور یہ۔ ہمارا سنگتروں کا باغ تھا۔"

تمارا نے دیکھا دادی میں اس سے بہت ہلکی سی مشابہت ضرور موجود تھی اس نے دوسرا صفحہ پلٹنا چاہا۔ نصرت الدین نے فوراً بڑی ملائمت سے البم اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ "تمارا خانم وقت ضایع نہ کرو۔ وقت بہت کم ہے۔"

تمارا نے سینڈل اتار کر پاؤں صوفے پر رکھ لئے وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "اتنے نازک چھوٹے چھوٹے پیر۔ تم ضرور کسی شاہی خاندان سے ہو"۔

"ہوں تو سہی شاید"۔

"کون سا۔؟ ہز میجسٹی اعلیٰ حضرت تمھارے والد یا چچا یا دادا اس وقت سوئیٹزر لینڈ کے کون سے قصبے میں پناہ گزیں ہیں ؟"

"میرے والد ٹورانٹو میں ایک گارمنٹ فیکٹری کے مالک ہیں"۔ تمارا نے نہیں دیکھا کہ ایک ہلکا سا سایہ دکتور شریفیان کے چہرے پر سے گذر گیا۔ "لیکن میرے نانا غالباً خوانین کریمیا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے"۔

"اوہو۔ خوانین کریمیا ! —— حاجی سلیم گرائی۔ قرا دولت گرائی۔ جانی بیگ —— گرائی۔ محمود گرائی۔ کون سے گرائی ؟"

"نصرت مجھے معلوم ہے تم تاریخ کے استاد ہو۔ رعب مت جھاڑو۔ مجھے پتہ نہیں کون سے گرائی۔ میں نے تو یہ نام بھی اس وقت تم سے سنے ہیں"۔

"اور موصوف تمھارے نانا بالشویک انقلاب سے بھاگ کر پیرس آئے"۔

"ہاں۔ وہی پرانی کہانی۔ پیرس آئے اور ایک ریستوران میں نوکر ہو گئے اور ریستوران کے مالک کی خوبصورت لڑکی روزلین سے شادی کر لی۔ اور روزلین کے ابا بہت خفا ہوئے کیوں کہ ان کی دوسری لڑکیوں نے یہاں جرمنی میں اپنے ہم مذہبوں سے بیاہ کیے تھے"۔ وہ دفعتاً چپ ہو گئی۔ اب اس کے چہرے پر سے ایک ہلکا سا سایہ گذرا جسے نصرت الدین امام قلی نے دیکھا۔

چند لمحوں بعد تمارا نے پھر کہنا شروع کیا۔ روزلین کے والد واقعی بہت خفا تھے۔ جب روزلین ان سے فخریہ کہتیں کہ انھوں نے ایک روسی شہزادے سے شادی کی ہے تو وہ گرج کر جواب دیتے آج کل ہر چپڑ قنات کو جوان سائیس خاکروب جو روس

سے بھاگ کر یہاں آرہا ہے' اپنے آپ کو ڈیوک اور کاؤنٹ سے کم نہیں بتاتا۔ تمھارا تاتاری خاوند بھی کریمیا کے کسی خان کا چوبدار رہا ہوگا۔ نانا بچارے کا تین سال بعد ہی انتقال ہوگیا۔ دراصل شاید جلاوطنی کا الم انھیں کھا گیا۔" اب شریفیان کے چہرے پر سے ایک اور سایہ گذرا جسے تمارا نے نہیں دیکھا۔" میری ممی ان کی اکلوتی اولاد تھیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں ممی نے ایک پولش ریفیوجی سے شادی کرلی۔ وہ دونوں آزاد فرانسیسی فوج میں اکٹھے لڑے تھے۔ جنگ کے بعد وہ فرانس سے ہجرت کرکے امریکہ آگئے۔ جب میں پیدا ہوئی تو ممی نے میرا نام اپنی ایک نادیدہ مرحومہ پھوپھی کے نام پر تمارا رکھا۔ وہ پھوپھی روسی خانہ جنگی میں ماری گئی تھیں۔ ہمارے خاندان میں نصرت الدین ایسا لگتا ہے کہ ہر نسل نے دونوں طرف سوائے خوفناک قسم کی اموات کے کچھ نہیں دیکھا۔"

"ہاں بعض خاندان اور بعض نسلیں ایسی بھی ہوتی ہیں ——— نصرت الدین نے آہستہ سے کہا۔ پھر پوچھا۔" فی الحال تمھاری قومیت کیا ہے ؟"

"کینیڈین۔"

ایرانی پروفیسر نے شراب گلاسوں میں انڈیلی اور مسکرا کر کہا۔" تمھارے نانا اور میری دادی کے نام"۔ انھوں نے گلاس ٹکرائے۔

○

دوسرا ہفتہ۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ایک ریستوران کی طرف جاتے ہوئے بازار میں سے گذرے اچانک وہ کھلونوں کی ایک دکان کے سامنے ٹھٹھک گیا اور کھڑکیوں میں سجی گڑیوں کو بڑے پیار سے دیکھنے لگا۔

"تمھارے بہت سارے بھانجے بھتیجے ہیں نصرت الدین ؟" تمارا نے دریافت کیا۔

وہ اس کی طرف مڑا اور سادگی سے کہا۔" میرے پانچ عدد بچے اور ایک عدد ان کی ماں میری محبوب بیوی ہے۔ میری سب سے بڑی لڑکی اٹھارہ سال کی ہے۔ اس کی شادی

ہونے والی ہے۔ اور اس کا منگیتر۔ میرے بڑے بھائی کا لڑکا۔ وہ۔ دراصل ٹسٹ پائلٹ ہے۔ اس لیے۔ کچھ پتہ نہیں۔ بہت خطرناک زندگی ہے اس بیچارے کی"۔ وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

اس وقت تمارا کو معلوم ہوا جب کسی پر فالج گرتا ہو تو کیسا لگتا ہوگا ——— اس نے آہستہ سے خوددار آواز میں جس سے ظاہر نہ ہو کہ شاکی ہے۔ کہا۔ "تم نے کبھی بتایا نہیں"۔

"تم نے کبھی پوچھا نہیں"۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اچانک تمارا نے اسے پہلی بار دیکھا۔ وہ ایک سنگی انسان تھا کوہِ بے ستون کے پتھروں سے ترشا ہوا مجسمہ۔

ایک ہفتہ اور گذر گیا۔ تمارا اس سے اسی طرح ملا کی وہ اسے مغرب کی PERMISSIVE سوسائٹی کی ایک آوارہ لڑکی سمجھتا ہے تو سمجھا کرے۔ وہ تو اس پر سچے دل سے عاشق تھی۔ اس پر جان دیتی تھی۔

ایک رات ندی کے کنارے بنچ پر بیٹھے ہوئے نصرت الدین نے تمارا سے کہا۔ "ہلو خواند خاتون"۔

"کون۔؟"

"علاالدین کیقباد دوم کی ملکہ"۔

کبھی وہ اسے ترکان خاتون کہہ کر پکارتا۔ ملک شاہ سلجوقی کی بیگم۔ کبھی اسے شہزادی ساقی بیگ کہتا۔ "کیونکہ۔ تمہارے اندر کم از کم پندرہ فی صد تاتاری خون تو ہے ہی۔ اور سنو۔ فرض کرو"۔ ندی کے کنارے اسی رات اس نے کہا۔ "اگر تمہارے نانا کریمیا ہی میں رہ گئے ہوتے۔ وہیں کسی خان زادی سے شادی کر لی ہوتی اور تمہاری اماں فرض کرو ہمارے کسی اوغلو پاشا سے بیاہ کر تبریز آجاتیں تو تم میری گل چہر خانم ہو سکتی تھیں"۔

دفعتاً وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تاریخ۔ نسل۔ خون۔ کس کا کیا قصور ہے؟ وہ بہت بے رحم تھا۔

نصرت الدین اس کے رونے سے متعلق نہ گھبرایا۔ نرمی سے کہا۔ "چلو بی بی جون۔ گھر چلیں"۔

"گھر۔؟" اس نے سر اٹھا کر کہا۔ "میرا گھر کہاں ہے؟"

"تمہارا گھر ٹورونٹو میں ہے۔ تم نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ میرا گھر کہاں ہے۔ نصرت الدین نے ذرا تلخی سے کہا۔ وہ روتی رہی لیکن اچانک دل میں امید کی مدھم سی شمع روشن ہوئی۔ یہ ضرور اپنی بیوی سے ناخوش ہے۔ اس کی ازدواجی زندگی پرسکون نہیں۔ اسی وجہ سے کہہ رہا ہے۔ "میرا گھر کہاں ہے؟"

ان تمام مغربی لڑکیوں کی طرح جو مشرقی نوجوانوں سے معاشقے کے دوران ان کی زبان سیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ تمارا بڑے اشتیاق سے فارسی کے چند فقرے یاد کرنے میں مصروف تھی۔ ایک روز کیفے ٹیریا میں اس نے کہا۔ "آغا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جب ہم بوڑھے ہو جائیں تب ملیں"۔

"ہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں"۔

"آج سے بیس سال بعد جب تم مورخوں کی کسی کانفرنس کی صدارت کے لئے مونٹریال آؤ۔ یا۔ یو این میں ایرانی سفیر ہو کر نیویارک پہنچو"۔

"اور تم کسی امریکن کروڑپتی کی فربہ بیوہ ہو"۔

"ہاں۔ اور ٹفنی میں ہماری اچانک مڈبھیڑ ہو جائے۔ جہاں تم اپنی نواسی کی منگنی کی انگوٹھی خریدنے آئے ہو۔ اور تم سوچو میں نے اس بوڑھی موٹی عورت کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔ فارسی میں بوڑھی عورت کو کیا کہتے ہیں؟"

"پیرہ زن"۔

"اور عربی میں؟"

"مجھے عربی نہیں آتی۔ ترکی اور فرنچ میں البتہ بتا سکتا ہوں"۔

"سنو نصرت الدین۔ ایک بات سنو۔ آج صبح میں نے ایک عجیب خوفناک وعدہ

اپنے آپ سے کیا ہے۔"

"کیا؟"

"جب میں اس امریکن کروڑپتی سے شادی کروں گی۔"

"جو بوجہ السر تمھیں جلد بیوہ کر جائے گا۔"

"ہاں۔ لیکن اس سے قبل ایک بار۔ صرف ایک بار۔ تم جہاں کہیں بھی ہوگے۔ تبریز۔ اصفہان۔ شیراز۔ میں وہاں پہنچ کر اپنے اس نامعقول شوہر کے ساتھ ضرور بے وفائی کروں گی۔ ضرور بالضرور۔"

نصرت نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "بعض مرتبہ تم مجھے اپنی دادی کی تصویر معلوم ہوتی ہو۔ بعض دفعہ میری لڑکی کی۔ وہ بھی تمھاری طرح۔ تمھاری طرح اپنے ابن عم کو اس شدت سے چاہتی ہے۔" وہ پھر ملول نظر آیا۔

"آغا۔ تم مجھے بھی اپنی بنتِ عم سمجھو۔"

"تم میری بنتِ عم ہو تو سہی۔"

"کیونکہ ہم سب اولادِ آدم ہیں۔ ہے نا۔؟"

"اولادِ آدم۔ اولادِ ابراہیم۔ آلِ یافث۔ آلِ اسحٰق۔ آلِ اسمٰعیل۔ میں انسان کے شجرہ نسب کے اس گھپلے پر مزید روشنی ڈال سکتا تھا تمارا خانم لیکن اب کھانا شروع کرو۔"

وہ ریستوران کی دیوار پر لگے ہوئے آئینے میں اس کا پروفائل دیکھنے لگی اور بولی "میں آج تک ایسی خوبصورت ناک نہیں دیکھی۔"

"میں نے بھی نہیں دیکھی۔" شریفیان نے کہا۔

"آغا۔ تم میں نرگسیت بھی ہے؟"۔ تمارا نے پوچھا۔

"ہے" وہ شرارت سے مسکرایا۔

اس وقت اچانک تمارا کو ایک قدیم فرانسیسی دعا یاد آئی جو برٹنی کے ماہی گیر سمندر

میں اپنی کشتی لے جانے سے پہلے پڑھتے تھے۔ اے ربِ عظیم۔ میری حفاظت کرنا۔

میری ناؤ اتنی چھوٹی سی ہے

اور تیرا سمندر اتنا بڑا ہے

اس نے دل میں دہرایا۔

اے ربِ عظیم۔ اس کی حفاظت کرنا۔

اس کی ناؤ اتنی چھوٹی سی ہے۔

اور تیرا سمندر

"آغا۔ ایک بات بتاؤ۔"

"ہوں۔"

"تم نے آج کا اخبار پڑھا؟ تمھارے ملک کے بہت سے دانش جو اور دانش ور شہنشاہ کے خلاف ہیں۔ انھوں نے برلن میں کل بڑا بھاری جلوس نکالا۔"

"پڑھا۔"

"تم تو جلاوطن ایرانی نہیں ہو؟"

"نہیں۔ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تمارا خانم میں لڑکے پڑھاتا ہوں۔"

"اچھا۔ شکر ہے۔ دیکھو۔ کسی خطرے میں نہ پڑنا۔ ہر طرف آج کل دنیا میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اپنا خیال رکھو۔"

"اچھا۔"

اس رات وہ حسبِ معمول ندی کے کنارے بیٹھے تھے تمارا نے کہا "جب ہم اپنے اپنے دیس واپس جائیں گے میں کتنی باتیں یاد کروں گی۔ تم کو خیر میرا خیال کبھی نہ آئے گا۔ تم مشرقی لوگوں کی عادت ہے۔ یورپ امریکہ آ کر لڑکیوں کے ساتھ تفریح کی اور واپس چلے گئے۔ بتاؤ میرا خیال کبھی آئے گا؟"

وہ مسکرا کر چپ چاپ پائپ پیتا رہا۔

"تم نصرت الدین امام قلی میرا دل رکھنے کے لئے اتنا بھی نہیں کہہ سکتے کہ کم از کم سال کے سال ایک عدد نیو ائیر زکارڈ ہی بھیج دیا کرو گے۔ اب تک میرا پتہ بھی نوٹ بک میں نہیں لکھا۔" اس نے نصرت کے کوٹ کی جیب سے نوٹ بک ڈھونڈ کر نکالی T کا صفحہ پلٹ کر اپنا نام اور پتہ لکھا اور بولی۔ "وعدہ کرو۔ یہاں سے جا کر مجھے خط لکھو گے۔"

"میں غلط وعدے کبھی نہیں کرتا۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ذرا خفگی سے آگے آگے چلنے لگی۔ نصرت نے چپکے سے جیب میں سے نوٹ بک نکالی۔ وہ صفحہ علیحدہ کیا جس پر تمارا نے اپنا پتہ لکھا تھا۔ باریک باریک پرزے کر کے ان کی گولی بنائی اور ندی میں پھینک دی۔

صبح سویرے چھ بجے تمارا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے تکیے سے ذرا سا سر اٹھا کر دریچے کے باہر دیکھا۔ صبح کی روشنی نقرئی پانی کی مانند صنوبروں پر پھیل رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں بند کیں اور پھر سو گئی۔

سوا آٹھ کے قریب جب وہ بستر سے اٹھی نصرت میز پر ناشتہ چننے میں مصروف ہو چکا تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ تمارا نے کروٹ بدل کر کاہلی سے ہاتھ بڑھایا۔ ٹیلی فون پلنگ کے سرہانے کتابوں کے انبار پر رکھا تھا۔ اس نے ذرا سا سرک کر ریسور اٹھایا۔ اور "الو" کہے بغیر نصرت کو اشارے سے بلایا۔

وہ لپک کر آیا اور ریسور ہاتھ میں لے کر کسی سے فرنچ میں باتیں کرنے لگا۔

گفتگو ختم کرنے کے بعد نصرت نے جھک اس سے کہا۔ "خانم جون۔ اب اٹھو۔"

اس نے سستی سے کلاک پر نظر ڈالی اور منٹ کی سوئی کو آہستہ آہستہ پھسلتے دیکھتی

رہی۔ نصرت باورچی خانے میں گیا قہوے کی کشتی لاکر گول میز پر رکھی۔ تمارا کو آواز دی اور دریچے کے قریب کھڑے ہوکر قہوہ پینے میں مصروف ہوگیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں توس تھا اور دوسرے میں پیالی۔ اور وہ ذرا جلدی جلدی توس کھاتا جارہا تھا۔ سفید جالی کے پردے کے مقابل اس کے پروفائل نے بے حد غضب ڈھایا۔ تمارا چھلانگ لگاکر پلنگ سے اتری اور اس کے قریب جاکر بڑے لاڈ سے کہا۔ "آج اتنی جلدی کیا ہے۔ تم تو ہمیشہ دیر سے کام پر جاتے ہو"۔

"ساڑھے نو بجے وائس چانسلر سے اپوائنٹمنٹ ہے"۔ اس نے کلاک پر نظر ڈال کر جواب دیا۔ "جھٹ پٹ تیار ہوکر ناشتہ کرلو۔ تمھیں راستے میں اتارتا جاؤں گا"۔

ٹھیک پونے نو پر وہ دونوں عمارت سے باہر نکلے۔ صنوبروں کے جھنڈ میں سے گزرتے سڑک کی طرف روانہ ہوگئے۔ رات بارش ہوئی تھی اور بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ گھاس میں کھلے زرد پھولوں کی وسعت میں لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔

وہ دس منٹ تک سڑک کے کنارے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے رہے۔ اتنے میں ایک بس آتی نظر آئی۔ نصرت نے آنکھیں چندھیا کر اس کا نمبر پڑھا اور تمارا سے بولا۔ "یہ تمھارے ہوسٹل کی طرف نہیں جاتی۔ تم دوسری بس میں چلی جانا میں اسے پکڑتا ہوں"۔ اس نے ہاتھ اٹھاکر بس روکی۔ تمارا کی طرف پلٹ کر کہا۔ "خدا حافظ"۔ اور لپک کر بس میں سوار ہوگیا۔

شام کو کلاس سے واپس آکر تمارا نے حسب معمول اسے فون کیا۔ گھنٹی بجی، وہ شاید اب تک واپس نہ آیا تھا۔

دوسری صبح اتوار تھا۔ وہ کافی دیر میں سو کر اٹھی۔ اس کی جرمن روم میٹ باہر جا چکی تھی۔ اس نے اٹھ کر حسب معمول دروازے کے نیچے پڑے ہوئے سنڈے ایڈیشن

اٹھائے سب سے اوپر والے اخبار کی شہہ سرخی میں وہ خوفناک خبر چھپی تھی۔ اس کی تصویر بھی شایع ہوئی تھی۔ وہ ڈکتور نصرت الدین امام قلی شریفیان پروفیسر تاریخ دانش گاہ تبریز نہیں تھا۔ وہ ایرانی بھی نہیں تھا۔ لیکن اخبار میں اس کا جو نام چھپا تھا وہ بھی غالباً اس کا اصل نام نہ تھا۔ اس کے ساتھ دوسری تصویر اس دبلے پتلے نوجوان کی تھی جو ٹرین میں سارا وقت اخبار پڑھتا رہا تھا اور خاموشی سے ایک قصبے کے اسٹیشن پر اتر گیا تھا۔

نزدیک کے ایک شہر کے ائیرپورٹ میں ایک طیارے پر دستی بموں اور مشین گنوں سے حملہ کرتے ہوئے وہ تین مارے گئے تھے۔ نصرت الدین نے حملہ کرنے کے بعد سب سے پہلے دستی بم سے خود کو ہلاک کیا تھا۔ ہنسی خوشی اپنی مرضی سے ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گیا تھا۔

وہ دن بھر نیم غشی کے عالم میں پلنگ پر پڑی رہی۔ متواتر اور مسلسل اس کے دماغ میں طرح طرح کی تصویریں گھومتی رہیں۔ جیسے انسان کو سرسام یا ہائی بلڈ پریشر کے حملے کے دوران انوکھے نظارے دکھلائی پڑتے ہیں۔ رنگ برنگے موتیوں کی جھالریں۔ سمندر۔ بے تکی شکلیں۔ آگ۔ اور آوازیں۔ شائد وہ CLAREAUDIENCE کا شکار بھی ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس کے کان میں صاف آوازیں اس طرح آیا کیں جیسے کوئی برابر بیٹھا باتیں کر رہا ہو۔ اور ٹرین کی گڑگڑاہٹ۔ میں نے تمھاری بات سنی تھی۔ جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ عنقریب موت کے منہ میں جانے والا ہے وہ سخت دل ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارا سنگتروں کا باغ تھا۔ تم نے کبھی مجھ سے نہ پوچھا میرا گھر کہاں ہے۔

ونڈرفل۔ میں تمھاری زندگی ہوں ! ہاہا۔ میری زندگی۔ جانِ من۔ چلو وقت نہیں ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ قربون۔ وقت ضایع نہ کرو۔ میری لڑکی کا منگیتر۔ بہت خطرناک زندگی ہے اس بیچارے کی۔ مجھے عربی نہیں آتی۔ ہلو ترکان خاتون۔ میں غلط وعدے کبھی نہیں کرتا۔ ایسے وعدے کبھی نہیں کرتا جو نبھا نہ سکوں۔ تم میری بنتِ عم ہو تو سہی۔ آلِ اسحٰق۔ آلِ اسمٰعیل۔ میں بنی آدم کے شجرے کے اس گھپلے پر مزید روشنی ڈال سکتا

ہوں۔ لیکن تمارا خانم کھانا شروع کرو۔ دیکھو نصرت خطرے میں نہ پڑنا۔ ہر طرف دنیا میں خطرہ ہی خطرہ ہو۔ اپنا خیال رکھو۔ اچھا رکھوں گا۔ شہزادی ساقی بیگ۔

اندھیرا پڑے پالا اس کی روم میٹ کمرے میں آئی۔ روشنی جلا کر تمارا کی طرف دیکھے بغیر بے دھیانی سے میکانیکی انداز میں ہاتھ بڑھا کر ٹیلی ویژن کا سوئچ آن کیا اور گنگناتی ہوئی بالکنی میں چلی گئی۔

تمارا کروٹ بدل کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے برفیلی نیلی اسکرین دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد نیوز ریل شروع ہوئی۔ اچانک اس کا کلوز اپ سامنے آیا۔ آدھا چہرہ۔ آدھا دستی بم سے اڑ چکا تھا۔ صرف پر دفائل باقی تھا۔ دماغ بھی اڑ چکا تھا۔ ائیر پورٹ کے چمکیلے شفاف فرش پر اس کا بھیجا بکھرا پڑا تھا۔ اور انتڑیاں۔ سیاہ جما ہوا خون۔ کٹا ہوا ہاتھ۔ کارتوس کی پیٹی۔ گوشت اور ہڈیوں کا مختصر سا ملغوبہ۔ تم بہت اچھے اداکار ہو۔ کم از کم ٹی۔ وی اسٹار تو بن سکتے ہو۔ واقعی؟ جلد تم مجھے ٹی وی اسکرین پر دیکھ لوگی۔

کیمرہ پیچھے ہٹا۔ لالہ کا ایک گلدستہ جو بھگدڑ میں کسی مسافر کے ہاتھ سے چھٹ کر گر گیا تھا۔ برابر میں "نصرت الدین" کا کٹا ہوا ہاتھ لالہ کے پھول اس کے خون میں لت پت۔ پھر اس کا آدھا چہرہ۔ پھر گوشت کا ملغوبہ۔ اس ملغوبے کو اتنے قریب دیکھ کر تمارا کو ابکائی سی آئی۔ وہ چکرا کر اٹھی اور غسل خانے کی طرف بھاگنا چاہا۔ اس کی ہیبت زدہ چیخ سن کر پالا اس کی روم میٹ بالکنی سے لپکی ہوئی آئی۔

تمارا نے دیکھا پالا کا چہرہ نیلا اور سفید تھا۔ پالا نے فوراً ٹیلی ویژن بند کیا اور اسے فرش پر سے اٹھانے کے لئے جھکی۔

پالا کے سر پر سفید اسکارف بندھا تھا۔ جیسے نرس آپریشن ٹیبل پر سرطان کے مریض کو لٹاتی ہو۔ یا اسے ایک ٹرالی پر بٹھا کر گیس چیمبر کے اندر لے جایا جا رہا تھا۔ اور برابر کی بھٹی میں انسان زندہ جلائے جا رہے تھے ان کا سیاہ دھواں چمنیوں میں سے

نکل کر آسمان کی نیلاہٹ میں گھلتا جا رہا تھا۔

اب وہ ایک نیلے ہال میں تھی۔ دیواریں فرش چھت برف کی طرح نیلی اور سرد۔ کمرے کے بعد کمرے۔ گیلریاں۔ سب نیلے۔ ایک کمرے میں سفید آتش دان کے پاس ایک نیلے چہرے والی عورت کھڑی تھی۔ شکل سے سنٹرل یوروپین معلوم ہوتی تھی۔ پورا سراپا ایسا نیلا جیسے رنگین تصویر کا نیلا پروف جو ابھی پریس سے تیار ہو کر نہ نکلا ہو۔

ایک اور ہال۔ اس کے وسط میں قالین بافی کا کرگھا۔ کرگھے پر ادھ بُنا قالین۔ اس پر "شجرِ حیات" کا ادھورا نمونہ۔

"یہ شجرِ حیات کیا چیز ہے نصرت الدین ؟"

"مڈل ایسٹ کے قالینوں کا موتیف خانم جُون"۔

کرگھے کی دوسری طرف سر پر رومال باندھے دو مڈل ایسٹرن عورتیں۔ پھر بہت سے پردے۔ جیسے محلات میں ہوتے ہیں۔ اطلسی آبشار۔ پردوں کے انبار میں الجھ گئی پھر اس نے بگٹٹ بھاگنا شروع کیا۔ مگر گیلری طویل ہوتی چلی گئی۔ وہ نیچے اتری۔ جیسے بنکس کے تہہ خانے ہوتے ہیں چمکیلی سنگلاخ دیواریں۔ چمکیلا فرش۔ جیل خانے کے ریڈور جیسا۔

اب وہ ایک بہت وسیع سرنگ میں چل رہی تھی۔ اچانک اسے چند کیچڑ کے آدمی نظر آئے۔ وہ اس سرنگ، یا انڈر گراؤنڈ ریلوے کے سنسان کوریڈور میں ایک مین ہول کے اندر اور اس کے گرد پھاوڑے لیے کھڑے تھے۔ کیچڑ کے چہرے۔ کیچڑ کی وردیاں اسے دیکھ کر استہزا سے ہنسے۔ وہ بھاگتی ہوئی باہر نکلی۔ عین سامنے چوڑا دروازہ تھا۔ دروازے کے باہر شہر کا بازار۔ بارش ہو رہی تھی۔ ٹرامیں ٹن ٹن کرتی گذر رہی تھیں۔ دروازے کے برابر ایک پھول والی برساتی اوڑھے بیٹھی پھول بیچ رہی تھی۔ اس کے قریب جا کر اس عورت کو چھوا۔ وہ عورت مردہ تھی۔

اسے کوئی تعجب نہ ہوا۔ آگے بڑھی۔ سڑک پر مردوں کا ہجوم تھا۔ بسیں اور ٹرامیں مردے چلا رہے تھے۔ دکانوں میں خرید و فروخت مردے کر رہے تھے۔ ایک تھیٹر ہال میں جھانکا۔

اسٹیج پر "سوان لیک" میں مردے رقصاں تھے اور تماشائی بے جان تھے۔

"یہ زومبی ہیں نا؟" اس نے ایک آدمی سے پوچھا جو تیز تیز قدم رکھتا اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

"قیں قیں"۔ اس آدمی نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر جواب دیا۔ "زومبی نہیں مادموزیل۔ خالص۔ اصلی مردے"۔

وہ آدمی بہت لمبا تھا۔ تاڑ کا تاڑ۔ گریٹ کوٹ میں ملبوس مفلر سے سر چھپائے۔ مستقل مونچھوں پر ہاتھ رکھ کر بولتا تھا۔ اس کی آنکھیں ٹریفک کی بتیوں کی مانند کبھی سرخ ہو جاتیں کبھی سبز۔ اچانک، اس نے تمارا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا پنجہ لوہے کا تھا۔ "ایکس کیوزمی" تمارا نے نرمی سے کہا اور ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی ایک بس میں سوار ہو گئی۔

چاروں طرف دیکھا۔ شاید اس بس میں نصرت، موجود ہو۔ یہ اس کے ہوسٹل کی طرف جاتی ہے۔ نمبر پڑھ لیا تھا۔ ایک دفعہ نصرت مل جائے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

دفعتاً بس خالی ہو گئی۔ بغیر ڈرائیور بغیر مسافروں کے فراٹے بھرتی ایک پل پر سے گذر کر قبرستان کے پھاٹک پر رک گئی۔

یہ زندوں کا قبرستان ہے۔ تمارا نے اپنے آپ کو بتایا اب اسے ساری باتیں آپ سے آپ معلوم ہوتی جا رہی تھیں۔ میں چیزوں کو ان کے اصل بنیادی روپ میں دیکھ رہی ہوں۔

اندر جا کر اس نے ایک ایرکنڈیشنڈ قبر میں جھانکا۔ یہ ایک SPLIT LEVEL قبر تھی۔ اندر رنگین ٹیلی ویژن کے سامنے زندہ لوگ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ ٹیلی ویژن سنٹرل یوروپین نیلی چہرے والی عورت "للی مارلین" گا رہی تھی۔ اس نے ۱۹۱۶ء کے فیشن کا لباس پہن رکھا تھا۔ گڑگڑاہٹ کے ساتھ خبریں شروع ہو گئیں۔ وہ خبریں سننا نہ چاہتی تھی اس لئے بھاگی۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ جنازے قبرستانوں سے الٹے گھروں کی طرف جا رہے ہیں۔ قبریں زندوں سے بھر گئی ہیں جگہ نہیں ملی۔ اس نے اپنے آپ کو بتایا۔ اور شہر واپس

آئی۔ یہاں حسب معمول ہر جگہ مردے ہی مردے تھے۔ دفتروں میں کارخانوں میں ہر جگہ بعض مردوں نے پچھلی صدیوں کے لباس پہن رکھے تھے۔ اس کے سامنے ایک سولہویں صدی کا برطانوی بادشاہ اپنا تاج سیدھا کرتا ذرا جھینپا جھینپا کیونکہ اس کا شاہی لباس بے حد شکن آلود اور بوسیدہ تھا۔ تابوت سے نکلا۔ (تابوت گاڑی کو باوردی مردے کھینچ رہے تھے) سلامی لیتا ایک بنک کی سیڑھیاں چڑھا اور جا کر منیجر کی کرسی پر گم صم بیٹھ گیا۔ اور مٹی کے رنگ کی بھربھری داڑھی پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

باہر پارک میں اٹھارہویں صدی کی مردہ عورتیں سائکل چلانے کی مشق کر رہی تھیں۔ ان کے منجمد چہرے مٹی کے تھے۔

"یہ ان لوگوں کو کیوں بلایا گیا ہے" اس نے پوچھا۔

"جنرل لام بندی" ایک گیارہویں صدی کے نارمن کسان نے جواب دیا اور سر جھکائے پارک کی کیاری میں کدال چلاتا رہا۔ اس کے ہاتھ بالکل خشک اور سیاہ تھے۔

تب اس نے سوچا۔ وقت دعا ہے۔ توبہ استغفار۔ توبہ استغفار۔ ایک عظیم الشان صحن معہ فوراً اس کے سامنے آگیا۔ وہ سر پر رومال باندھ کر اس کے صدر دروازے کی طرف بڑھی۔ اندر ربائی نمازِ عشا پڑھانے میں مصروف تھا۔ دروازے کی محراب کے نیچے ایک آدمی گھٹنوں میں منھ چھپائے بیٹھا سر پر خاک ڈال رہا تھا۔

"معاف کیجیے گا آپ، حضرت ایوب، ہیں" اس نے ادب سے جھک کر دریافت کیا۔

"نہیں۔ میں بلبلا کر خدا کو پکارتا ہوں مگر منھ سے صرف گالیاں نکلتی ہیں" آدمی نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

"آپ ابلیس ہیں؟"

"یا ابلیس یا مجذوب یا محض نروس بریک ڈاؤن کا شکار" اس نے جواب دیا اور مزید راکھ سر پر ڈالی

"آپ نے ایل۔ ایس۔ ڈی نوش جان کی ہوگی۔ آپ کی روح کو کیا تکلیف ہے"۔

"روح؟ روح گئی چولہے بھاڑ میں۔ کیسی روح؟" اس نے جواب دیا اور بال نوچے

میں چیزوں کو ان کے بنیادی روپ میں دیکھ رہی ہوں اس نے دل میں دہرایا اور خود کو بہت عاقل اور ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ وہ ایک انڈر گراؤنڈ ٹرین میں موجود تھی۔ ٹرین کبھی کبھی کھچا کھچ بھر جاتی کبھی ایک دم خالی۔ اس میں دنیا بھر کی قوموں کے لوگ سوار تھے اور زمین کے نیچے نیچے آواز سے زیادہ تیز رفتار سے ساری دنیا میں گھوم رہی تھی۔ سرحدوں کے بعد سرحدیں۔

اور الجزائر

اور سینائی

اور سوریہ

اور

ٹرین سمندر کے نیچے سے نکل کر ایک تپتے ہوئے صحرا میں آگئی اور بغیر پٹریوں کے ریت پر چلنے لگی۔ اور گڑگڑاتی ہوئی سامنے پڑا کے سرخ رومن کھنڈروں میں گھس گئی۔

اور ٹائیر

اور صدون

اور نینوا

افق پر سنسان خیموں کے پردے بادِ سموم میں پھٹپھٹا رہے تھے۔ سارے میں جلی ہوئی رسیاں اور جلے ہوئے پردے اور بچوں کی ننھی منی جوتیاں بکھری پڑی تھیں۔ بہت دور فرات بہہ رہا تھا۔ اس کے کنارے ایک گھوڑا زور سے ہنہنایا اور کسی نے بڑی کرب ناک آواز میں پکارا۔ العطش۔ العطش۔

اس کے کیا معنی ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کیوں کہ اسے کوئی زبان نہ آتی تھی۔ سوا اپنی زبان کے۔ میں اب واپس جانا چاہتی ہوں۔ میں وہاں ہو آئی ہوں وہاں کچھ نہیں ہے پرچھائیوں کی پرچھائیاں بھی نہیں ہیں۔

لیکن آواز برابر گونجا کی۔ العطش۔

پھر ایک لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی۔ العطش۔

اچانک سورج کی روشنی بہت تیز ہو گئی۔ تباہ شدہ خیمہ گاہ اب صاف بہت قریب نظر آ رہی تھی۔

"آج خیمہ گاہوں پر پھر بم باری کی گئی ہے"۔

جرمن نیوز کاسٹر نے کہا۔

تیسرے روز جب اس کی طبیعت سنبھلی اور وہ کلاس کے بعد لنچ کے لیے اسی کیفے ٹیریا میں گئی دریچے کے سامنے والی میز پر اس وقت دو ہندوستانی طالب علم بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ان کے سامنے تازہ اخبار رکھا تھا جس میں "نصرت الدین" اور اس کے ساتھیوں کی مزید تصویریں اور تفصیلات چھپی تھیں۔ تمارا جلدی سے کاؤنٹر کے پاس جا کر قطار میں لگ گئی۔

بیاباں میں ہے

بیاباں میں ہے

دونوں طالب علم کسی اجنبی زبان میں بات کر رہے تھے اور ان کے جوش و خروش سے اندازہ ہوتا تھا کہ شعر پڑھ رہے ہیں۔ (جیسے وہ فارسی اشعار اسے سنایا کرتا تھا)

آئس لینڈک کی طرح دنیا میں کتنی زبانیں ہیں جو تمارا کو نہیں آتیں، کتنے جذبات، تصورات، نظریے، خواب، کرب، اندوہ جن سے وہ واقف ہونا نہیں چاہتی۔ کافی کچھ جان جانے کے باوجود۔ منتظر لالہ کب سے۔ کانٹا چمچے اور پلیٹ اٹھا کر وہ قطار میں آگے سرکی۔

قبا چاہیے۔ قبا چاہیے۔

اس کو خونِ عرب سے۔

سامنے سے تمارا گرین برگ کو اپنی ٹرے اٹھائے آتا دیکھ کر وہ لڑکے معاً خاموش ہو گئے۔

فقیروں کی پہاڑی

بڑی بڑی آنکھوں والے خوش شکل نوجوان نے گھسی ہوئی بش شرٹ میلی پتلون اور شکستہ جوتے پہن رکھے تھے۔ اس نے ریستوران کے اندر جاکر کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے ایرانی سے کچھ دریافت کیا۔ ایرانی نے انکار میں سر ہلادیا تو نوجوان نے خاموشی سے چار مینار کا ایک پیکٹ خریدا اور کچے برآمدے کی ایک بنچ پر بیٹھ کر سامنے کی رونق دیکھنے لگا ـــــ برآمدہ دراصل ایک بڑا سا چھپر تھا، لیکن اندر پختہ ہال کی دیواروں پر سبز رنگ کے ٹائل لگے تھے اور ایک بڑے سے آئینے پر ایک بے حد بھدی اور بھیانک "سینری" پینٹ کی گئی تھی ـــــ سنگِ مرمر کی گندی میزوں پر زائرین ناشتہ کرنے میں مصروف تھے اور ایک کونے میں "بوائے" ایک گندے پانی کی بالٹی میں پلیٹیں ڈبو ڈبو کر نکال رہا تھا۔ چھپر کے باہر پہاڑی کے دامن میں موٹریں، لاریاں اور ڈانڈیاں کھڑی تھیں۔ سرخ مٹی کے کچے راستے پر بگولے اڑ رہے تھے اور سامنے پہاڑی کی تین مہیب چوٹیاں دھوپ میں چمکنے لگی تھیں۔

اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔

نوجوان کی نظریں منظر کا جائزہ لیتے لیتے مس موہنی بالا پر جارکیں جو اپنی طویل کار سے

اتر کر ڈانڈی میں سوار ہو رہی تھی۔ اس کی فربہ "ممی" نے ٹفن باسکٹ اٹھا رکھی تھی۔ دوسری ڈانڈیوں میں بوڑھے پارسی اور بیمار یاتری سوار ہو رہے تھے۔ بیشتر زائرین جوق در جوق پہاڑ کی سیڑھیاں چڑھنے میں مصروف تھے۔ لاریوں کے اڈے اور پہاڑی کے درمیان ایک جوہڑ سا تھا جس میں پتھروں کی پگڈنڈی بنی تھی ——— ایک بے حد لمبے قد کا "زنانہ" سرخ بال کندھے پر چھٹکائے پگڈنڈی کے وسط میں کھڑا تھا۔ مس موہنی بالا کی ڈانڈی جب اس کے پاس سے گذری تو اس نے ہاتھ مٹکا کر کہا ——— "مراد پوری ہونے پر پورے سَو روپے لوں گی" موہنی بالا سہم کر اپنی جاپانی چھتری کی اوٹ میں چھپ گئی ——— نوجوان سگریٹ پھینک کر چھپر سے نکلا اور ڈانڈی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا ——— پہاڑی کے نیچے سیمنٹ کا نیا راستہ بن رہا تھا۔ درگاہ کے برہمن جمادار پھاٹک کے پاس کرسی پر بیٹھے زائرین کو انگریزی کا پمفلٹ دیتے جا رہے تھے جس میں سڑک پکی بنانے کے لئے عطیوں کی درخواست کی گئی تھی

نوجوان نے پھاٹک میں داخل ہو کر سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا۔ یہاں سے پہاڑی کے گھنے جنگل میں بنی ہوئی فقیروں کی صاف ستھری جھونپڑیاں شروع ہوتی تھیں، جن کے سامنے مقدس تصاویر، مالائیں اور تسبیحیں بک رہی تھیں۔ ایک فقیر نے ایک تین سالہ بچے کو شیو مہاراج کے بھیس میں ایک چٹان پر بٹھا رکھا تھا۔ بچہ بڑے صبر سے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ سیڑھیوں کے دونوں جانب ان گنت کوڑھی صدائیں لگا رہے تھے۔ جھونپڑیوں کے مختصر برآمدوں میں کاسے رکھے تھے۔

ایک زمانہ تھا جب وہ کالج میں پڑھتا تھا اور سوچا کرتا تھا کہ ہیرو بنے گا اور مس موہنی بالا کا لیڈنگ مین (LEADING MAN) کہلائے گا۔ یہ بچکانہ خواب تو خیر بہت جلد ٹوٹ گیا مگر آج، اس وقت مس موہنی بالا کا بے ضرر سا تعاقب کرنے میں کیا حرج تھا؟ لہٰذا وہ ڈانڈی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

کوڑھیوں کی اس افراط کے علاوہ جو وطن عزیز کے دو بڑے فرقوں، ہندو اور مسلمان

سے تعلق رکھنے کا فخر رکھتے تھے، پہاڑی پر ہر وضع کا اپاہج موجود تھا۔ اندھے، لنگڑے، لولے، لنجے اور ایسے بھکاری اور بھکارنیں جن کے محض دھڑ ہی سالم تھے۔ چٹانوں پر آڑے ترچھے لیٹے صدائیں لگا رہے تھے۔ لمبے چوغے والے آنکھوں میں سرمہ لگائے، ہزار دانہ تسبیح پھراتے، قلندر، مجذوب، بھنگ کے نشے میں مگن سادھو، —— فقیروں کی یہ عظیم الشان "کامن ویلتھ" یقیناً لرزہ خیز اور حیرت انگیز تھی۔ یاتریوں کی قطاروں میں سندھی تاجر اور جارجٹ نائلون کی ساڑھیوں میں ملبوس ان کی خواتین، ٹرانزسسٹر سنبھالے بانکے، چھیلے لڑکے، بوہرے، خوجے، پارسی، گجراتی، مرہٹے، پنجابی، ہندو اور مسلمان سب ہی رواں دواں ہانپتے کانپتے، بھکاریوں کے سامنے سکے پھینکتے، چوٹی کی طرف چڑھنے میں منہمک تھے۔

اوپر جا کر جنگل گھنا ہو گیا تھا۔ ایک ریستوراں میں چند منٹ سستا کر نوجوان پھر آگے بڑھا۔ ہر کٹھن چڑھائی کے بعد صاف ستھرے چائے خانوں میں زائرین کے گروہ چائے اور شربت سے تازہ دم ہونے میں مصروف تھے۔ نیچے گہری گھاٹیاں تھیں، اور لق ودق میدان کھیت۔ بہت دور عظیم الشان شہر تھا، اور سمندر، اور ساری دنیا۔

موہنی بالا کی ڈانڈی اب نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ ایک ریستوراں میں قوالی ہو رہی تھی۔ چاروں طرف درختوں میں چاند تارے والے ہرے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ نیچے ایک جھرنا گر رہا تھا۔ ایک کوڑھی چٹان پر لیٹا اپنے زخمی ہاتھوں سے روٹی کھانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ نوجوان چڑھائی کرتا رہا۔ اچانک ایک بھیانک آواز اس کے کانوں میں آئی "بڑے بڑے سیٹھ آئے —— ہو —— بڑے بڑے صاحب آئے —— —— ہو —— بڑے بڑے دھنی آئے —— ہو ——" یہ صدا چٹانوں سے ٹکراتی اور گونجتی اوپر بہت دور سے آ رہی تھی۔ اور اس کی یکسانیت ہولناک تھی۔ نوجوان نے متحیر ہو کر اسے سنا اور پھر آگے بڑھا۔

بہت سے موڑوں سے گزرنے کے بعد اس آواز کا سرچشمہ اچانک اس کے سامنے آگیا ـــــ وہ ایک بے حد لمبا فقیر تھا، جو شاید اپنی پلکیں کبھی نہیں جھپکاتا تھا۔ اور ایسا لگ رہا تھا گویا کسی قدیم مصری ممی کو سیدھا کھڑا کر کے اس کو کوک بھر دی گئی ہو اور وہ ممی بے تکان رٹے جا رہی ہو: "بڑے بڑے سیٹھ آئے ہو ـــــ بڑے بڑے ـــــ" اس نے گیروا چوغہ پہن رکھا تھا اور ایک اونچی خطرناک اور تنہا چٹان پر ڈنڈا سنبھالے اس طرح کھڑا تھا جیسے زائرین کے مقدر میں جو کچھ لکھا ہے اس کا پیغامبر ہو۔ یاتریوں کا جلوس چٹان کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ لمبے فقیر نے چند غریب یاتریوں کو نگاہِ غلط انداز سے دیکھا اور آسمان کی طرف منہ اٹھائے اپنی رٹ میں مصروف رہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک ہائی کلاس اور ناک چڑھا فقیر تھا اور ایک منفرد تکنیک اور شخصیت کا مالک ہونے کی وجہ سے ہما شما کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

پہاڑی کا راستہ ابھی آدھا طے ہوا تھا۔ ذرا اوپر جا کر نوجوان کو چند خوش باش بچیاں نظر آئیں جو سیڑھیوں کے کنارے کھیل کود میں مشغول تھیں۔

"اری کم بختو، کام کا وقت آگیا ـــــ" ان کی ماں نے جو دوسری چٹان کے نیچے کاسہ لئے بیٹھی تھی۔ زور سے انھیں ڈانٹا ـــــ لڑکیوں نے فوراً ہنسنا بند کر کے ایک درخت کے پیچھے سے چٹائی کا ٹکڑا اور ٹین کے خالی ڈبے نکالے اور چٹائی کنارے پر بچھا کر ہاتھ پھیلا دیئے ـــــ نوجوان کو یہ منظر دیکھ کر بے اختیار ہنسی آگئی ـــــ بچیوں کی چودہ پندرہ سالہ بڑی بہن نوجوان کو ہنستا دیکھ کر برا مان گئی اور ہونٹ نکال کر بسورنے لگی۔ نوجوان نے دس پیسے اس کے سامنے پھینکے اور سوچ میں ڈوبا آگے بڑھ گیا ـــــ اگلے ریستوران میں پہنچ کر اس نے لیمونیڈ کی ایک بوتل خریدی اور چھوکرے سے کہا کہ اسے نیچے لڑکی کو دے آئے ـــــ پھر وہ اور آگے بڑھا ـــــ راستے کی ڈھال پر ایک جھونپڑی نظر آرہی تھی ـــــ نوجوان اس کے نزدیک ایک پتھر پر سستانے کے لئے بیٹھ گیا۔ جھونپڑی میں ابھی صبح ہوئی

تھی خاتون خانہ چائے کے برتن دھو رہی تھیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر انھوں نے ایک ٹرنک میں سے ایک چیتھڑا ساری نکالی۔ اپنی ثابت ساری اتار کر گودڑ زیب تن کیا اور ایک رکابی میں سے بکری کا خون انگلیوں پر لے کر چہرے اور بانہوں پر زخموں کے نشان بنائے۔ اس دوران میں صاحب خانہ اپنے پیروں پر گندی پٹیاں باندھ چکے تھے پھر شہتیر میں سے بیساکھی اتار کر انھوں نے اپنے نونہالوں کو آواز دی : "منگو ــــ چھٹکو ــــ شبراتی ــــ ارے شبراتی بے غیرت کہاں ہے ؟"

ایک دس سالہ لڑکا منہ پھلائے جھونپڑے کے پچھواڑے بیٹھا گٹکے کھیل رہا تھا۔

"ابے آج کیا دھندے پر نہیں جانا ؟" والد نے گرج کر پوچھا۔

"ابا ــــ ابا ــــ یہ شبراتی کا بچہ کہتا ہے کہ آج سے بھیک نہیں مانگے گا۔ اسکول میں پڑھے گا اور کام کرے گا ــــ" بڑے لڑکے نے اندر سے آواز لگائی۔

والد نے باہر آکر شبراتی کے ایک تھپڑ رسید کیا "سالے موالی ــــ کبھی تیرے باپ دادا نے بھی کام کیا تھا جو تو کرے گا ناک کٹائے گا ؟ بدمعاش !" ایک اور تھپڑ پڑا تو بچے نے منہ پھاڑ کر رونا شروع کیا۔ متحیر نوجوان کو جھاڑی میں سے جھانکتا دیکھ کر اچانک والدہ دہاڑیں : "ارے کون ہے رے ؟"

"کچھ نہیں بڑی بی ــــ ذرا سستا رہا تھا۔" نوجوان نے گھبرا کر جواب دیا۔

"بڑی بی ! ارے بڑی بی ہوگی تیری ہوتی سوتی ــــ جوانا مرگ میں تجھے بڑی بی سجھائی دیتی ہوں ؟ صبو صبو آکر پرائی بہو بیٹیوں کو تاکتا ہے۔ انگار لگے تجھے ــــ"

"اری نیک بخت، چپ ہو جا اب۔" معقولیت پسند صاحب خانہ نے بیوی کو سمجھایا اور کراہتے ہوئے باہر نکلے۔

نوجوان لپک کر پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھ گیا۔

اب گہما گہمی بہت بڑھ گئی تھی۔ روضہ بالآخر قریب آچکا تھا۔ چائے خانوں میں بے حد

رونق تھی۔ پھولوں اور ہاروں کی دوکانیں خوشبو سے مہک رہی تھیں۔ بڑی بڑی دوکانیں دیوی دیوتاؤں، مکے مدینے اور اس درگاہ کی رنگین تصاویر، دیگر تبرکات اور اگربتیوں کے رنگین پیکٹوں سے جگمگا رہی تھیں۔ گلیوں میں تازہ چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ لنگر تقسیم ہونے والا تھا۔ فوجی جوانوں کی ایک ٹولی "حاجی بابا کی جے" کے نعرے لگاتی روضے کے صحن سے برآمد ہوئی اور مارچ کرتی نیچے اتر گئی دوسری طرف سے اسکول کے بچوں کا ایک گروہ آرہا تھا۔ ان کے ماسٹر دھوتی باندھے، ماتھے پر تلک لگائے "حاجی بابا کی جے" بولتے اور رٹھنے لگے۔ مزار کے صحن میں بھیڑ لگی تھی۔ عود و لوبان سے بوجھل اس فضا میں برہمن مُجاور کی لڑکیاں نوگزی مرہٹی ساڑیاں پہنے روضے کی کنجیاں سنبھالے ایک نقشین دروازے سے نکل کر دوسرے دروازے میں داخل ہوگئیں۔ نوجوان جو خود کو ملحد سمجھتا تھا، صحن سے نکل روضے کے عقب میں جانکلا، جہاں گھنے درختوں کی چھاؤں میں چند مزار تھے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پہاڑی کے پچھلے ڈھال پر درختوں کے کنج میں چھپی ہوئی کٹیوں میں مسلمان بزرگ اور ہندو یوگی خاموشی اور یکسوئی کے عالم میں عبادت اور مراقبے میں مصروف تھے۔ نوجوان کو پھریری سی آئی۔ ایک دنیا یہ بھی ہے —— اس نے سوچا۔

"تم چوٹی پر پہنچ کر بہت حیران نظر آتے ہو!" کسی نے اسے مخاطب کیا۔

اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ نورانی چہرے اور سفید داڑھی والے ایک بزرگ ایک کٹیا سے نکل کر پہاڑی چشمے کی طرف جاتے ہوئے اس کے سامنے ٹھٹھک گئے تھے۔ ان کے پس منظر میں ایک مہیب چٹان استادہ تھی۔

"جی —— جی نہیں تو ——" نوجوان نے ذرا جھینپ کر کہا "مگر یہ پہاڑ خاصا حیرت انگیز ہے"۔

"دنیا کی کون سی چیز حیرت انگیز نہیں —— زندگی، موت، دکھ، سکھ، عورت مرد، ہر شے اسرار ہے۔ اور کوچ کا نقارہ دن رات بج رہا ہے"۔

"پھر کرنا کیا چاہئے؟"

"بے تعلقی ـــــ"

نوجوان نے ایک لمحے کے لئے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اور اس کی ویران زندگی سراب کے ریلے کے مانند اس کے سامنے سے گزر گئی۔ وہ کالج سے نکل کر کلرک بھی نہیں بن سکا تھا، اور اس کی بچپن کی محبوبہ، کانتا دیوی کے نام سے مشہور ہیروئن بن چکی تھی۔ وہ اپنا قصبہ چھوڑ کر اس کے پیچھے اس شہر تک آیا تھا۔ مگر کانتا اب اسے پہچاننے سے منکر تھی۔ ہانپتی کانپتی وہ شہرت اور کامیابی کے پہاڑ کی اس چوٹی پر پہنچ چکی تھی جہاں موہنی بالا پہلے سے براج مان تھی۔ ماضی کی وہ سیدھی سادی بھولی لڑکی جو اب کانتا دیوی کہلاتی تھی۔ اس کے شب و روز آج کل محض موہنی بالا کو نیچا دکھانے کی فکر میں گزر رہے تھے۔ موہنی بالا کی ممی اور مس کانتا دیوی کی ممی دونوں وقتاً فوقتاً پریس کو ایک نہ ایک بیان دیتی رہتی تھیں۔

نوجوان نے آنکھیں کھولیں تو بزرگ عصا ٹیکتے چشمے کی طرف چل پڑے تھے۔

"سب دل کے بہلاوے اور پریوں کی کہانیاں ہیں ـــــ" نوجوان نے ذرا تلخی سے انھیں آواز دی۔

"کیا ـــــ؟" انھوں نے ٹھٹھک کر دریافت کیا۔

"یہی سب ـــــ یہ درگاہ، اور یہ سارا چکر۔ بے تعلقی کا فلسفہ بھی میرے لئے اتنا ہی بے معنی ہے جتنی یہ روایت کہ یہ پہاڑ حاجی بابا کے ایک نعرے سے تین حصہ زمین میں دھنس گیا تھا۔"

بزرگ نرمی سے مسکرانے لگے۔ نوجوان کو احساس ہوا کہ وہ ان کے ساتھ بے ادبی سے پیش آیا ہے۔ آخر بوڑھے آدمی تھے۔ لہٰذا ان کا دل رکھنے کے لئے اس نے کہا "وہ سامنے والی چوٹی کیسی ہے؟ بڑی عجیب سی شکل کی چٹان ہے جیسے دیوتی بیٹھی ہو ـــــ"

"یہ چٹان بھی" بزرگ نے کنج کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا "پہلے ایک عورت

تھی" پھر وہ درختوں میں غائب ہو گئے —— نوجوان گہرا سانس لے کر پھر پہاڑی کے بارونق حصے کی طرف مڑا۔ اب ایک شخص نے جسے نوجوان مجاور سمجھا اس کا پیچھا کیا۔

"آپ یہاں کے مجاور ہیں ؟ مگر افسوس ہے کہ میرے پاس نذر دینے کے لئے کچھ نہیں ہے" نوجوان نے کہا۔

"مجاور میں نہیں ہوں صاحب۔ اگلے وقتوں کے برہمن راجہ کی اولاد یہاں کی مجاور ہے —— ماچس ہو گی —— ؟"

نوجوان نے سگریٹ کا سارا پیکٹ اسے تھما دیا۔

"صاحب ——" اس آدمی نے نوجوان کو ذرا غور سے دیکھتے ہوئے کہا" اگر بھوک لگی ہو تو چل کر لنگر میں کھا لیجئے —— میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں"۔

"نہیں ——" نوجوان نے تقریباً گرج کر جواب دیا۔

"آپ بڑے پریشان سے نظر آرہے ہیں"۔ اجنبی نے ڈھٹائی سے کہا۔ نوجوان نے غیر ارادی طور پر اپنی پتلون کی جیب پر ہاتھ پھیرا مگر فاؤنٹن پن ابھی موجود تھا۔

"کبھی صندل کے موقعے پر آئیے ——" اجنبی کہتا رہا۔ شاید نوجوان نے اسے غلط سمجھا تھا —— "بابا کی پالکی سارے پہاڑ کا گشت لگاتی ہے۔ بڑی زبردست آتش بازی ہوتی ہے، رات کو شیر ببر آتا ہے ہندو مسلمان بڑی عقیدت سے حاضری دیتے ہیں ——"

"یہی ہندو مسلمان شہر واپس جا کر جب بلوہ ہوتا ہے تو ایک دوسرے کو چھرا بھی مارتے ہیں ——" نوجوان نے اکتا کر کہا اور جلدی سے واپس مڑ گیا۔ اجنبی سر ہلا کر آگے بڑھا اور ایک موٹی سیٹھانی کے تعاقب میں مصروف ہو گیا۔

"جانے کون تھا یہ شخص۔ میری طرح بے کار، آوارہ، بے مقصد —— کیا عجیب جگہ ہے یہ فقیروں کی پہاڑی —— کمال ہے ——" نوجوان نے سوچا۔

○

○

پہاڑی سے اترتے وقت مصری ممی یعنی لمبے فقیر کی آواز اسی طرح سنائی دی۔ راستے پر پڑتا ہوا اس کا سایہ ڈوبتے سورج کی روشنی میں اب بے حد طویل اور لرزہ خیز معلوم ہو رہا تھا۔ دوسرے فقیروں کی چادروں پر سکوں کی ڈھیریاں بن چکی تھیں۔ یاتری تھکے ہارے، بیمار مضطرب، آسودہ، صحت مند، مسرور، پر امید اور جذبۂ عقیدت سے سرشار اب قطار اندر قطار واپس اتر رہے تھے۔ نوجوان جواب بہت زیادہ تھک چکا تھا، نشیب میں پہنچ کر ایک مختصری خاصی آرٹسٹک جھونپڑی کے برآمدے میں ٹھک گیا۔ جس کے کنارے پر کاسہ بڑی نفاست سے رکھا ہوا تھا۔ سرمگیں آنکھوں اور سرخ داڑھی والے ایک بڑے میاں کشکول کے پیچھے بیٹھے تھے۔ انھوں نے لیمن ڈراپس، بتاشوں اور چنوں کا ایک بہت ہی مختصر سا خوانچہ بھی لگا رکھا تھا۔ ایک سفید صاف ستھری تولیہ کھونٹی سے ٹنگی تھی۔ اندر سے ایک جوان عورت ساری سے سر ڈھانپے برآمدے میں آئی اور کاسے کے پیچھے گویا اپنے آفس ڈیسک پہ بیٹھ گئی۔ اندر تیل کے کے اسٹوو پر کیتلی چڑھی ہوئی تھی۔

"آپ یہاں کب سے ہیں"۔ نوجوان نے دو آنے کے چنے خریدتے ہوئے دوستانہ لہجے میں سرخ داڑھی والے سے دریافت کیا۔

"بیس سال ہوگئے"۔

"آمدنی اچھی ہو جاتی ہے؟ میرا مطلب ہے آپ کی اس دوکان سے"۔

"مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے مگر اللہ کا شکر ہے"۔ نوجوان پر شک بھری نظر ڈال کر انھوں نے جواب دیا۔

"انگار لگے اس آمدنی کو ——" جوان عورت بڑبڑائی۔

سرخ داڑھی والے نے مسکرا کر عورت کو دیکھا۔ "یہ میری دوسری زوجہ ہیں۔ یہاں ان کا دل گھبراتا ہے۔ کہتی ہیں شہر میں چل کر رہو"۔

"برسات میں یہاں مشکل پڑتی ہوگی ـــــ" نوجوان نے اظہار خیال کیا۔

"جی ہاں۔ برسات میں زائرین بھی نہیں آتے۔ اور سانپ بچھو بھی بہت ہوتے ہیں۔ میری جوان بیاہی لڑکی کا انتقال ہوگیا پچھلے سال۔ تب سے میرا دل بھی یہاں سے اچاٹ ہوگیا ہے۔ مرحومہ سامنے والی جھونپڑی میں رہتی تھی۔ میں نے بیاہ کر رخصت کیا بھی تو اس طرح کہ نظروں کے سامنے رہے۔ کلیجے کو ٹھنڈک رہے ـــــ ایک بچہ اپنی نشانی چھوڑا غریب نے۔" انھوں نے ایک چھنگلیا سے پلکیں خشک کیں۔ گھنے اندھیرے درختوں میں بسیرا لینے والے پرندوں نے چہچہانا شروع کر دیا تھا۔

نوجوان بہت متاثر ہوا۔ شاید مدتوں سے کسی نے اس طرح بیٹھ کر اس بوڑھے شخص سے اس کا دکھ درد نہ سنا تھا۔

"ارے ـــــ محمد اکرم ـــــ" بوڑھے نے آواز دی۔ پھر نوجوان سے کہا "میری بچی کا شوہر ـــــ جی ہاں ـــــ وہ بھی ـــــ یہی کام کرتا ہے۔"

سامنے کی جھونپڑی سے گیروا کرتا پہنے، تسبیح پھراتا اور ذرا لنگڑا کر چلتا ہوا ایک جوان اور بے حد صحت مند فقیر قریب آیا۔ اس نے بھی نوجوان کو شبہ کی نظروں سے دیکھا۔ مہندی رچی داڑھی والے بڑے میاں نے بیوی کو اشارہ کیا۔ وہ اندر سے چائے بنا کر لائی اور ایک پیالی نوجوان کو پیش کی۔

ایک قبول صورت لڑکی چار سالہ بچہ گود میں اٹھائے درختوں میں سے نمودار ہوئی۔ اور سرخ پٹوں والے کو مخاطب کیا۔ "لو سنبھالو اپنے نواسے کو ماموں۔ میں روٹی پکانے جارہی ہوں۔ مبارک ہو آج نواسے نے تین روپے کمائے ہیں۔"

لڑکی نے بچے کو سائبان میں ٹکا کر بڑے سلیقے سے ڈیڑھ روپے کی ریزگاری ماموں کے حوالے کی اور ڈیڑھ روپیہ ساری کے آنچل میں باندھ کر اٹھلاتی ہوئی نیچے اتر گئی۔

"سارا کنبہ یہیں ہے ماشاء اللہ؟" نوجوان نے ذرا رشک سے پوچھا۔

"جی ہاں ــــ یہ میری بھانجی تھی۔ بڑی سگھڑ بچی ہے۔ میری ہمشیرہ اور بہنوئی وہ نیچے والی جھونپڑی میں رہتے ہیں ــــ بہنوئی ــــ نابینا ہیں"۔

نوجوان اٹھ کھڑا ہوا، اور اس مہربان اور ہنرمند کنبے کو خدا حافظ کہہ کر اور نیچے اترا۔

○

سورج کی نرم اور ترچھی کرنوں نے ڈالیوں میں سے چھن چھن کر ماحول کو دفعتاً زیادہ پراسرار بنا دیا تھا۔ فقیر اپنے مقررہ ٹھکانوں سے اٹھ رہے تھے۔ چٹائیاں لپیٹی جا رہی تھیں۔ کوڑھی اور اپاہج اسی طرح پڑے تھے۔ اتنے میں ایک مرہٹی عورت اودا کاشٹہ باندھے، کیک بسکٹ کا بکس سر پر اٹھائے تیز تیز قدم رکھتی پگڈنڈیوں پر نمودار ہوئی ہر بھکاری کے سامنے جا کر اس نے بکس اتارا۔ بھکاریوں نے خاموشی کے ساتھ اس سے سستی خشک ڈبل روٹیاں اور بسکٹ خریدے۔ عورت نے ان سے پیسے لئے اور دوسرے فقیروں کی طرف چلی گئی۔

چنانچہ سب ہی خوش حال نہیں تھے۔ بیشتر اپاہج آسمان کے نیچے لیٹے خشک باسی ڈبل روٹی پر گزر کر رہے تھے۔

نوجوان آخری سیڑھیاں پھلانگتا نیچے پہنچا، ایک بار پلٹ کر اس نے پہاڑی پر نظر ڈالی اور باہر نکلا۔ جوہڑ کے پرے، سرخ بالوں والا زنانہ ایک بنچ پر چپ چاپ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ موٹریں اور لاریاں روانہ ہو رہی تھیں۔ (موہنی بالا ابھی کب کی غائب ہو چکی تھی) کل صبح تک کے لئے پہاڑی خاموشی اور اندھیرے میں ڈوب چکی تھی۔

نوجوان نے پنواڑی کی دوکان سے دس پیسے کا ان لینڈ لیٹر خریدا اور ریستوراں کے بڑے چھپر میں پہنچ کر بنچ پر بیٹھ گیا اور خط لکھنا شروع کیا۔

والدہ صاحبہ، تسلیم

مجھے اطلاع ملی تھی کہ یہاں ایک ریستوراں میں کیشیر کی جگہ

خالی ہے، لیکن صبح جب میں یہاں پہنچا تو معلوم ہوا وہ جگہ بھر چکی ہے۔
بہرحال آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اس شہر میں تین سال بے کار رہنے اور دھکے کھانے کے بعد آج بالآخر ایک نہایت اچھا کاروبار میری سمجھ میں آگیا ہے۔ بہت آرام دہ کام ہے، اور آمدنی بھی امید ہے معقول ہوگی۔
قیام وطعام کا انتظام مناسب اور فضا بارونق ہے۔ میرے رفیقِ کار، ہنر مند، اہلِ فن بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سچّے فن کار ہیں۔
اپنا پتہ آئندہ خط میں لکھوں گا۔

آپ کا تابعدار بیٹا

○

چند روز بعد "مصری ممی" نے بڑے غصّے سے دیکھا کہ مقابل کی چٹان ایک سیاہ داڑھی مونچھ اور پٹوں والے بارعب فقیر کا مسکن بن چکی ہے جو لمبا کرتا اور سفید کنٹوپ پہنے تسبیح ہزار دانہ پھیرتے ہوئے گرج دار آواز میں مجذوبانہ نعرے لگا رہے ہیں اور ریزگاری کا ڈھیر ان کے قدموں میں لگ چکا ہے۔ جب سیٹھوں کی ٹولی سامنے سے گذرتی ہے تو وہ دلدوز آواز میں:

زر کی جو محبت تجھے پڑ جائے گی بابا
دکھ اس میں تری روح بہت پائے گی بابا

پڑھتے ہیں۔ عوام کے لئے ؎

دنیا کے امیروں میں یاں کس کا رہا ڈنکا
نت بھنگ پی اور عاشق دن رات بجا ڈنکا

موجود ہے۔ اپ ٹو ڈیٹ یاتریوں کے سامنے بے نقط کی اڑنگ بڑنگ انگریزی اڑانا شروع کردیتے ہیں اور دفعتاً جب جذب طاری ہوتا ہے تو نعرہ لگاتے ہیں: "سب بکواس، کھاؤ گھاس،

کردوں تیراستیاناس۔ پلادوں جوتے کا کمیچر ——— بولو کون بھوانی ———"

نوچندی جمعرات کو جب مس کانتا دیوی چادر چڑھانے کے لیے درگاہ جاتے ہوئے سامنے سے گزریں تو شاہ صاحب ڈنڈا ہوا میں لہرا کر حسب عادت چلائے "بولو کون بھوانی ——— کانتا نے دہل کر سر اٹھایا اور اوپر اونچی چٹان پر کھڑے شاہ صاحب کو دیکھا۔ شاہ صاحب فرماتے رہے، "ایمان پاک۔ آدمی بیباک ——— حق اللہ۔ پاک ذات اللہ ———"

کانتا دیوی ایک کمزور دل خاتون تھیں۔ ذرا سہم کر آگے بڑھنے لگیں تو شاہ صاحب گرجے: "احد ہما الابتلا بافراط خاصتہ من الشراب ——— کھڑا کھیل فرخ آبادی ———"

کانتا دیوی لرز کر ٹھٹھک گئیں۔ ان کے سوا کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کی ممی کسی زمانے میں فرخ آباد کی رنگریزن تھیں۔ کانتا دیوی سر ڈھانپ کر اور ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ اب شاہ صاحب پر حال آ چکا تھا اور وہ جھوم جھوم کر قوالی کا ایک مصرع دہرا رہے تھے ———

ع : اخلاص کے رنگ میں رنگ دے پکا لال ہے رنگریجوا

کانتا دیوی مبہوت ہو کر انھیں دیکھتی رہیں۔ شاہ صاحب نے ان کی طرف سے بے پرواہ ہو کر اپنی بڑ ہانکنی شروع کی۔ "دریا کی لہر ——— اللہ کا قہر ——— ہنڈیا میں چڑھا ——— جوتے کا کمیچر پلا ———"

مس کانتا دیوی کی آنکھیں بھر آئیں۔ ان کا سب سے بڑا پروڈیوسر جو ہر وقت ان کی خوشامد میں لگا رہتا تھا۔ ان دنوں ایک بہت "بڑی" پکچر کے لئے مس موہنی بالا سے کنٹریکٹ کر چکا تھا۔

شاہ صاحب نے سریلی آواز میں یک لخت گانا شروع کر دیا۔

ہمارے شمس آباد میں دو گھوڑے رہتے تھے
ڈبکو ڈبکو می کند، از یک تو جہ پار کن

سمجھنے والے کے لئے مجذوب کا اشارہ کافی ہے۔ مس کانتا دیوی سر جھکا کر کھڑی ہوگئیں۔ تب شاہ صاحب نے آنکھیں کھول کر نعرہ لگایا "مچھلی بیچے گی ——"

"حضور، میرے لیے کوئی حکم —— ؟" کانتا دیوی نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائے بغیر پوچھا۔

"مچھلی بیچے گی"۔ شاہ صاحب نے دہرایا۔

"کون حضور —— ؟"

"وہی —— اور کون ——"

کانتا دیوی نے جلدی سے ان کے پاؤں چھونا چاہے۔ مگر انھوں نے پیچھے ہٹ کر کہا

"دھت —— بھاگ جا عورتیا ——"

"شاہ صاحب ——"

"پیر ہٹیلے کا مرغا ——"

"جی شاہ صاحب ؟"

"پیر ہٹیلے کا مرغا ——"

کانتا دیوی ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گئیں۔ مگر فوراً ہی انھیں یاد آگیا کہ فرخ آباد میں ان کے محلے کی عورتوں کے ہاں بارہ مہینے نذر نیاز کا سلسلہ رہتا تھا —— شیخ سدّو کا بکرا —— پیر دین دار کا کونڈا —— مشکل کشا کا دونہ —— شہید کا ملیدہ —— حضرت عباسؑ کی حاضری —— بی بی کی پڑیا —— پریوں کا طبق —— پیر ہٹیلے کا مرغا —— کانتا دیوی کی ممی لطیفن بوا بھی ایک زمانے میں مسجد کے طاق بھرا کرتی تھیں۔ یوروپ کے سفروں اور فلمی مصروفیات سے بھرپور موجودہ زندگی میں مس کانتا دیوی کو یہ سب کہاں یاد رہ سکتا تھا —— مگر شکر کہ اس وقت یاد آگیا۔ انھوں نے فوراً سو روپے کا نوٹ نکال کر شاہ صاحب کے قدموں میں رکھا ——

"بھاگ جا عورتیا ـــــ دھت ۔ ہٹ ہٹ ہٹ ـــــ" شاہ صاحب نے آنکھ بند کر کے ڈانٹ بتائی ۔ مس کانتا دیوی نے ادب سے ان کو تسلیم کی اور خوش خوش آگے چلی گئیں ۔

شاہ صاحب نے اپنے ذغل کی جیب میں سے وہ نوٹ بک نکالی جس میں انھوں نے اپنی والدہ کو خط لکھ کر سارے پیروں کی نذر نیاز کی تاریخیں منگوا کے درج کر لی تھیں ـــــ شاہ صاحب نے نوٹ بک کے ایک کالم میں ایک نشان بنایا اور پاؤں کے انگوٹھے کے ذریعے نوٹ گدڑی کے نیچے سرکائے ۔ بعدہٗ بھجن گانے میں مصروف ہو گئے ۔ مارواڑیوں کی ایک ٹولی پہاڑی کی سیڑھیاں طے کرتی اوپر آ رہی تھی ۔

اکثر اس طرح سے بھی رقصِ فغاں ہوتا ہے

رات گئے، شہر کے نیلگوں اندھیرے میں دور کہیں ایک سریلی دل دوز پاٹ دار آواز بلند ہوتی ہے "کبھی ہم میں .... تم میں بھی راہ تھی .... تمھیں یاد ہو .... اجی کہ نہ یاد ہو..." رفتہ رفتہ یہ صدا دور ہوتی ہے اور نجن میاں اپنے خوبصورت گھر کی آرام دہ خواب گاہ میں پلنگ پر کروٹ بدل لیتے ہیں اور چپ چاپ پڑے دیوار کو تکتے رہتے ہیں۔ نجن میاں کی چہیتی بیوی رقیہ بچے کے رنگین گجراتی پنگوڑے کی ڈوری پر ہاتھ رکھے رکھے سو جاتی ہے، کلاک کی ہری سطح پر سفید سوئی آگے سرکتی رہتی ہے۔ رات یوں ہی گزر جائے گی۔

نجن میاں لیڈر، فلسفی، شاعر، ادیب، ایکٹوول، ہیرو، کچھ بھی نہیں ہیں، بے حد معمولی، غیر معروف، سیدھے سادے آدمی ہیں، مگر کیا ایک سیدھا سادا آدمی زندگی کی ناقابل فہم بھول بھلیاں پر غور نہیں کر سکتا؟ نجن میاں ایک مرنجان مرنج انسان ہیں (ان کا اصلی نام جان کر کیا کیجئے گا) اٹھارہ برس سے بمبئی میں ملازم ہیں۔ ماموں کی بیٹی سے بیاہ ہوا ہے۔ تین بچے ہیں۔ بڑا لڑکا علی گڑھ میں پڑھ رہا ہے۔ منجھلی لڑکی میٹرک میں ہے۔ چھوٹا بچہ ابھی شیر خوار ہے۔ نجن میاں کا بقیہ کنبہ "وطن" یعنی شمالی ہند میں رہتا ہے۔ دو سال میں ایک بار جا کر وہ سب سے مل آتے ہیں۔ زندگی آرام سے کٹ رہی ہے — نجن میاں

ان لاکھوں انسانوں میں سے ہیں جو صبح کو بسوں اور لوکل ٹرینوں میں بیٹھے دفتر جاتے نظر آتے ہیں۔ شام کو سنیما دیکھ لیتے ہیں اور اتوار کے روز بیوی بچوں کے ساتھ آرے کولونی کی سیر کر آتے ہیں۔ نجن میاں کی زندگی کی کہانی میں کوئی خاص بات نہیں۔

○

نجن میاں جب آج سے اکیس سال پہلے علی گڑھ میں پڑھتے تھے تو ایک بار گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے ہاں رائے بریلی چلے گئے۔ ماموں کی لڑکی رقیہ سے ان کی ٹھیکرے کی مانگ تھی اور وہ ان سے پردہ کرتی تھی۔ نجن میاں اس رشتے سے بہت خوش تھے، اور آج بھی خوش ہیں، اور وہ بیس سال کی رفیق اس کھڑکی کے نیچے بستر پر لیٹی غنودگی کے عالم میں بچے کا گجراتی پالنا جھلا رہی ہے۔ باہر ناریل کے پتے سرسرا رہے ہیں۔ دیوالی آنے والی ہے محلے کے بچے "ایٹم بم" چلاتے چلاتے تھک کر اپنے اپنے گھروں میں سو چکے ہیں۔ رات بڑی سنسان ہے۔ اتنے بڑے بھیانک پرچھائیوں کے شہر کو سانپ سونگھ گیا ہے۔

نجن میاں کے ماموں کی کوٹھی رائے بریلی کی سول لائنز میں تھی۔ (ماموں سب جج تھے اور حال ہی میں تبدیل ہو کر لکھیم پور کھیری سے رائے بریلی آئے تھے) رقیہ نے پردہ کر کے بور کر رکھا تھا اور ماموں کے باقی بچے خرد سال تھے۔ نجن میاں جب گھر میں پڑے پڑے اکتا جاتے تو سائیکل اٹھا کر سایہ دار سڑکوں پر سے گزرتے دیہات کی طرف نکل جاتے اور سنسان راستوں پر پہنچ اونچی آواز میں گانا شروع کر دیتے۔ انھیں موسیقی کی دھت تھی۔ علی گڑھ کی نمائش میں اکثر لاوڈ اسپیکر پر گایا کرتے تھے۔ کلاسیکل میوزک بھی سیکھ رکھی تھی۔

ایک روز نجن میاں اسی طرح سائیکل پر ہوا خوری کرتے، بشاش و تر و تازہ، شہر سے بہت دور آموں کے باغ میں پہنچ گئے۔ بادل گھر آئے تھے اور بارش آنے والی تھی۔ نجن میاں سائیکل سے اتر کر ستانے کے لئے باغ کی سمت بڑھے۔ وہاں انھیں ایک پرانی باؤلی نظر آئی۔ باؤلی کی منڈیر پر ایک بہشتی چپ چاپ اکڑوں بیٹھا چلم پی رہا تھا۔

نزدیک ہی برگد کے نیچے کسی فقیر کا تکیہ تھا اور ایک بزرگ کھاٹ پر بیٹھے کبوتروں کو دانہ ڈال رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر نیا پختہ کنواں تھا اور رہٹ چل رہا تھا۔

باؤلی کے قریب پہنچ کر نجن میاں نے ارادہ کیا کہ بہشتی سے ایک کٹورا پانی مانگیں کہ اچانک آم کے جھنڈ میں سے کوئل کی کوک جیسی ایک آواز بلند ہوئی اور رام پوری چاقو کی طرح سیدھی ان کے دل میں اترتی چلی گئی۔ اور وہ گیت بھی کیا تھا ـــــ دقیانوسی۔ "چھا رہی کالی گھٹا... اجی ہاں.... چھا رہی کالی گھٹا.... جیا مورا لہرائے ہے"۔

نجن میاں نے مبہوت ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ سوتے سوتے بھیگے بھیگے سناٹے میں باغ کے پتے پتے کو نیند سی آ رہی تھی۔ نجن میاں نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ جدھر سے گیت کی آواز بلند ہو رہی تھی ـــــ باؤلی اور پگڈنڈی کے درمیان ایک ہری بھری کھائی سی تھی جس میں چولائی کے پودے اگ آئے تھے۔ کھائی کی دوسری طرف سنسان کچی سڑک کے کنارے ایک بھورا مکان کھڑا تھا۔ مکان کے پچھواڑے کی دیوار سڑک کے رخ پر تھی۔ اس دیوار میں کائی لگے پرنالوں کے درمیان چار ہرے روشندان نظر آ رہے تھے۔ باہر سے صرف یہ روشن دان ہی دکھائی دیتے تھے ـــــ جس طرح ہمیں کبھی نہیں معلوم ہو سکتا کہ دوسرے انسانوں کی زندگیوں کے اندر کیا کچھ گزرتا رہتا ہے۔

گیت اسی روشن دانوں والے کمرے میں گایا جا رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکی اور دروازہ پہلو میں ایک شکستہ چبوترے پر کھلتا تھا۔ دروازے پر چق پڑی تھی۔ چبوترے کے برابر آنگن کی اونچی دیوار تھی اور ڈیوڑھی۔ ذرا فاصلے پر احاطے کے پیچھے، نم صحن کے ایک کونے میں شاگرد پیشہ تھا۔ اس کے صحن کی دیوار پر باہر ایک مشک کھونٹی پر ٹنگی تھی۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ صحن کے اندر بٹل کی نارنگیوں کا پیڑ کھڑا تھا۔ احاطے کے پیچھے آم کا گھنا باغ۔

گیت دفعتاً تھم گیا۔ چند لمحوں بعد گانے والی نے ایک اور دقیانوسی غزل شروع

کر دی۔ جو ایک زمانے میں گلی کے لونڈے گاتے پھرتے تھے "وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا۔۔۔۔ اجی تمھیں۔۔۔۔" نجن میاں ٹھٹھک کر سنا کئے۔

گھٹائیں جھوم کر اٹھیں اور چھما چھم مینہ برسنا شروع ہو گیا۔ نجن میاں گھبرا کر ایک چھتنار درخت کے نیچے ہو لئے۔

"سنو ذکر ہے کئی سال کا ——"

"حق اللہ!" درگاہ کی طرف سے ایک جگر پاش نعرہ بلند ہوا نجن میاں نے چونک کر اس طرف دیکھا، اور پھر بھورے مکان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی۔۔۔۔۔"

بھورا مکان، ہرے روشن دان آندھی آنکھوں کے ایسے، بتول کی نارنگیوں کا پیڑ، آم کے جھنڈ، باؤلی اور تکیہ اور برگد ——

سب ایک ناقابل برداشت نحوست، ویرانی اور الم کی دھند میں لپٹے پانی میں بھیگا کئے ——

"کبھی ہم بھی تم بھی تھے ——"

بارش کا زور ذرا کم ہوا۔ نجن میاں سر جھکائے سائیکل کی طرف بڑھے اور سول لائنز روانہ ہو گئے۔

رات بھر وہ آواز نجن میاں کے حواس پر چھائی رہی۔ دوسرے روز دوپہر کو انھوں نے پھر اس گاؤں کا رخ کیا۔ آدھے راستے میں انھیں بارش نے آلیا۔ نجن میاں بھیگتے بھاگتے باؤلی پر پہنچے، سامنے مکان خاموش پڑا تھا۔ نہ بہشتی، نہ کبوتر والے بزرگ، نہ وہ الوہی کی آواز۔ ہو کا عالم طاری تھا۔ میاں پسینہ پسینہ ہو گئے۔ اب ان پر انکشاف ہوا کہ وہ اس آواز پر عاشق ہو گئے ہیں۔ مغنیہ کون ہے۔ اس سے ان کو کوئی غرض نہ تھی۔ گرہستن؟ پتریا۔ میراثن یا ڈومنی؟ —— نجن میاں حیران پریشان باؤلی کی منڈیر پر بیٹھے رہے اور گھنٹہ

بھر بعد بے نیل و مرام واپس گھر آگئے۔

تیسرے روز سہ پہر کو نجّن میاں گانا سننے کی امید میں پھر وہاں جا پہنچے۔ جی میں سوچ لیا تھا کہ اگر کسی نے پوچھا کہ روز کیوں آتے ہو تو کہہ دیں گے درگاہ پر منت ماننے آتے ہیں۔ اتنے میں گانے کی آواز پھر بلند ہوئی۔ سنگیت کے بچے رسیا نجّن میاں بے اختیار کھنچے ہوئے جا کر مکان کی دیوار کے نیچے کھڑے ہو گئے لڑکی نے انترہ اٹھایا تو نجّن میاں جھنجھلا گئے ——

"بی بی ماتیبر لگاؤ —— تیبرا" انھوں نے ڈپٹ کر کہا۔

اس ڈانٹ پر کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھلا، دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں نے درز میں سے جھانکا اور پٹ زور سے بند ہو گیا۔ خاموشی چھا گئی —— نجّن میاں نے ذرا نڈر ہو کر آہستہ سے دستک دی۔ "بی بی قدرت نے تمھارے گلے میں نور بھر دیا ہے۔ بس ذرا سرگم پر محنت کر ڈالو ——" انھوں نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا۔

کوئی جواب نہیں ملا۔ نجّن میاں چند منٹ تک دیوار کے نیچے کھڑے رہے، پھر باؤلی کی سمت چل پڑے۔ ایک بار پلٹ کر دیکھا کھڑکی بدستور بند تھی۔ ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر بہشتی شاگرد پیشے سے نکلا اور باؤلی پر آ کر ڈول بھرنے میں مصروف ہو گیا۔

"سلام علیکم۔" نجّن میاں نے کہا۔

"وائے کم سلام۔" بہشتی نے جواب دیا۔ اس کی دونوں ہتھیلیاں اور ساری انگلیاں زخمی تھیں اور زخم بہت بھیانک معلوم ہو رہے تھے۔

"تمھارے ہاتھوں کو کیا ہو گیا ہے میاں بہشتی؟" نجّن میاں نے سگریٹ جلاتے ہوئے پوچھا۔ قریب کے کنوئیں کا پانی شرشر کرتا شفاف نالیوں میں سے گزر کر باغ میں جا رہا تھا۔

"ساری عمر رسّے کی رگڑ لگتی رہی ہے میاں"۔ بہشتی نے چرخی پر سے رسّہ کھینچ کر ڈول باہر نکالتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا، اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ گویا

پہلی بار اپنے زخم اسے نظر آئے ہوں۔ اس کے بعد اس نے نجّن میاں پر نظر ڈالی"۔ میاں آپ تو کل پرسوں بھی ادھر آئے تھے۔ کیا کام ہے؟"

"کچھ نہیں ــــ میں نے سنا تھا یہ ــــ یہاں درگاہ پر ایک شاہ صاحب رہتے ہیں ــــ

"ہاں۔ ہاں ــــ حاجی کبوتر شاہ۔ وہ سامنے بیٹھے ہیں چھپّر تلے ــــ چلے جائیے۔ مگر آج کون دن ہے ــــ جمعرات؟ وہ آج کسی سے بولتے چالتے نہیں۔ افطار کے بعد سیدھے مراقبے میں چلے جائیں گے ــــ" بہشتی نے مشک بھری۔ اسے پھرتی سے پیٹھ پر لادا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ نجن میاں کی ہمت نہ پڑی کہ اس مکان کے باسیوں کا کچھ اتہ پتہ لگا سکیں۔ بہشتی بھورے مکان کی طرف بڑھ گیا۔ نجّن میاں جھنجھلاتے ہوئے تکیے کی طرف بڑھے۔ شاہ صاحب منڈیر پر بیٹھے تسبیح پھیر رہے تھے۔ نجّن میاں قریب جاکر بظاہر بڑی عقیدت سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ شاہ صاحب تسبیح پھرایا کئے۔ نجن میاں عاجز آکر کچھ دیر بعد گھر لوٹ آئے۔

چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔ دو تین روز بعد نجّن میاں پھر آم کے باغ پہنچے (اس گاؤں کا نام کریم گنج تھا) اور مکان کے نیچے جاکر سائیکل کی گھنٹی بجائی۔ کھڑکی ذرا سی کھلی اور پھر بند ہوگئی۔ عجیب بات تھی۔ کیا اس مکان میں بھوت رہتے تھے۔؟ کوئی آدم زاد نظر ہی نہیں آتا تھا ــــ نجّن میاں آخر علی گڑھ کے کھلنڈرے تھے۔ کھڑکی کے قریب جاکر کہا:

"بی بی ہم تمھاری آواز کے مرید ہیں۔ ایک گلاس پانی بھجوادو"۔

"ادھر دروازے پر آجائیے"۔ اندر سے جواب ملا۔

نجّن میاں گھوم کر دروازے پر پہنچے۔ کواڑ ذرا سا کھلا۔ مرادآبادی کٹورا سرکا کر باہر رکھ گیا۔ نجن میاں ہاتھ تک کی جھلک نہ دیکھ سکے۔ پانی پی کر انھوں نے پوچھا" گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟"

"ابا اماں ہیں ــــ اور کون ہوتا؟"

"تمھارا نام کیا ہے بی بی؟"

"جمال آرا" ساتھ ہی تلخ سی ہنسی۔

"گانا کس سے سیکھتی ہو؟"

"کسی سے بھی نہیں! مجھے گانا سکھانے کون آئے گا؟"

"گھر میں گراموفون ہے؟"

"ہے ـــــ ٹوٹا پھوٹا، اللہ مارا"۔

"تمھیں جو ریکارڈ چاہئے ہوں، بتا دو میں لا دوں گا"۔

"کیا کیجئے گا ریکارڈ لاکر"۔

"تمھارے ابا کیا کرتے ہیں؟"

"ابا ـــــ ؟ کچہری میں منصرم تھے۔ فالج گر گیا۔ کھاٹ پر پڑے ہیں ـــــ"

"بہن بھائی ـــــ ؟"

"دو بھائی تھے۔ خدا گنج گئے۔ بہن کوئی نہیں، بس میں ہی ہوں، اللہ ماری"۔

اس ویرانے میں کون جوان لڑکی اپنی زندگی سے نالاں نہ ہوگی ـــــ نجن میاں نے دل میں سوچا۔ بارش گھڑی گھڑی تھی۔ وہ لڑکی کو خدا حافظ کہہ کر اور اس کے چہرے کی ذرا سی جھلک بھی دیکھے بغیر جلدی سے سائیکل سنبھال کر گھر بھاگے۔ دوسرے روز وہ لکھنؤ گئے اور آمین آباد سے اپنی پسند کے چند ریکارڈ خرید کر واپس رلئے بریلی پہنچے ـــــ ریکارڈوں کا ڈبا کیریر سے باندھ کر پہنچے سیدھے کریم گنج ـــــ منصرم صاحب کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

دروازہ ذرا سا کھلا۔ چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ نجن میاں نے ریکارڈوں کا ڈبا اندر سرکا دیا۔ جمال آرا بے حد ممنون معلوم ہوئی ـــــ نجن میاں کو ایسا لگا جیسے اس لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں کیوں کہ جب وہ بولی تو اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"شکریہ"۔ اس نے کہا۔

"تمھارے والدین کچھ کہیں گے تو نہیں؟"

"کچھ نہیں کہیں گے"۔ جمال آرا نے بلا جھجک جواب دیا —— اور نجنّ میاں کو ذرا تعجب ہوا۔ چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد انھوں نے پوچھا "تم سخت پردہ کرتی ہو؟"

"جی ہاں"۔ جمال آرا نے اسی رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اب ایسا معلوم ہوا جیسے وہ چپکے چپکے رو رہی ہو۔

"اچھا تو میں کنویں پر جا کر بیٹھتا ہوں، تم کچھ گاؤ، میں صرف تمھاری آواز سننا چاہتا ہوں"۔

"کیا گاؤں؟" جمال آرا نے فرماں برداری سے پوچھا۔

"جو دل چاہے"۔ نجنّ میاں نے کہا اور سر جھکائے کنویں پر چلے گئے۔

"تجھے ہو سیرِ چمن مبارک، مگر یہ رازِ چمن بھی سن لے
کلی کلی خون ہو چکی تھی شگفتِ گل ہائے تر سے پہلے"

لڑکی نے اس طرح اچانک گانا شروع کر دیا جیسے گراموفون ریکارڈ پر سوئی رکھ دی جائے۔ برگد تلے کبوتر شاہ آنکھیں بند کر کے جھومنے لگے۔ ان کے دو دیہاتی مرید چولہے پر ان کے افطار کے لئے زردہ تیار کرنے میں مصروف تھے۔ کیوں کہ کبوتر شاہ سال کے بارہ مہینے روزہ رکھتے تھے۔ برسات کی بھیگی فضا میں بھیگا بھیگا دھواں اوپر اٹھتا رہا۔ بہشتی نے اپنے دروازے سے سر نکالا اور پھر اندر غائب ہو گیا۔ باغ میں کوئل زور سے کوکی۔ جمال آرا کی آواز ہرے روشن دانوں والے کمرے سے بلند ہو کر سارے باغ میں پھیل گئی۔ کڑے کمان کے تیر ایسی آواز موسمِ برشگال کی دھندلی، سیّال آوازوں پر حاوی آ گئی۔

"کہاں کہاں اڑ کے پہنچے شعلے یہ ہوش کس کو یہ کون جانے
ہمیں بس اتنا ہے یاد اب تک لگی تھی آگ اپنے گھر سے پہلے"

مرید چولہا سلگاتے سلگاتے آپس میں باتیں کرنے لگے۔

"جمالا بٹیا شاہ صاحب کے لئے کھیر دے گئی ہیں"۔ ایک مرید نے تام چینی کی رکابی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"سویرے بجا رگئی تھیں۔ بندو خاں کے ساتھ لالہ کی دوکان پر کھڑی رو رہی تھیں۔ لالہ نے ان کا طوق بھی مار لیا۔ دے سود پر سود۔ دے سود پر سود۔ اللہ کی سان ہے"۔

"ہاں چھجو بھائی۔ اللہ کی سان ہے"۔

نجن میاں غور سے سننے لگے۔ وہ تو کہہ رہی تھی کہ سخت پردے میں رہتی ہے۔ اور یہ لالہ کی دوکان اور سود کا کیا قصہ تھا؟

"یہ نالہ کیوں ہے، یہ نغمہ کیوں ہے یہ آہ کیسی یہ واہ کیسی
یہ پوچھ لے آئینے کے دل سے، نہ پوچھ اپنے جگر سے پہلے"

دفعتاً نجنّ میاں کا جی بھر آیا وہ جلدی سے سائیکل کی طرف لپکے اور گھر جاتے ہوئے طے کر لیا کہ اب کریم گنج اور اس المناک ماحول کا رخ نہ کریں گے۔ آدمی کے لئے اپنی پریشانیاں ہی کیا کم ہیں جو پرائے دکھ بھی سمیٹ لئے جائیں۔ جانے کیا جھمیلا ہے کیا نہیں۔ مگر یہ آواز ہمیشہ یاد رہے گی۔

دوسرے روز نجنّ میاں کے والدین شادی کی تاریخ مقرر کرنے علی گڑھ سے رلئے بریلی گئے۔ بڑا ہنگامہ اور چہل پہل رہی۔ ہفتہ بھر بعد علی گڑھ روانہ ہونے سے پہلے وہ آخری بار کریم گنج گئے۔ باغ پر حسب معمول سناٹا طاری تھا، جس میں ڈول سے پانی گرنے، رہٹ چلنے اور نالیوں میں پانی بہنے کی مدھم آوازیں سرسرا رہی تھیں۔ بھورے مکان کی ڈیوڑھی پر یکہ کھڑا تھا۔ ایک چار سالہ بچی سرخ غرارہ پہنے بڑے سلیقے سے سر ڈھانپے ڈیوڑھی کے اندر جا رہی تھی۔ بہشتی کے دروازے پر چند عورتیں کھڑی تھیں۔

چند منٹ بعد ایک باریش بزرگ میلی سی شیروانی پہنے بھورے مکان کے اندر سے نکلے اور یکہ پر بیٹھ گئے۔ یکہ کچی سڑک پر ہچکولے کھاتا ہوا بڑھ گیا۔ تو بہشتی ڈیوڑھی سے برآمد

ہوا۔ اس کی نظر نجّن میاں پر پڑ گئی جو برگد تلے دل گرفتہ سے کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بڑبڑاتا ہوا ان کی جانب آیا۔

"سلامالے کوم"۔ اس نے درشتی سے کہا۔

"سلاں علیکم"۔ نجّن میاں نے علی گڑھ کے انداز میں جواب دیا۔

"آئیے بیٹھیے میاں"۔ بہشتی نے اپنے گھر کے سامنے پڑی ہوئی کھاٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ نجّن میاں اس کے ہمراہ چلتے ہوئے آ کر کھاٹ پر بیٹھ گئے۔

"آپ روج روج جمالا بٹیا کا گانا سننے اتنی دور سے آتے ہیں"۔ بہشتی نے چلم سلگاتے ہوئے کہا۔ نجّن میاں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کبوتر شاہ کا ایک مرید سر کھجاتا آکر کھاٹ کی پائنتی بیٹھ گیا۔ تکئیے۔ کہ چھپر پر کبوتروں نے غٹر غوں غٹر غوں کر کے مار ایک آفت مچار کھی تھی۔

"حکیم صاحب کا کہت رہے؟" مرید نے بہشتی سے پوچھا۔

"حالت ناجک ہے"۔ بہشتی نے جواب دیا، اور سر اٹھا کر بتول کے سنتروں کی ڈالیوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ماتھے پر انگلی دو دفعہ بجائی "مکدّر۔ مکدّر کے آگے جمّن بھائی کسی کی نہیں چلتی"۔

مرید نے لمبا سانس لے کر زور سے نعرہ لگایا "اللہ ہو ——" نجّن میاں لرز گئے۔

"کیا ہوا۔ خیریت؟" انھوں نے بہشتی سے سوال کیا۔

"کھیریت —— ؟ ارے چل چلاؤ ہے"۔

"کس کا؟"

"منصرم صاحب کا۔ اور کس کا۔ اب آگے اللہ کا نام ہے"۔

"چل چلاؤ ہے۔ سب کا چل چلاؤ ہے"۔ مرید نے آنکھیں بند کر کے ذرا جھومتے ہوئے زیر لب دہرایا۔

بہشتی نے دفعتاً سر اٹھا کر کہا "جائیے میاں۔ آپ اپنے گھر جائیے"۔

"بندو خاں"۔ مکان کے صحن میں سے ایک عورت نے پکارا "اے تم پر اللہ کی سنوار۔ سارے گھڑے خالی پڑے ہیں، اور تم بیٹھ گئے گسکوٹ کرتے"۔

بہشتی نے کھاٹ سے اٹھ کر دیوار سے ٹنگی ہوئی مشک اتاری اور نجّن میاں پر نظر ڈالے بغیر پھرتی سے باؤلی کی سمت چل دیا۔

نجّن میاں نے گھڑی دیکھی ٹرین کا وقت قریب تھا۔ انھوں نے ایک بار بند کھڑکی اور ہرے روشن دانوں پر نظر ڈالی اور سائیکل پر سوار ہو گئے —— تم جو کچھ بھی ہو اور جو کوئی بھی ہو، بے چاری بچی۔ اللہ کے حوالے۔ انھوں نے دل میں کہا اور تیزی سے سائیکل چلاتے رائے بریلی جانے والی سڑک پر آ گئے۔

نجّن میاں کو اس وقت یہ احساس اتنی شدت سے نہ ہوا تھا۔ کہ وہ جو کوئی بھی اور جو کچھ تھی اس کی انھوں نے اس سمے کوئی مدد کیوں نہ کی۔ پشیمانی اور جرم کا یہ احساس عمر پختہ ہونے پر، زمانے کے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد ان کو ستانے والا تھا۔ نجّن میاں کی شادی ہو گئی کچھ عرصے بعد بمبئی میں ملازمت مل گئی اور وہ بیوی سمیت یہاں آ گئے، اور یہاں ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ انھوں نے کسی سے اپنے اس احساس جرم کا ذکر نہیں کیا۔ رقیّہ سے بھی نہیں شریف اور نیک دل ہونا بھی ایک عذاب ہے۔

اتنے عرصے بعد، ایک ہفتے سے نجّن میاں کو یہ آواز روزانہ رات کو خواب میں سنائی دے رہی تھی۔ آج رات وہ جاگ اٹھے اور چونک کر کھڑکی سے باہر دیکھا، جہاں خاموش سڑک کی نیلی روشنی میں درختوں کے پتے جھلملا رہے تھے۔ دو رویہ عمارتیں خوابیدہ تھیں (گلشن ہند ریستوراں، شیریں کھمباتا ہاؤس، نور بائی بلڈنگ، چٹ پٹ ڈرائی کلینرز۔ سارا شہر) لیمپوں کے ان کھمبوں کے نیچے، اکثر رات کو کوچہ گرد گوئیے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہارمونیم، دو تارہ یا وائلن بجا بجا کر بھیک مانگتے ہیں۔ نجّن میاں بستر سے اٹھ کر کھڑکی میں آ گئے۔ مگر سڑک خاموش

پڑی تھی۔ یقیناً یہ گانا میں نے خواب ہی میں سنا ہے۔ انھوں نے سوچا اور واپس آکر پلنگ پر لیٹ رہے۔

کئی مہینے، شاید ایک برس گزر گیا۔ وقت بھی عجب مسخری شے ہے۔ ہم اتنے مزے سے کہتے ہیں وقت گزر گیا، حالانکہ وقت گزرنا اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ ہم قبر کے زیادہ نزدیک پہنچ گئے اور کیسی زندگی گزار کے؟ کتنی بے انصافیاں اور ذلتیں سہہ کے؟ زندگی یا قدرت یا قسمت کی کتنی ستم ظریفیوں کا نشانہ بن کے؟ اور جب مرجائیں گے تو سب کی قبریں ایک سی معلوم ہوتی ہیں۔ دکھ سہنے کے لئے بھی تو بار بار تھوڑا ہی پیدا ہوں گے۔

ایک روز نجن میاں دفتر سے لوٹ کر حسب معمول سیدھے اپنے کمرے میں جاکر پلنگ پر لیٹ گئے۔ کیوں کہ دفتر سے گھر تک ٹرین کا سفر شام کے بھیڑ بھڑکے میں ہلکان کر دیتا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے حسب عادت منتظر تھے کہ رقیہ اندر آکر گرم گرم چائے کی پیالی انھیں تھمادے گی۔ مگر رقیہ پچھلے برآمدے میں دلّی والی پڑوسن اور دوسری ہمسایوں کے ساتھ مل کر کسی بات پر قہقہے لگانے میں مصروف، شاید یہ بھول ہی گئی تھی کہ میاں دفتر سے آگئے۔

اچانک قہقہوں کو پھاڑتی ہوئی ایک بے حد تڑی آواز نے للکار کر "ائے ہائے بیگم۔ نام بڑا اور درشن۔ آخ تھو۔ اتنے بڑے گھر کی رانی اور در پر آئے سوالی کو کیا دیتی ہیں۔ حاتم کی قبر پر لات مارنے والی۔ اے دیکھنا ایک چونی۔ پاپوش مارتی ہوں تمھاری چونی پر آئی بند و خاں چلو اٹھو"۔

"اے توبہ کیا ہوا سے لڑنے والی لگائی ہے!" دلّی والی نے کہا۔ بقیہ خواتین نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

کمرے کے اندر نجن میاں بور ہو کر آنکھیں بند کئے چائے کے منتظر رہے۔

"شرم کرو بیگمو۔ تف ہے۔ تف"۔ تڑی آواز چیخی" اب جو یہ بندی ادھر کا رخ کرے تو"۔

"اچھا ایک غزل اور سنا دو تو پورا ایک روپیہ دیں گے"۔ دلّی والی کی بھاوج نے کہا۔

"نہیں غزل نہیں۔ لے گئی دل گڑیا جاپان کی سناؤ"۔ دوسری پڑوسن کی لڑکی نے فرمائش کی۔

بڑا سخت شور مچ رہا تھا۔ محلے کی یہ سب عورتیں اکٹھی ہو جائیں تو کس قدر چائیں چائیں کرتی ہیں۔ نجّن میاں نے کروٹ بدلی۔ جہاں ان کا پلنگ بچھا تھا وہاں دروازے میں سے برآمدے میں جمع عورتیں تو نظر آ رہی تھیں مگر جس عورت سے وہ سب مخاطب تھیں وہ دیوار کی اوٹ کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"اچھا وہ غزل سناؤ جو پہلے سنائی تھی ابھی"۔ گجراتن ہمسائی نے ہاتھ بڑھا کر روپے کا نوٹ سرکایا۔

فوراً کوئل کی سی آواز بلند ہوئی "کبھی ہم میں تم میں بھی .... اجی راہ تھی ...."

نجّن میاں سن سے رہ گئے۔ ان کو لگا جیسے ان کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ ان پر ایسا سکتہ طاری ہوا کہ وہ لیٹے لیٹے اپنا سر بھی نہ اٹھا سکے۔

گانا ختم ہوا۔ عورتیں ایسا معلوم ہوتا تھا شاید مسحور سی ہو چکی تھیں۔

ایک دم پھر غل مچا۔

"اب گڑیا جاپان کی"۔ ایک لڑکی چلائی۔

"اور تم شادی کس سے کرو گی۔ ذرا یہ تو بتاؤ کوئی ہے نظر میں؟" ایک اور پڑوسن نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے سوال کیا۔

"اے ہے۔ اللہ کے غضب سے ڈرو لڑکیو۔ کیوں اس غریب کو تنگ کر رہی ہو"۔ یہ دلّی والی کی بوڑھی ساس کی آواز تھی جو شور و غل سن کر اپنے فلیٹ سے نکل کے صحن میں آ گئی تھیں۔

"سلام بیوی ——— سلام"۔ گانے والی نے ذرا ممنون آواز میں ضعیفہ کو سلام کیا۔

"سلام۔ سلام"۔ دلّی والی کی ساس مونڈھے پر بیٹھ گئیں۔ "اے ہے۔ نگوڑی کمبخت

دکھیا ماری"۔ اے لڑکیو۔ تم کو اس کا مذاق اُڑاتے شرم نہ آئی۔ اے تیری کتنی عمر ہو گی بختوں جلی؟"

"بیالیس برس، بیگم صاحب"۔

"بیالیس برس!" خواتین کا حیرت زدہ کورس ہوا۔

"اللہ کی شان ہے!" رقیہؔ نے کہا۔

"ہاں اللہ کی شان ہے"۔ دلی والی نے کہا۔

"اور نام کیا ہے تمھارا؟" رقیہؔ نے پوچھا۔

"آنکھوں کے اندھے، نام نین سکھ۔ میرا نام جمال آرا ہے بیگم صاحب"۔

"بڑا جگرا ہے تمھارا بیوی۔ گلی گلی گھوم کر دنیا بھر کی باتیں سنو ہو۔ مذاق اُڑوائو ہو اپنا"۔ دلی والی کی ساس نے کہا۔

"جب قدرت نے میرے ساتھ اتنا بڑا مذاق کیا ہے بیگم، تو میں دنیا والوں کے مذاق اڑانے کی کیا پرواہ کروں؟ اور گلی گلی نہ گھوموں تو کھاؤں کیا اپنا سر؟ ذرا یہ تو بتاؤ؟" عورت نے چمک کر جواب دیا۔

"کہاں کی رہنے والی ہو۔ ادھر کی تو معلوم نہیں ہوتیں"۔

"ضلع رائے بریلی تھانہ کریم گنج"۔

"ماں باپ ہیں، مر گئے؟ کیا کرتے تھے؟" عورتوں کی عادت ہے کہ ہر بات کی کرید۔

"مر گئے نگوڑے۔ ذرا زردہ دینا۔ اے ہے، لکھنؤ کا زردہ ہے۔ ابا منصرم تھے ہمارے۔ مانو نہ مانو ـــــ مجھے کون پڑا ہے۔ آجاؤ بندو خاں، چلیں"۔

"اے ہے۔ ٹھہر تو کمبخت کہاں بھاگی جاتی ہے۔ کون سا تیرے گھر پر تیرا خصم اور بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہاں اور بتا اپنے حالات"۔ دلی والی کی بھاوج نے جن کو افسانے پڑھنے کا بڑا شوق تھا، بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں؟ اپنا کلیجہ؟ اے بُندو خاں، ادھر آجاؤ، اندر۔ سنا دو رام کہانی۔ یہاں بڑی محفل لگی ہے۔ نقشے جمے ہیں"۔

اب ایک بوڑھے آدمی کی کھنکار کی آواز آئی۔ جو شاید اب تک باہر اپارٹمنٹ بلاک کے پھاٹک پر بیٹھا تھا۔ اس نے صحن میں آکر گلا صاف کیا اور اس میکانکی انداز سے جیسے سینکڑوں مرتبہ یہ داستان دہرا چکا ہو کہنا شروع کیا۔

"بیگم صاحب ان کو تین برس کی عمر میں جبر جست بخار آگیا تھا۔ بخار اتر گیا مگر اس کے بعد قد بڑھنا بند ہوگیا۔ حکیم، بید، اور اس کا نام لیجئے —— داگدر۔ اوجھے، سیانے، سب ٹرائی کئے ان کے باپ نے۔ مگر یہ نصیبوں جلی اتنی بڑی ہی رہ گئی۔ کیا کرد۔ بکدر۔ ابا دیوانی کی عدالت میں ملازم تھے۔ اپنا ذاتی مکان تھا۔ سب کچھ تھا۔ مل بس قسمت نہیں تھی"۔

"چچ چچ چچ"۔ سامعین نے کہا۔

"پھر بیگم صاحب، ان کے بادا کو لقوہ مار گیا۔ وہ مر گئے۔ پھر مہتاری چل بسیں پھر میں اور میری گھر والی ان کو اپنے ہاں لے آئے"۔

"تم کون ہو اس کے۔ ان کے۔؟" رقیہ نے پوچھا۔

"ان کے گھر کا بہشتی ہوں۔ برسوں ان کا نمک کھایا ہے"۔

"چچ چچ۔ ہا"۔ دلّی والی کی ساس بولیں۔ ان کے لہجے میں سچی ہمدردی کی جھلک محسوس کر کے بوڑھے نے داستان جاری رکھی "مکان بیس روپیہ مہینہ کرائے پر اٹھا دیا۔ میں سقہ ہوں ذات کا۔ میرے لڑکے آوارہ نکل گئے۔ لکھنؤ جا کر وہ تو بن گئے شہدے۔ ادھر میرے ہاتھوں کے زخم بڑھ گئے تو کام چھوٹ گیا۔ سوچا بٹیا کا مکان بکوا دوں تو دو وقت کی روٹی کا بندوبست ہو جائے۔ مہاجن کا کرجہ منصرم صاحب پر پہلے سے چڑھا ہوا تھا۔ پھر آپ جانو ہندوستان پاکستان ہو گیا۔ مکان کے دام دو کوڑی کے نہیں رہے۔ اجی مکان تو کیا بکتا منصرم صاحب کے مرنے کے بعد مہاجن نے اس کی کرکی ہی کر والی مجھے اس کے شاگرد پیشے سے نکلنا پڑا۔ اور صاحب"۔ بوڑھا دم لینے کو رکا۔ پھر

ہم سب جاکر کبوتر شاہ کے چھپر تلے پڑ رہے۔ یہ بٹیا جمعرات کی جمعرات نعتیں گاتی تھیں۔ اللہ سے ڈرنے والے چار پیسے دے جاتے تھے۔ پھر صاحب میری گھر والی لڑھک گئی۔ پھر کبوتر شاہ کے تکیے پر جانے کہاں سے آکر چھپیے مدکئے جمع ہونے لگے۔ تب میں نے کہا۔ میں نے کہا۔ بُندو خاں اب یہاں سے کوچ کرو۔ میں نے بیگم صاحب بٹیا کو کندھے پر بٹھالا اور بھیک مانگنے نکل پڑے دونوں جنے۔ مگر جس شہر میں باپ منصرم تھے اس میں بٹیا کو بھیک مانگتے لاج آتی تھی۔ ہم لوگ لکھنؤ چلے آئے۔ وہاں کئی برس بھیک مانگی۔ پھر کسی نے بتایا کہ بمبئی بڑے دھنوانوں کا شہر ہے۔ وہاں چلے جاؤ، تو ٹکٹ کٹا کر یہاں چلے آئے۔ دربی پر جھگی ڈال لی، وہاں سے میونسپلٹی والوں نے اٹھا دیا تو ادھر ادھر فٹ پاتھوں پر سونے لگے۔ دن میں دو ڈھائی روپیہ کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ کبھی زیادہ کبھی کم۔ چلو اٹھو بٹیا، کیا یہیں سویرا کر دوگی۔ رات تھوڑی سوانگ بہت۔ آؤ۔ چلیں"۔

خواتین مبہوت بیٹھی تھیں سب نے کچھ سکے بھکاریوں کی طرف پھینکے جن کے فرش پر گرنے کی آواز نجن میاں کو اندر سنائی دی۔

دفعتاً عورت نے گانا شروع کر دیا "مں نے لاکھوں کے بول سہے۔ میں نے لاکھوں کے بول سہے"۔

گانا ختم ہو گیا تو نجن میاں نے ڈرتے ڈرتے ذرا سا اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ ایک بونی بڑا لمبوترا سا چہرہ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، قد چار برس کی بچی کے برابر، سفید غرارہ پہنے، گلابی ململ کے دوپٹے سے سلیقے کے ساتھ سر اور ماتھا اس طرح ڈھانپے جیسے عورتیں نماز پڑھتے وقت سر اور ماتھا ڈھانپتی ہیں۔ صحن کے فرش پر سے سکے چن کر اٹھی۔ لکھنؤ انداز سے جھک کر اس نے بیگمات کو سلام کیا۔ پھر بچوں کی طرح گودی میں اٹھائے جانے کے لئے بوڑھے کی سمت بانہیں پھیلا دیں۔ بوڑھے نے یا دستگیر کا نعرہ لگایا چگی سفید داڑھی والا سیاہ فام دیہاتی سقہ، جس کی ساری عمر مشک اٹھاتے اٹھاتے کمر جھک گئی تھی۔ اب اپنی آقازادی کا مختصر سا

بوجھ کندھوں پر اٹھانے کے لئے سیدھا کھڑا ہوگیا۔ بونی کو اٹھا کر اس نے کندھے پر بٹھایا۔ بونی نے اپنے منے منے ہاتھوں سے اس کا سر پکڑ لیا۔ بوڑھے نے بیگمات کو سلام کیا اور پھاٹک سے باہر نکل گیا۔

صحن میں چند لمحوں کے لئے خاموشی طاری ہوگئی۔ اب اندھیرا چھا چکا تھا۔ سڑک کی روشنیاں جگمگا اٹھی تھی۔ گھر گھر ریڈیو پر بے حد اونچی آواز میں فلمی گیت گونج رہے تھے۔ دیوالی آنے والی تھی۔ اور بلیک مارکیٹ کرنے والے سیٹھوں کے بچے سڑک پر "ایٹم بم" چھوڑ رہے تھے جن کے بھیانک آواز سے دل بلیوں اچھل پڑتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا گویا ساری زندگی میدان جنگ میں تبدیل ہوگئی ہے، زندہ لاشوں کے پرخچے اڑ رہے ہیں، انسان اپنی لاشیں خود اپنے کندھوں پر اٹھائے اس جہنم زار میں سرگرداں ہیں۔ گلی میں انار چھوٹ رہے تھے۔ پھلجھڑیاں، پٹاخے اور مزید "ایٹم بم"۔

آتش بازی کے ان دھماکوں کے بعد چند منٹ کے لئے ذرا خاموشی چھائی اور پھر سڑک کے نکڑ پر سے بونی کی آواز بلند ہوئی۔

"وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر۔ وہ کرم کہ تھا مرے حال پر۔ مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا۔ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔" آواز دور ہوتی چلی گئی اور "ایٹم بم" کے لرزہ خیز دھماکوں میں کھو گئی۔

"اے ہے! اس نگوڑی خدائی خوار بونی کے چکر میں دیر ہوگئی۔ میرے ہزبینڈ آفس سے آتے ہی تیز گرم سبز چائے پیتے ہیں۔" رقیہ باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے دلی والی پڑوسن سے کہہ رہی تھی، لیکن عین اسی وقت ہمسائے کے لڑکے نے ننھن میاں کی کھڑکی کے عین نیچے ایک اور "ایٹم بم" چھوڑا جس سے کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں لرزنے لگیں۔

پھر سکوت چھا گیا۔

سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات

سب سے پہلے میں رب الارباب اور عیسیٰ ابن اللہ کی حمد و ثنا کرتی ہوں جس نے مجھے مُردوں میں سے جگایا اور اب دوبارہ روزِ حشر تک سُلانے والا ہے اور اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کا اقرار کرتی ہوں اور بخشش کی طالب ہوں۔ خدائے قدوس تو خوب واقف ہے میں لاعلم تھی کہ یہ کون سی صدی ہے، کون سا سال۔ کون سا مہینہ اور دن۔ میں اپنے کھُلے تابوت میں خوابیدہ تھی جب ترے کسی فرشتے کا رد پہلا پر میری ہڈیوں سے ٹکرایا اور میں اٹھ بیٹھی۔ میری کھوپڑی پائینتی پڑی تھی نیچے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا۔ اس کی گرد جھاڑی اور گردن میں فِٹ کیا۔ گھپ اندھیرا تھا۔ کھوپڑی غلط فٹ ہوئی تھی اور مجھے آگے کی بجائے پیچھے دکھائی دینے لگا۔ بمشکل اسے ٹھیک سے لگایا۔ الٰہی ربِ کریم میں اعتراف کرتی ہوں کہ اس لمحے میری اولین آرزو یہ تھی کہ آئینے میں دیکھوں کیسی لگتی ہوں۔ چاروں طرف نظر ڈالی۔ اس تاریک بوسیدہ زمین دوز حجرے میں سات آٹھ سنگی تابوت ہڈیوں اور کھوپڑیوں سے لبریز دیواروں سے لگے رکھے تھے۔ مجھے بہت ڈر لگا۔ میں اپنے تابوت کے کنارے بیٹھی خوفِ خدا سے لرز رہی تھی کہ اچانک کھڑکی روشن ہوئی اور وہ سیلانی فرشتہ پھر نمودار ہوا۔ کہنے لگا۔ "میں اپنی تسبیح یہاں بھول گیا۔ تم کون ہو؟"

"سینٹ فلورا سابینا آف جارجیا"۔

"خدا کی برکت ہو تم پر"۔ اس نے جواب دیا اور تسبیح ڈھونڈنے میں جُٹ گیا۔ کہکشاں کے ستاروں سے بنی وہ تسبیح مجھے ایک تابوت کے پیچھے پڑی نظر آگئی۔ میں نے فوراً کہا "ضیاء گستر پیارے فرشتے۔ اگر وہ تسبیح ڈھونڈ دوں تو مجھے کیا دو گے؟" وہ بے حد پریشان اور سراسیمہ نظر آتا تھا۔ کم سن فرشتہ تھا۔ کہنے لگا "مجھے سینٹ پیٹر کے دفتر میں ایک ایک دانے کا حساب دینا پڑتا ہے۔ میں ایک بھلکڑ فرشتہ ہوں۔ اسی بھلکڑپن کی وجہ سے مجھے ستر ہزار برس تک ایک TRAINEE فرشتہ رہنا پڑا۔ اب جا کر مجھے اپنا ہالہ عطا کیا گیا ہے"۔ اس نے فخر و مسرت سے اپنے نور کے ہالے کی طرف اشارہ کیا۔ "لیکن اب میں نے اپنی تسبیح گنوا دی"۔

"کیا دو گے؟"

"کیا چاہتی ہو؟"

"میں جواں سال مری تھی۔ انیس برس کی تھی جب میرے باپ نے مجھے سوریا کے ایک کانونٹ میں بند کر دیا۔ اگلے پچیس برس میں نے خانقاہوں میں محبوس رہ کر گزارے۔ میں ذرا دنیا دیکھنا چاہتی ہوں۔ اور اچھے کپڑے پہننے کی آرزو مند ہوں"۔

"میں تم کو گوشت پوست اور خون عطا کرنے کا مختار نہیں۔ ایسا صرف روزِ قیامت ہو گا۔ فقط ایک سال تک ذی روح رہنے کی اجازت دلوا سکتا ہوں۔ تسبیح لاؤ"۔

"پیارے کرم کار فرشتے۔ میرا خشک پنجر ایک سال تک اس اجنبی دنیا میں تنہا کس طرح اور کہاں مارا مارا پھرے گا۔ کسی دلچسپ مردے کو میری دو سراتھ کے لئے زندہ کر دو"۔

"دلچسپ مُردہ کیسا ہوتا ہے؟"

"میرا مطلب ہے ——"

"اچھا۔ پہلے تسبیح لاؤ"۔

"نہیں۔ پہلے ایک اور مردہ زندہ کرو۔ کہو تُم باذن عیسیٰ ——"

"جب تم خود ولیہ ہو تو کیوں نہیں ایک عدد معجزہ دکھاتیں"۔ اس نے جھنجلا کر کہا۔

"میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اس کی ایک ٹیکنیکل وجہ ہے۔ کہو تم ——"

فرشتہ دو زانو جھک کر مصروف دعا ہوا۔

دفعتاً میرے پہلو کے تابوت میں کھڑکھڑاہٹ شروع ہو گئی۔ اور دوسرا ڈھانچہ اٹھ بیٹھا۔ فرشتے نے مجھ سے کہا "صرف سال بھر کے لئے آئندہ سال یہی مہینہ یہی تاریخ اور یہی وقت ساڑھے گیارہ بجے رات —— اس کو بھی اچھی طرح سمجھا دینا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ خدا حافظ ——"

میں نے تسبیح اٹھا کر اسے دی اور وہ پھر سے غائب۔

زمین دوز ہڑواڑ میں اب پھر اندھیرا تھا۔ لیکن میں خوف زدہ نہیں تھی۔ دوسرے ڈھانچے نے تابوت میں بیٹھے بیٹھے دایاں پنجہ اس طرح بڑھا کر سرہانے کچھ ٹٹولا گویا عادتاً جاگنے کے بعد شمع جلا کر کتاب اٹھانا چاہتا ہو۔ میں نے جلدی سے اسے مخاطب کیا اور پورا واقعہ گوش گذار کیا اور اپنا نام بتایا۔ سینٹ فلورا سابینا آف جارجیا ——"

"فادر گریگری اور بیلیاتی آف جارجیا"۔

"خدا کی برکت ہو تم پر مقدس باپ"۔

"آپ ولیہ ہیں —— ؟" فادر گریگری گھبرا کر تابوت سے نکلا اور میرے سامنے گھٹنے ٹیکنے چاہے لیکن لڑکھڑا کر گر گیا۔ اس کے گھٹنوں کی چپنیاں بے انتہا بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ میں نے خدایا تجھ سے دعا مانگی۔ کہ اے دو جہاں کے مالک اگر تو نے مجھے ایک سال کے لئے یہ ESCORT عطا کیا ہے تو اسے ایک ثابت و سالم و معقول پنجر بنا دے۔ فادر گریگری فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی میں سے تیز سرد ہوا اندر آ کر ہماری ہڈیوں کو کاٹے ڈال رہی تھی۔ اس نے کہا "بہت سردی ہے۔ پہلے الاؤ کا انتظام کیا چاہئے"۔

"اگر کہیں سے چقماق مل جائے۔ میں بولی۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ جہاں پائن کے

جھنڈ سائیں سائیں کر رہے تھے۔

"فادر ادھر آجاؤ۔ ورنہ زکام ہو جائے گا۔" میں نے تشویش کے ساتھ کہا۔ وہ آکر اپنے تابوت کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ میں کھڑکی بند کرنے کے لئے اٹھی۔ کھڑکی کا ایک پٹ ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ دوسرے پٹ کی طرف ہاتھ بڑھانے کے لئے باہر جھانکا۔ پہاڑی کے عین نیچے چوڑا دریا بہہ رہا تھا۔ جو کوہستان قفقاز سے نکل کر بحیرۂ اسود میں گرتا تھا۔ مجھے یاد آگیا میں اس پہاڑی والی خانقاہ میں کئی برس رہ چکی تھی پھر اس دریا پر ایک شاندار چہار منزلہ سفید رنگ کا جگمگاتا محل نمودار ہوا۔ اور ایک مہیب آواز ـــــ صورِ اسرافیل ـــــ میں فوراً سجدے میں گر گئی۔ اور بہت افسوس ہوا کہ دنیا میں سال بھر رہنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ دوبارہ صورِ اسرافیل ـــــ سہ بارہ ـــــ تب فادر گریگری کھڑکی میں آیا۔ اور باہر جھانک کر مجھ سے کہا۔

"مقدس ولیہ ـــــ یہ ایک دخانی جہاز ہے۔ اور اپنا سائرن بجاتا ہے۔ اٹھو۔"

میں کھڑی ہو گئی اور باہر جھانکا۔ نیچے دریا کے کنارے ایک خیمہ گاہ نظر آئی جس میں جگہ جگہ الاؤ جل رہے تھے اور ساز بجائے جا رہے تھے اور ہنسی اور قہقہوں کا شور۔ خداوندا میرا جی چاہا کہ میں بھی جا کر اس جشن میں شامل ہو جاؤں۔ تب فادر کی آواز نے مجھے چونکایا جو کہہ رہا تھا "آؤ باہر چل کر آگ تلاش کریں۔"

ہم دونوں ٹٹولتے ٹٹولتے اس سرداب سے نکل کر ایک سرنگ میں پہنچے جس کی سیڑھیاں اوپر باغ میں کھلتی تھیں۔ دروازے پر جھاڑیاں اور گھاس اگی ہوئی تھی۔ ڈیزی کے تختے لہلہا رہے تھے۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، درنٹے کی جھاڑیاں پھلانگتے باغ میں آئے جس کے سامنے ایک بڑا چرچ استادہ تھا اور اوک اور پائن کے جھرمٹ۔ ایک درخت کے نیچے کاغذی پلیٹیں گلاس اور نیپکن پڑے نظر آئے۔ میں لکڑیاں چننے لگی۔ فادر نے اس کاٹ کباڑ کو اکٹھا کیا۔ ایک ڈبیا ملی اس میں تیلیاں سی تھیں۔ فادر نے ایک تیلی ڈبیا پر رگڑی۔ آگ پیدا ہوئی۔ فادر نے کہا۔ "یہ ماچس ہے۔ کوئی پکنک

منانے والی ٹولی یہاں چھوڑ گئی۔ خدا ہمارے ساتھ ہے"۔

ہم نے الاؤ جلا کر تاپنا شروع کیا۔

خدایا۔ میں چغلی نہیں کھاتی مگر دلی شمعون کی قسم۔ اس لمحے میں نے دیکھا کہ فادر گریگری اور بیلیانی کے نتھنوں سے دھواں نکل رہا ہے۔ میں بے طرح گھبرائی۔ دھویں کے مرغولوں کے پیچھے ایک منا سا انگارہ اس کے منہ میں روشن تھا۔ الہٰی۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ دھواں اور آگ کی لپٹیں صرف اخوان الشیاطین کے منہ سے نکلتی ہیں۔ میں نے فوراً تیری صلیب کا نشان بنایا اور سوچا کہ یقیناً کوئی بدروح اس کے پنجر میں آگھسی ہے۔ یا بھلکڑ فرشتے کی غلطی ہے جس نے کسی عابد و زاہد کے بجائے، کسی خبیث ——

اچانک فادر ہنسنے لگا اور بولا "ڈرو مت۔ یہ سگریٹ کہلاتا ہے۔ جو سیاح یہاں پکنک کے لئے آئے تھے ماچس کے ساتھ ایک پیکٹ سگریٹ بھی یہاں بھول گئے۔ مجھے ابھی پتوں میں پڑا ملا"۔

میں نے کہا۔ "تمھیں کس طرح معلوم ہوا کہ یہ شے سگریٹ کہلاتی ہے اور اسے جلا کر منہ سے دھواں اگلتے ہیں۔ یہ صریحاً ایک طاغوتی، ابلیسی فعل ہے ——"

فادر نے نرمی سے سمجھایا۔ "بی بی فلورا —— امریکن سائنسدانوں نے حال ہی میں ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جسے رات کو سر پر فٹ کر کے انسان سو جاتا ہے اور سوتے میں اس آلے کے ذریعے مختلف علوم ذہن نشین کر لیتا ہے۔ کیا تم اس قادرِ مطلق کی قدرت پر شک کر سکتی ہو جس نے ساڑھے تیرہ سو برس کی طویل نیند کے دوران اس مُردابے میں مجھے آج تک کے متعدد علوم اور جدید زبانوں اور دوسرے معاملات سے آگاہ کر دیا۔ ایک حد تک تم خود بہت سی باتوں سے واقف ہو چکی ہو۔ اس کا تجربہ تمھیں اس ایک برس میں خود ہو جائے گا بلکہ ابھی ابھی اسی لمحے سے ہوا جاتا ہے۔ ذرا کان لگا کر سنو"۔

نیچے وادی میں جو ساز بج رہے تھے میں فوراً سمجھ گئی کہ وہ گٹار، بیلا لیکا، اکارڈین

اور سیکسوفون کہلاتے ہیں اور وہ نوجوان روسی اور جارجین زبانوں کے گیت گا رہے تھے۔

پھر ہوا کے ریلے کے ساتھ وادی کی آوازیں ہمارے کانوں میں پہنچیں۔ نیچے خیمہ گاہ میں ایک نوجوان گٹار بجاتے بجاتے ایک لڑکی سے کہہ رہا تھا ——— "نتاشا! دیکھو ادھر بھی الاؤ جل رہا ہے۔ کچھ لوگ باگ وہاں پہلے سے کیمپنگ کر رہے ہیں"۔ پھر ہوا کا رخ بدل گیا اور وہ آوازیں مدھم پڑ گئیں۔

تب فادر نے کہا "مقدس ولیہ ———"

"اگر تم مجھے اس لقب سے مخاطب نہ کرو تو بہتر ہوگا۔ اس کی وجہ ابھی بتا دوں گی۔

"کیا وجہ ہے؟ اچھا ٹھیک ہے۔ ہم دونوں کو سال بھر اکٹھے رہنا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ اپنا اپنا احوال ایک دوسرے کو بلا کم و کاست بتا دیا جائے۔ تاکہ آئندہ کسی غلط فہمی کا امکان نہ رہے۔ میں گرینڈ ڈیوک آف طفلس کا بیٹا تمہاری خدمت میں حاضر ہوں"۔

الٰہی! میں ONE-UPMANSHIP نہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن لامحالہ مجبوراً بتلانا پڑا کہ میرے والد سفیر بازنطیم برائے ایران ہیں۔

"تھے ———" اس نے تصحیح کی "قسطنطنیہ سے شمالی گرجستان کے اس دور افتادہ پہاڑ پر کیسے آپہنچیں ———"

"ہم جب باسفورس سے چلے" میں نے کہنا شروع کیا۔ "سمندر پرسکون تھا اور ہوا ساز گار ———"

"لیکن باسفورس سے ایران جانے کے لئے بحرۂ اسود کا رخ کیوں ——— ؟ تمہارے جہاز کا کپتان پاگل تھا ——— ؟" فادر گریگری نے سگریٹ کا کش لگا کر میری بات کاٹی۔

"نہیں، سنو تو، اچھا شروع سے بتاتی ہوں۔ تمہیں تو معلوم ہوگا۔ ہم بازنطینی کتنے شاندار لوگ تھے۔ قسطنطنیہ سرکاری طور پر روم ثانی کہلاتا تھا۔ جسٹینین نے کلیسائے سانتا صوفیہ تعمیر کرنے کے بعد کہا تھا ——— خداوندا ——— میں تیرے بادشاہ سلیمانؑ سے بازی لے

گیا ـــــ جسٹینن، تھیوسوڈیس اور آرکیڈیس کے دور کے علوم و فنون، اولمپک کھیل ـــــ اور ہمارا لاثانی آرٹ ـــــ"

"تھیوڈورا کو گول کر گئیں ـــــ!" فادر نے چوٹ کی۔

"خیر وہ بھی تھی ـــــ ایک کلوپٹرا ایک تھیوڈورا ـــــ ان دو نے ذرا علو ہمتی دکھائی تو وہ تم مردوں کے حلق سے آج تک نہ اتریں۔ خیر جب ساسانیوں نے زور پکڑا اور ہمارے صوبہ شام پر قبضہ کر کے یروشلم سے خداوند کا اصلی صلیب اٹھا کر ٹیسفون لے گئے ہمارا ہرقلیس ان سے لڑ بھڑ اسے یروشلم لے آیا ـــــ جب عربوں نے یروشلم فتح کیا تو وہ صلیب ہمارا ہرقلیس قسطنطنیہ لے آیا۔"

"طبلسی میں میں نے بھی اپنے والد کے ساتھ عرب لشکر کا مقابلہ کیا تھا۔ مگر ناکام۔ وہ دنیا کی نئی عالمگیر طاقت تھے ـــــ جیسے آج کل روس اور امریکہ" ـــــ نادر اور پیلیانی نے خشکی سے کہا۔

"ہم بازنطینی ریشہ دوانیوں کے بے حد شایق تھے اور ہمارے دربار کی سازشیں سیاسی قتل، شہزادیوں کے معاشقے، شہزادوں کے اسکینڈل، ساری دنیا میں مشہور تھے۔ عام دستور یہ تھا کہ ہمارے بادشاہوں کو ان ملکائیں یا بیٹے زہر دے کر مار ڈالتے تھے۔ کلیسا کا حکومت پر گہرا دباؤ تھا۔ مگر پادری لوگ خود آپس میں مذہبی مسائل میں بال کی کھال نکال کر سب کا وقت برباد کر رہے تھے۔ میرے والد اسٹیفن ہونوریس حکومت کے ایک اہم وزیر تھے۔ والدہ آئرینا ماریا ملکہ کی خاص لیڈی ان ڈیٹنگ۔ بڑا بھائی الگزنڈر سلوریس شاہی دستے کا افسر اعلیٰ۔ ہم لوگ ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ سارا کنبہ درباری سازشوں میں مشغول بڑے مزے سے گذرتی تھی۔ تھیٹر۔ اولمپک کھیل۔ گلیڈی ایٹرز کے مقابلے۔ ہمارے پڑوسی سرجیس پیلاگیس ابا کے گہرے دوست تھے۔ سالونیکا میں ان کے تاکستان تھے۔ بحیرۂ اسود میں اپنے تجارتی جہاز چلتے تھے۔ ان کے لڑکے تھیوڈورک گیلاسس سے میری شادی

ہونے والی تھی۔ وہ بے حد شکیل اور ہوش مند تھا۔ اس نے ایک دن مجھ سے کہا۔ میں باز نطیم ہائی سوسائٹی کی اس انتہائی کرپٹ زندگی میں شامل ہونا چاہتا۔ شادی کے بعد میرے ساتھ سالونیکا چل کر رہو۔ آرام سے اپنے تاکستان میں بیٹھ کر میں فلسفہ پڑھا کروں گا تم بربط بجانا اور کشیدہ کاری کرنا لیکن فادر میں اس ہائی لائف کی از حد شوقین تھی۔ روز شام کو والدین کے ساتھ درباری تقریبات میں جاتی۔ رقص کرتی۔ ایک سے ایک بڑھیا پوشاکیں پہنتی۔ اس وقت میری عمر صرف سولہ سال کی تھی۔ گلیڈی ایٹرز کے تماشوں پر میں جتنی عاشق تھی۔ تھیوڈورک ان سے اتنا ہی متنفر۔ کہتا ہم لوگ عیسائی ہو گئے۔ مگر رومنوں کو ان بے رحم وحشیانہ کھیل تماشوں کا شوق نہیں گیا۔ خود گلیڈی ایٹرز کے تماشائی دو مخالف فریقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ سبز پوش اور کبود پوش کہلاتے تھے اور ایک دوسرے سے کٹے مرتے تھے۔ میرے تینوں بھائی سبز پوش پارٹی میں شامل تھے۔

"ہماری شادی سینٹ صوفیہ کے کلیسا میں بڑی دھوم دھام سے ہونے والی تھی۔ شہنشاہ میرا گوڈ فادر تھا۔ مہینوں پہلے سے میرے کپڑے سیے جا رہے تھے۔ بہترین زیورات تیار کیے گئے تھے۔ شادی سے چند دن قبل تھیوڈورک کے والد نے یہ خوش خبری سنائی کہ قیصر نے شادی کے تحفے کے طور پر تھیوڈورک کو اپنا حاجب خاص مقرر کر لیا ہے۔ یہ سنتے ہی تھیوڈورک گھبرایا ہوا میرے پاس آیا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی جہیز کی ایک TAPESTRY میں آخری ٹانکے لگا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ غضب ہو گیا۔ میں اور قیصر کا حاجب؟ میں رات ہی کو بندرگاہ جا کر گال روانہ ہونے کا انتظام کرتا ہوں شادی کے فوراً بعد میرے ساتھ چپکے سے نکل چلنا ——— فادر ——— اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ تھیوڈورک ان نوجوانوں میں سے تھا جنھیں AGNOSTIC اور "باغی" کہا جاتا ہے۔

"فادر۔ میں ماں باپ اور بھائیوں کی لاڈلی اور بے حد ضدی لڑکی تھی۔ میں نے کہا وحشیوں کے ملک جاتی ہے میری پاپوش، میں تو یہیں رہوں گی اور تمھیں بھی یہیں رہنا ہوگا۔

اس نے کہا سنو: مجھے تمہارے شہنشاہ، اس کے خاندان، لاٹ پادری، ساری بازنطینی حکومت سے نفرت ہے۔ میں اور اس دربار کی ملازمت کروں؟ ناممکن، ہم دونوں میں کافی تکرار ہوئی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا باغ کی دیوار پھلانگ کر اپنے گھر چلا گیا۔

"فادر۔ اب خالص بازنطینی روایات کے مطابق میری والدہ کی ایک کنیز حریری پردے کے پیچھے چھپی یہ سارا مکالمہ سن رہی تھی۔ وہ بلغاری کنیز بھی دراصل حکومت کی جاسوسہ تھی اس نے جاکر سارا قصہ بادشاہ سے جڑ دیا۔ دوسرے دن تھیوڈورک کو گرفتار کرنے کا حکم خاص میرے بھائی الگزنڈر سلوریس ہی کو دیا گیا۔ ساتھ ہی تاکید کہ تھیوڈورک کو شراب میں زہر ملا کر پلا دیا جائے۔ میرا بھائی شاہی حکم کی تعمیل کے لئے تیار ہوگیا۔ ورنہ اس کو بھی قتل کر دیا جاتا۔ تب میں اسی رات کلوک اوڑھ، خنجر اور اشرفیوں کی تھیلی قبا میں چھپا، تھیوڈورک کے مکان پر پہنچی۔ اس کے باغ کی دیوار کے عین نیچے سمندر تھا اور ہم لوگ عموماً یہیں ملا کرتے تھے تھیوڈورک کو اس حکم کی اطلاع نہیں تھی، وہ خوش خوش گلاب کی کیاری پھلانگتا دیوار پر آیا۔ میں نے اسے اس منحوس خبر سے آگاہ کیا۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ میں نے کہا میں اپنی حماقت اور غلطی پر نادم ہوں۔ اب ساتھ چلنے کو تیار ہوں آؤ فوراً بھاگ چلیں ورنہ صبح ہوتے ہی میرا بھائی تمہیں گرفتار کرے گا۔ فادر۔ جانتے ہو تھیوڈورک نے کیا کہا؟ وہ دیوار پر سے کود کر سمندر کے رخ کھڑا ہوگیا۔ بازو پھیلائے اور بولا —— اے زر پرست، عیش پسند بازنطینی رئیس زادی —— اس چال سے مجھے ابھی پکڑوانے آئی ہو —— ؟ خدا حافظ ——" اور پانی میں کود گیا۔

"میں ہکا بکا کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس وقت، حالانکہ میں کم عمر اور کم عقل تھی مجھے دفعتاً احساس ہوا کہ ایک فاسد، فسق پذیر معاشرے میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب انسان کا انسان پر سے اعتبار مکمل طور پر سے اٹھ جاتا ہے۔ میں تھیوڈورک کے ساتھ اپنی جان پر کھیل کر بھاگنے کے لئے تیار تھی۔ ہم لوگ بلغاریہ جا سکتے تھے۔ کارپیتھین پہاڑوں میں چھپ سکتے تھے۔ کہیں بھی جا سکتے تھے۔ لیکن اس نے مجھ پر بھی شک کیا —— اور تنہا غائب ہوگیا۔

"بعد میں سنا گیا کہ وہ گال پہنچا وہاں سے برطانیہ۔ وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ خدا کرے اسے برطانوی وحشی کھا گئے ہوں ——" میں نے آنسو پونچھے۔ فادر گریگری نے نرمی سے کہا: "بی بی فلورا سابینا۔ برطانوی نیم وحشی ہیں۔ آدم خور نہیں۔ پھر کیا ہوا؟"

"خدا کا شکر ہے کہ والد پر عتاب قیصری نازل نہ ہوا۔ مگر حکم ملا کہ جلد از جلد قسطنطنیہ سے روانہ ہو کر تیسفون میں سفارت خانے کا چارج لیں۔ یہ بھی ایک قسم کی سزا تھی۔ کیونکہ شہنشاہ جانتا تھا کہ مدائن پر عنقریب عربوں کی وجہ سے آفت آنے والی ہے۔ اس میں ہم سب مارے جائیں گے۔ چنانچہ چند روز بعد ہمارے کنبے نے جہاز پر سوار ہو کر بحیرۂ روم کا رخ کیا۔ سمندر پرسکون تھا اور ہوا سازگار۔

"جہاز انطاکیہ کے کنارے لنگر انداز ہوا۔ ہم لوگ بندرگاہ کی مرمریں سیڑھیاں چڑھے۔ شہر کے میوزیم میں ملکۂ مصر کا مرمریں پورٹریٹ دیکھا جو ایک رومن سنگتراش نے کلوپٹرا کو اپنے سامنے بٹھا کر بنایا تھا۔ سچ کہتی ہوں فادر۔ اور میں ہرگز CATTY نہیں ہوں۔ مگر کلوپٹرا قطعی حسین نہ تھی۔ نہ جانے اسے اس قدر خوبصورت کیوں مشہور کر دیا گیا ہے۔ خاصی موٹی بھدی ناک۔ اوپر کا ہونٹ موٹا۔ نیچے کا پتلا۔ مردانہ کرخت چہرہ اسے وجیہہ اور قبول صورت ضرور کہہ سکتے ہیں۔ پری جمال ہرگز نہیں —— ہم لوگ انطاکیہ سے CYRPHUS وہاں سے ایڈیسہ اور نسی بس NISIBUS کے راستے مدائن پہنچے۔ دجلہ کے کنارے جہاں والد نے چند روز بعد قصرِ خسروی میں سفارتی کاغذات شاہ دارا چشم کو پیش کئے۔ وہ تھا تو سائرس و دارا کا جانشین۔ مگر اب تک یہ لوگ بھی ہماری طرح بے حد ڈیکیڈنٹ ہو چکے تھے۔ یہاں بھی قسطنطنیہ کی طرح درباری سازشوں اور شاہی خاندان میں ایک دوسرے کے قتل خون کا بازار گرم تھا۔ اور عیش و عشرت کی فراوانی، شاہ کی گلشن سرائے میں روز جشن منعقد ہوتے۔

تیسفون میں ایک رومن جنرل گزیدہ ہوا۔ لیکن وہ کیتھولک۔ ہم لوگ گریگ

اور تھوڈوکس۔ ابا اس سے شادی کے لئے راضی نہ ہوئے حالانکہ میں تیار تھی۔ قسطنطنیہ میں میں نے سنا تھا کہ عجمی گھنگھریالے داڑھیوں والے خشمناک آتش پرست اپنی عورتوں کو پردے میں مقید رکھتے ہیں اور بہت وحشی لوگ ہیں۔ مگر وہ ہم بازنطینوں سے بڑھ چڑھ کر مہذب، پرتکلف اور خوش ذوق نکلے۔ اور ہماری طرح خوش شکل اور وہ ـــــ موبدان موبد کا فرزند ـــــ دستور زادہ منوچہر پیروز ـــــ" میں کچھ یاد کر کے اداس ہو گئی۔ فادر گریگری نے کنفشن سننے والی آواز میں کہا "بی بی کہے جاؤ۔ میں سن رہا ہوں"۔

"فادر منوچہر ـــــ واقعی منوچہر تھا۔ اور اس نے میرے نام کا ترجمہ اپنی زبان میں گل بانو کیا تھا۔ وہ مجھ سے کہتا ـــــ گول بانو ـــــ گول چہرے ـــــ غونچے ـــــ گول بدن۔ پیغمبر مہ آبادی کی قسم ـــــ تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں دجلہ میں کود کر جان دے دوں گا۔ چلو، ہم لوگ آتش بہرام کی گواہی میں چپکے سے بیاہ کر لیں۔ میں راضی ہو گئی۔ اس شام ہم دجلہ کے کنارے ایک کنج میں بیٹھے یہ اسکیم بنا رہے تھے۔ شومیٔ قسمت۔ شاید یہاں ایک ساسانی جاسوس گلبن میں چھپا بیٹھا تھا۔ یا کیا۔ بجرے پر سوار ہو کر شام کو جب میں اپنے مکان پہنچی مجھے فوراً میری غنودگاہ میں مقفل کر دیا گیا۔ میں کبھی کمبخت تھیوڈورک کو یاد کر کے روتی کبھی رومن جنرل لوسی لیس ایگنیٹس کو اور کبھی دستور زادہ منوچہر پیروز کو ـــــ تیسرے روز صبح والدہ سرخ آنکھیں لئے کمرے میں آئیں اور کہا، بیٹی سفر کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میں سمجھی شاید بازنطیم واپس جاتے ہیں۔ فوراً عرق گلاب سے منہ دھویا۔ گرمابہ میں جا کر نہائی، کپڑے بدلے۔ باہر آئی۔ لیکن مجھے دیکھ کر سب گھر والے بالکل خاموش۔ بلغاری غلام اور کنیزیں بھی۔ کچھ پتہ نہ چلا کہاں جا رہے ہیں شاید سمندر میں ڈبونے کو لئے جاتے ہوں۔ ابا اپنی سخت گیری اور سنگدلی کے لئے مشہور تھے۔ میں تھر تھر کانپتی دروازے سے نکلی۔ والدہ مجھ سے لپٹ کر خوب روئیں۔ مگر وہ بھی خاموش۔ کنیزوں نے مجھے کجاوے میں سوار کرایا۔ اونٹنی ہل جل کر اٹھی میں سمجھی زلزلہ آ گیا۔ چلنے لگی ـــــ ڈر لگا کہ اب گری اب گری۔ والد اور دونوں بھائی تازی گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ روز بانوں نے وہ چوبی صندوق

جن میں میرے جہیز کا زر و جواہر اور طلائی اور نقرئی ظروف قسطنطنیہ سے ساتھ آئے تھے رواحل پر لادے۔ والدہ دروازے پر کھڑی روتی رہیں۔ کارواں روانہ ہوا۔ تیسفون کی شہر پناہ سے نکل کر شام کا رخ کیا۔ دمشق پہنچے۔ راستے میں جہاں جہاں فرودگاہوں میں قیام کیا والد اور بھائی چپ۔ مجھے اب اچھی طرح احساس ہو چکا تھا کہ ایک کافر مجوسی سے عشق کی سزا والد کے نزدیک موت سے کم تو کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔

"دمشق سے کافی دور جا کر ایک راس الجبل پر زیتون کے درختوں میں چھپی ایک گریک اور تھوڈوکس خانقاہ نظر آئی۔ اس کے پھاٹک پر پہنچ کر قافلہ رکا۔ ابّا نے گھوڑے سے اتر کر خانقاہ کے گھنٹے کا رسّہ تین مرتبہ ہلایا۔ کچھ دیر بعد مہیب چوبی پھاٹک چرچراتا ہوا کھلا اور ایک یونانی تارک الدنیا ضعیفہ نے جھانکا۔ چند منٹ بعد دوسری یونانی ضعیفہ ہم لوگوں کو اندر لے گئی۔ ایک بڑے کمرے میں سرد بھورے پتھروں کا فرش۔ سرد پتھریلی دیواریں۔ دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی۔ دو کھردری بنچیں۔ یہ ضعیفہ خانقاہ کی ایبس اور پہلے ایک بازنطینی شہزادی تھی۔ دوسرے کمرے میں جا کر والد نے اس سے بہت دیر تک باتیں کیں۔ پھر مجھے بلایا اور اتنے دنوں بعد پہلی مرتبہ بولے۔ کہنے لگے۔ "دیکھو بیٹی۔ جو ہونا تھا سو ہوا۔ اب تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ میں تمھیں ہمیشہ کے لئے خداوند یسوع کی پناہ اور امان میں دے دوں۔"

"جی۔ ابّا۔" میں نے سر جھکا کر کہا۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

"والد دوسرے کمرے میں آئے۔ زرد زبانوں کو اشارہ کیا۔ انھوں نے اشرفیوں وغیرہ سے لبریز صندوق مدر سپیریر کے سامنے رکھے۔ جو ابّا نے دستور کے مطابق بطور میرے "آسمانی جہیز" خانقاہ کی نذر کئے۔ اس کے بعد ابّا نے مجھے گلے لگا لیا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ آنسو ضبط کئے۔ بھائیوں نے بھی اپنی آنکھوں کی نمی خشک کی۔ اب میں یسوع کی دلہن بننے والی تھی۔ وہ تینوں، میرا باپ اور میرا بھائی میرے سامنے احتراماً دوزانو جھکے۔ اور کہا۔ "ہمارے لئے دعا کرنا۔" اور اٹھ کر باہر چلے گئے۔ میرا جی چاہا دھاڑیں مار مار روؤں۔ ہمت

سے کام لے کر سلاخوں والی کھڑکی میں سے جھانکا۔ وہ تینوں پھاٹک سے نکلے۔ گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ سر جھکائے پہاڑی راستے پر اتر گئے۔ اور رات کے دھند لکے میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اور ان کے پیچھے پیچھے وہ کوتل اونٹ۔ ایک پر خالی محمل دوسرے بار برداری کے شتر جو میرے سابقہ دنیاوی جہیز کا مال متاع میرے مستقبل کی روحانی جائے پناہ میں لے کر آئے تھے اب خالی واپس جا رہے تھے۔ یونانی ضعیفہ نے باہر جا کر پھاٹک میں تالہ چڑھا دیا اور کنجیوں کا گچھا جھنجھناتی شمع ہاتھ میں لئے واپس آئی اور کہا ——"چلو ——" میں ایک تاریک سرد گیلری میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ وہ ایک حجرے میں داخل ہوئی۔ سرد پتھریلی دیواریں سرد فرش۔ ایک چھوٹی سی سلاخوں دار کھڑکی۔ مسہری کے بجائے چوبی تختہ جس پر بکری کی اون کا گلیم بچھا تھا۔ اس پر بھیڑ کی اون کا کھردرا لبادہ میرے لئے تیار رکھا تھا ایک تسبیح سیاہ سرہانے ایک شمعدان دیوار پر سیاہ صلیب اور موزیک کا ایک چھوٹا سا بازنطینی آئیکن۔ تپائی پر ایک سنگی پیالہ، ایک رکابی، لکڑی کا ایک چمچہ۔ بوڑھی راہبہ گیلری میں چلی گئی۔ میں نے مرواریدسے مرصع ارغوانی طاس کا قباچہ اتارا۔ کھردری ردا پہنی۔ قباچے کا بنڈل بنا کر راہبہ کو تھما دیا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے یسوع کے آئیکن کے سامنے دو زانو جھک گئی"۔

میں نے بات ختم کی۔ فادر اس اثنا میں سگرٹوں کا آدھا پیکٹ پھونک چکا تھا۔

"اس کے بعد ——؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"وہ بڑا پر آشوب زمانہ تھا۔ ہمارا شہنشاہ ہرکلیس مستقل عربوں سے جا بھڑتا۔ اور بُری طرح ہار جاتا۔ ہمارے چند بزرگ پادریوں کا کہنا تھا کہ ہم لوگ اس قدر گمراہ اور گنہ گار ہو چکے ہیں کہ خدا ہم سے خفا ہے۔ ہمارے تیسفون آنے سے چند سال قبل ہی وہ لرزہ خیز واقعہ ہوا تھا جب صحرائے عرب سے نکل کر دو فقیر نما ایلچی ایک بے انتہا اہم مراسلہ لے کر شاہ ایران کے پاس آئے تھے۔ جس طرح کا مراسلہ ایسے ہی درویش نما ایلچی ہمارے قیصر کے پاس لائے تھے۔

اور جیسا تحقیر آمیز سلوک اس نے ان کے ساتھ کیا تھا اسی طرح شہنشاہ خسرو پرویز نے استہزا کے ساتھ وہ خط پڑھا اور ایلچیوں کو دربار سے نکال دیا۔ اس کے چند برس بعد ہی دولت ساسانیہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو گئی۔ جب ہم لوگ مدائن میں تھے وہ شاہ خسرو کے آخری جانشین کا دور تھا۔ وہ اب بھی اپنی طلائی کرسی پر پردے کے پیچھے اکڑا ہوا بیٹھا رہتا تھا۔

"خانقاہ میں محبوس، بیرونی دنیا سے میرا مکمل قطع تعلق ہو چکا تھا۔ کچھ عرصے بعد دمشق سے آنے والے چند پادری یہ خبر لائے کہ شاہ نے جو لشکر کچھ عرصے سے عربوں کے خلاف کلدانیہ بھیج رکھا تھا اس کے جوابی حملے میں کیلف کی فوجوں نے تیسفون ہی کا صفایا کر دیا۔ ابا اس جنگ سے ذرا قبل قسطنطنیہ واپس بلا لئے گئے تھے۔ شام و مصر ہمارے ہاتھوں سے نکلے۔ ایران آلِ ساسان نے کھویا۔ مجھے ابا کی طرف سے بڑی فکر تھی۔ اور تینوں جوان فوجی بھائی۔ جانے اب ان کو کس کشتن گاہ میں بھیج دیا جائے۔ میں صبح شام دعائیں مانگا کرتی۔ عبادت کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔

"لیکن عجیب بات یہ تھی کہ نئی حکومت نے ہمارے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا۔ سنا گیا وہ کہتے تھے کہ وہ اپنے پروفٹ کے اس چارٹر پر عمل کر رہے ہیں جو انھوں نے خانقاہ سینٹ کیتھرین کے راہبوں کو دیا تھا۔"

"غروب آفتاب کے بعد جب ہم میں سے کوئی راہبہ برجی کے چل چراغ میں قندیل روشن کرنے کے لئے اوپر جاتی تو لبنان اور فلسطین اور مصر کی سمت جانے والے کارواں گھنٹیاں بجاتے اپنے اپنے حدی خوانوں کی قیادت میں پہاڑی راستے پر سے گذرتے نظر آتے۔ کبھی کبھی ان میں سے کوئی آواز دیتا —— بنی عیسیٰ روح اللہ کی امت والیو۔ تم پر سلامتی ہو۔ جواباً ہم دیر تک قندیل اٹھائے برجی میں کھڑے رہتے یہاں تک وہ ابن السبیل دھندلکے میں کھو جاتے۔

"دمشق اور یروشلم کی عیسائی امیر زادیاں اپنی خواصوں اور غلاموں کے ساتھ ہمارے

عیسیٰ کدے میں مدفون وُلی شمعون کے مزار پر بیش قیمت چادریں[1] چڑھانے آتیں اور میں بڑے رشک سے ان کی زرق برق پوشاکیں دیکھا کرتی۔

"ایک صبح میں چھت پر کبوتروں کو دانہ کھلا رہی تھی جب دور سے ایک قافلہ آتا دکھائی دیا۔ آگے آگے سفید گھوڑے پر ایک شہزادی سوار تھی۔ باقاعدہ سنہرا تاج سر پہ بائیں ہاتھ میں سینٹ جارج کا پرچم۔ گورنمنٹ کے دو عرب افسر گھوڑوں پر سوار اس کے دائیں بائیں آرہے تھے۔ میں نے حیرت سے سوچا کس ملک کی ملکہ ہے —— وہ گرجستان کی شہزادی کاتنکا تناتن تھی"۔

جوں ہی میں نے یہ نام لیا فادر گریگری چونک پڑا اور جلدی جلدی سگریٹ کا کش لگانے لگا۔ میں نے قصہ جاری رکھا۔

"وہ اتنی دور دراز کی مسافت طے کر کے ولی شمعون کے مزار کی زیارت کرنے آئی تھی۔ امیر المومنین کے افسروں نے اس کو خانقاہ تک احترام سے پہنچایا۔ بڑی البیلی شاندار، منچلی شہزادی تھی جو بانکے مسلمان شہسوار اسے پھاٹک تک چھوڑنے آئے تھے ان سے اتنی دیر تک میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی کہ ہم لوگ جو اس کے استقبال کے لئے نکلے تھے کھڑے کھڑے تھک گئے۔

"ہم چار راہبات اس کی میزبانی پر مامور کی گئیں۔ شہزادی ہمارے ہاں ایک ماہ مہمان رہی۔ خانقاہ اور گرجا کو زر و جواہر نذر کیا۔ ولی کے مزار پر مشجر زربفت کی چادر چڑھائی جس کے کناروں پر یاقوت اور زمرد سے گلِ صنوبر کی بیل بنائی گئی تھی۔

"چلتے وقت شہزادی نے ہماری ایبس سے درخواست کی کہ اس نے اپنی ریاست میں ایک نئی خانقاہ اور پرستش گاہ تعمیر کی ہے اس کی دیکھ بھال کے لئے چند تجربہ کار راہبات

---

[1] اولیا کے مزاروں پہ چادریں چڑھانے کی رسم مسلمانوں نے قرونِ اولیٰ کے عیسائیوں سے سیکھی۔ (ق۔ح)

کو اس کے ساتھ بھیج دیں ایبس نے مجھے اور تین لڑکیوں کو حکم دیا کہ شہزادی کے ساتھ جار جیا روانہ ہوں۔ میں بہ خوشی تیار ہو گئی۔ باقی راہبات میں سے دو تو راستے میں ہی مر گئیں۔ وہ دونوں بے چاریاں قبطی لڑکیاں تھیں، راستے میں پہاڑوں کی شدید سردی برداشت نہ کر سکیں تیسری لڑکی یونانی تھی۔ اس کے باپ نے اسے بھی زبردستی خانقاہ میں ٹھونس دیا تھا۔ وہ طرابزون کے قریب قافلے سے بچھڑ گئی اور کہنے والے کہتے ہیں کسی عرب یا بازنطینی تاجر کے ساتھ بھاگ گئی۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔

"اسی شہزادی نے اس پہاڑی پر یہ رباط تعمیر کروایا تھا۔ یہ سامنے والا گرجا بہت بعد میں بنا ہوگا۔ میں مرتے دم تک یہاں رہی۔ اکثر مجھے اپنے گھر والوں کی یاد آتی اور فکر ستاتی بازنطیم سے جارجیا تاجر اور پادری مستقل آیا جایا کرتے تھے۔ ان سے وہاں کی خبریں معلوم ہوتی رہتیں۔ ضوابط کے مطابق میں اپنے ماں باپ سے خط و کتابت نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ اب وہ سب میرے لئے اجنبی تھے۔ میرا رشتہ صرف خدا سے تھا۔ بازنطیم سے آنے والے پادری بتایا کرتے: قسطنطین دوئم کو اس کے بیٹے تھیوڈوسس نے قتل کیا۔ پھر اس کے بیٹے قسطنطین پوگونےٹس نے اپنے بھائیوں ہرقل اور ٹائی بیریس کی ناکیں ہی کاٹ ڈالیں چھری سے۔ اور بے شمار پادری مصلوب کئے گئے۔ پھر ایک خانہ بر انداز نے جو یہ جانتا تھا کہ میں کون ہوں، باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ پچھلی خانہ جنگی میں جو قتل عام ہوا اس میں وزیر اسٹیفن ہونوریس اور اس کے تینوں بیٹے ہلاک ہوئے۔ لیڈی آئرینا ماریہ بہت پہلے قضائے الٰہی سے گزر چکیں۔

"اس رات میں اپنے حجرے میں رات بھر بلک بلک کر مسلسل زار و قطار روئی۔ برف کے پانی سے آنکھیں دھو کر فجر کی عبادت میں شامل ہوئی۔ اس کے بعد میں نے شجرستان اور گل کدے کے درختوں، پھول پتوں، چرندوں، پرندوں، تیتریوں سے بھی اپنا دل ہٹا لیا کہ یہ سب مظاہر قدرت کسی نہ کسی طور سے دل کو راحت بخشتے تھے۔ اور مسرت کی علامت تھے۔ محض الم ——— خالص اندوہ اور کرب میرا حصہ تھے۔ اور وہ مجھے پوری طرح ملا۔ میں گھنٹوں

سجدے میں پڑی رہتی۔ مسلسل روزے رکھتی۔ ٹاٹ اوڑھ کر سر پر راکھ ڈال کر اپنے پچھلے کردہ اور ناکردہ دانستہ اور نادانستہ گناہوں کی معافی چاہتی۔ لیکن فادر گریگری۔ ہم یونانیوں کے ہاں جو کتھارسس کا تصور ہے وہ بالکل لغو ہے۔ کتھارسس کوئی چیز نہیں۔ کربِ پیہم ہے۔ خداوندِ مسیح کا صلیب پر سہا ہوا کرب حقیقت کی بنیادی حقیقت ہے۔"

"اب میرے زہد و تقویٰ، حلم و مسکینی و فروتنی کی شہرت کوہستان قفقاز میں دور دور تک پھیل گئی۔ لوگ میرے پاس دعا درود کے لئے آنے لگے۔ اتفاق اور خدا کی رحمت سے ایسا ہوا کہ بہت سے مریضوں کے لئے میں نے دعا کی اور وہ اچھے ہو گئے۔ اپاہج اور بوڑھے ڈولیوں میں بیٹھ بیٹھ کر میرے پاس آنے لگے۔ پھر ایک چھوت لگنے والی خطرناک بیماری کا مریض آیا۔ میں نے اس کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیا۔ وہ تو اچھا ہو گیا میں اسی مرض میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ اب مجھے یاد نہیں وہ کیا مرض تھا۔ مرتے وقت میری عمر ۴۵ برس کی تھی۔ میرا تابوت دستور کے مطابق اسی خانقاہ کے تہ خانہ میں رکھ دیا گیا۔"

"بہت حسین تھیں؟" فادر نے پوچھا۔

"بے حد۔"

"میں بھی۔"

اس وقت خدایا۔ معاف کرنا میرے دل میں خیال آیا ـــــ یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش، جب یہ زندہ تھا اور فادر نہیں تھا اور یہ گرینڈ ڈیوک آف طبلسی کا بیٹا تھا اور میں سفیر بازنطیم کی حور لقا لڑکی۔ اس وقت اگر ہماری ملاقات ہوتی ـــــ مگر تیری مصلحتیں تو ہی جانے ـــــ میں نے فادر کو اپنے قصے کے انجام سے آگاہ کیا۔ "میرے مرنے کے بعد زائرین یہاں آنے لگے۔ چند معجزے مشہور ہو گئے۔ صدیاں گذرتی گئیں۔ ۱۸۷۲ء میں کلیسا نے فیصلہ کیا کہ کسی برگزیدہ بندے یا بندی کو سینٹ قرار دینے کے لئے درجۂ ولایت کی جن شرائط کو پورا کرنا لازم ہے مثلاً چند مصدقہ مستند معجزے۔ مستند حالاتِ زندگی وغیرہ۔ اگر میرے کوائف ان شرائط کو

پورا کرتے ہوں تو مجھے سینٹ بنا دیا جائے گا۔ برسوں یہ تحقیقات چلاکیں حسب معمول میرا کیس ماسکو کے اسقفِ اعظم کے پاس بھیجا گیا۔ بالآخر فیصلہ کیا گیا کہ ۲۵ نومبر ۱۹۲۱ء کے روز مجھے سینٹ فلورا سابینا بنا دیا جائے گا۔ اس روز میرا جشن منانے کی تیاری کی جارہی تھی۔ مگر اسی تاریخ سے چند روز قبل یہ چرچ اور خانقاہ بند کردی گئی۔ لہٰذا آفیشل طور پر میں سینٹ فلورا نہیں ہوں۔ ویسے شاید ہوں۔ فادر اب تم بتاؤ تم نے ترکِ علایق کیوں کیا۔ دنیا صرف مردوں کے لئے بنائی گئی ہے۔ وہ خانہ فروشی کیوں کرتے ہیں؟ کیا وہی پرانا قصہ ——— محبوبہ کی بے وفائی ——؟"

وہ چپ رہا۔

خداوندا ——— میں انتہائی عجز سے اقرار کرتی ہوں کہ عورت کی فطرت ——— ساڑھے تیرہ سو برس موت کی نیند سونے کے بعد بھی نہیں بدلتی۔ میں نے بڑی دلچسپی سے کریدا۔ "فادر گریگری ——— کیا شہزادی کاتنکا تناتن ہی تمہاری بے وفا محبوبہ تو نہیں تھی؟ کیوں کہ خدا بخشے وہ بڑی دل پھینک اور عاشق مزاج خاتون مشہور تھی ——— کیا اس کی وجہ سے تم خانہ برانداز ہوئے ؟"

فادر نے ترشی سے جواب دیا۔ "لیڈی فلورا۔ کیوں تم گڑے مُردے اکھیڑتی ہو"۔

"ہاہاہا"۔ میں نے اس کے سنس آف ہیُومر کی داد دی۔ بلکہ بلیک ہیومر۔ اس نے مضطرب انداز سے ایک اور سگریٹ سلگایا۔

میں نے کہا ——— "فادر ——— زیادہ تمباکو نوشی تمہارے پھیپھڑوں کے لئے نقصان دہ ہے" ——— معاً خیال آیا ——— یہ بھی بلیک ہیُومر ہے۔

"برسبیل تذکرہ۔ تمہاری اس بے صد دین دار تاتنکا نے جارجیا پر عرب تسلط کے فوراً بعد طفلس کے ایک عرب جنرل سے بیاہ رچا لیا تھا"۔ فادر نے خشکی سے کہا۔

"ارے"۔ میں بھونچکی رہ گئی۔

"ظاہر ہے یہ تمہاری وفاتِ حسرت آیات کے بعد کا واقعہ ہے۔ میں لاکھ گرینڈ ڈیوک

کا بیٹا سہی مگر عرب تسلط کے بعد میری کیا حیثیت تھی۔ میں تو اپنی جاگیر کے معاملات سے بھی بے نیاز سارا وقت طفلس کے دارالمخطوطات میں گزارتا تھا۔ شہزادی تاتنکا ہوا کا رخ پہچانتی تھی۔ زمانہ اب عربوں کے ساتھ تھا۔ میں سیاست سے متنفر اور تاتنکا سیاسی داؤ پیچ کی استاد۔ مجھے پہلے پہلے بہت صدمہ ہوا۔ جذباتی اور ذہنی۔ پھر میں نے سوچا میاں گریگری اور بلیانی۔ عورت ذات اس لائق نہیں کہ اس کے لئے رو یا دھویا جائے۔ تضیع اوقات۔ رہیں حسین لڑکیاں۔ تو ان کی کہیں کمی نہیں۔ وہ کون سی ناقابلِ حصول اشیاء ہیں؟ چنانچہ میں نے کتابوں میں جی لگایا۔ مگر طبلسی کے اسکرپٹوریم میں مستقل ریسرچ کے لئے ان راہبوں کے سلسلے میں شامل ہونا ضروری تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ راہب بھرتی ہو گیا۔ چند ماہ بعد قرطاجنہ چلا گیا۔ اور خاص اس مدرسے میں کام کیا جہاں سینٹ آگسٹین نے پڑھا تھا۔ پھر روما گیا۔ ایتھنز گیا۔ تمھارے وطن قسطنطنیہ گیا۔ نہیں۔ اپنی سیاحت کے دوران تمھارا تھیوڈورک گیلاسس مجھے کہیں نہیں ملا۔ کہیں مر مرا چکا ہوگا۔"

"خدا نہ کرے"۔ میں بے ساختہ بول اٹھی۔ فادر ہنسنے لگا۔ "پھر بحیرۂ اسود کے راستے گرجستان واپس آیا۔ نہیں۔ میں شہزادی کا تنکا کے کانونٹ بھی کبھی نہیں آیا۔ وہ سامنے جو نیلگوں سلسلۂ کوہ دیکھتی ہو نا ——— اس کے دامن میں ایک رباط خانہ فردشاں موجود تھا۔ حملہ آوروں کی وجہ سے اس کی قلعہ بندی کی گئی تھی۔ چند راہبوں نے فرازِ کوہ میں پتھر کاٹ کر اپنے پوشیدہ حجرے تعمیر کئے تھے۔ بہت سے نوجوان خانہ فردش غاروں میں رہتے تھے۔ میں نے ایک الگ تھلگ چوٹی کے غار میں اپنا مسکن بنایا۔ سامنے پتھروں کی دیوار چُن کر اس پر خوش رنگ پھولوں کی بیلیں چڑھائیں۔ قداس کے لئے ہم لوگ وادی کے کینسہ کبریٰ میں جایا کرتے تھے اور کھانا مل جل کر رباط کے ہال میں کھاتے تھے۔ ہم میں سے بہت سے خانہ بہ انداز اسکالر رہ چکے تھے۔ رات کو اکثر علمی معاملات پر بحثیں ہوتیں۔ کوئی شامت کا مارا نسطوری ماورالنہر سے آنکلتا تو اس سے جھائیں جھائیں کرتے وہ کہتا عذرا مریم مادر یسوع ہیں۔ مادر خدا نہیں۔

ہم کہتے تمہارے پاس کیا ثبوت ہے۔ وہ کہتا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے ؟ —— کوئی سیرین پادری آپہنچتا اس سے جھڑپ رہتی۔ وہ کہتا مسیح کی وحدتِ فطرت کے قائل ہو جاؤ۔ ہم کہتے ہرگز نہیں ہوں گے۔ ان جھگڑوں سے تنگ آکر کئی راہب طفلس پہنچے اور مسلمان ہو گئے۔

"غرضیکہ بڑا اچھا وقت گزر رہا تھا۔ عید میلاد المسیح سے دو روز پہلے کی بات ہے میں صبح منہ اندھیرے باورچی خانے کے لئے لکڑیاں کاٹنے جنگل میں گیا۔ سارا جنگل برف پوش تھا۔ وادی میں کلیسا کے سریلے گھنٹے بج رہے تھے۔ اور خرگوش اور گلہریاں میرے چاروں طرف دوڑتی پھر رہی تھیں۔ سینٹ گریگری کی ایک کونٹا کیا گنگناتے گنگناتے میں نے زور سے کلہاڑی جو درخت کے تنے میں ماری وہ آکر میرے پانو میں لگ گئی۔ میں نے فوراً تھوڑی سی برف سے زخم صاف کر کے ہرے پتوں کی پٹی باندھی۔ لکڑیاں کاٹ کر خانقاہ واپس آیا۔ اور روزمرہ کے مشاغل میں مصروف ہو گیا۔ رات کو اپنے حجرے میں جا کر سونے سے پہلے حسب معمول موم بتی جلائی اور سینٹ آگسٹین کے اعترافات کا مطالعہ شروع کیا۔ کلہاڑی کے زہر باد سے صبح تک ختم ہو چکا تھا۔ وقت رحلت سن شریف ۴۵ سال تھا مجھے معلوم نہیں اس مرقد میں کب اور کیوں منتقل کیا گیا ؟"

شاید شہزادی کاتنکا نے تابوت یہاں منگوا لیا ہو۔ میں نے سوچا لیکن خاموش رہی الاؤ بجھ چکا تھا۔ سرد ہوا میں ہمارے ڈھانچے کھڑکھڑانے لگے۔ فادر گریگری نے کہا:

"آئیے چل کر کہیں سے گرم کپڑے تلاش کریں۔ خدا ہمارے ساتھ ہے"۔

صنوبروں کے جنگل سے گزر کر ہم دونوں تیرے ایک گرجا میں پہنچے جو نسبتاً بہت جدید تھا یعنی گرجستان کی ملکہ گورانؔ دخت نے گیارہویں صدی میں بنوایا تھا۔ یہ شاید ایک "فنکشننگ چرچ" تھا کیوں کہ اندر تیرے مرصع طلائی آئیکنوں کے سامنے اونچے شمع دان روشن تھے اور معبد عذرا کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ ہم اندر گئے۔ گیلری میں ایک الماری نظر آئی جس

میں پادریوں کے سیاہ چوغے لٹک رہے تھے۔ پادری شاید اپنے مکان میں محوِ خواب تھا۔ فادر گریگری نے الماری میں سے دو لبادے مع ہُڈ چُرا لئے جو ہم دونوں نے فوراً پہن لئے۔ جان میں جان آئی۔ عین اسی وقت الماری کے پیچھے ایک پرچھائیں دکھلائی دی۔ ایک شخص، چارخانہ کوٹ، براؤن پتلون، سر پر گھنے کھچڑی بال، موٹے شیشوں کی عینک۔ وہ بھی ایک چوغہ چُرانے میں مصروف تھا۔ ہمیں دیکھ کر الماری کے پیچھے دبک گیا۔ ہم دونوں فوراً باہر آ گئے اور اس شخص کے ڈر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ لڑکھڑاتے کھڑکھڑاتے پہاڑی اترنے لگے۔ چند منٹ بعد پلٹ کر دیکھا وہ شخص بھی ایک خانہ فروش کے سادے لبادے میں ملفوف ہمارے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ ہم نے جلدی سے خیمہ گاہ کا رخ کیا تاکہ وہاں کے مجمع میں کھو جائیں۔ لیکن وہاں سے لڑکے اور لڑکیاں اب اپنے اپنے بیگ اٹھائے جہاز کی سمت بڑھ رہے تھے جو نزدیک جیٹی پر کھڑا تھا۔

ایک لڑکا اور لڑکی باتوں میں محو ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ان کی پشت پر جو بیگ بندھے ہوئے تھے ان میں دو دو جوڑی چمڑے کے دستانے آویزاں تھے۔ فادر گریگری نے فوراً ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ اس کے بعد وہ ایک خالی خیمہ میں گھس گیا اور وہاں سے دو جوڑ فل بوٹ اور دو مفلر اڑا لایا۔ ایک اور خیمے سے سیاہ چشمے دو عدد پار کئے اب ہم دونوں نے ایک درخت کے پیچھے جاکر فل بوٹ اور سموری استر والے چرمی دستانے پہنے گوگلز سے آنکھیں اور مفلر سے گردنیں چھپائیں اور بیسویں صدی کے پچھترویں سال کا مقابلہ کرنے کے لئے کمربستہ ہوئے۔ اب ہمیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ دو مُردے جا رہے ہیں۔ ہمارے چہرے ہُڈ میں چھپے ہوئے تھے۔ آنکھیں گوگلز میں۔ جیتے جاگتے راہب اور راہبہ معلوم ہو رہے تھے۔

اب پو پھٹنے والی تھی۔ دریا پر گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ جہاز نے روانگی کا بھونپو بجایا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کا غول گاتا بجاتا گینگ وے پر چڑھنے لگا۔ وہ کوئی سو طلباء تھے۔ ہم بھی ان کی بھیڑ میں جا گھسے اور جہاز پر چڑھ گئے۔ دھند لکے پر بھیڑ بھڑکے میں ہمیں کسی نے نہیں دیکھا۔ جہاز پر پہنچ کر اب جو پلٹ کر دیکھتی ہوں تو وہ شخص پراسرار موجود۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ

لگا رہا۔ ہم پھرتی سے ایک اندھیرے کونے میں دبک گئے وہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ جہاز نے لنگر اٹھایا اور جنوب کی سمت روانہ ہوا۔

ہم دونوں بھوک پیاس اور نیند سے بے نیاز تھے۔ اس تیسرے پر کیا گذر رہی ہوگی اس کا اندازہ ہمیں نہیں ہوا۔ لیکن وہ بالکل چپکا بیٹھا رہا۔ دوسری رات جہاز بالوطی پر لنگر انداز ہوا۔ خوش و خرم اور صحت مند، تر و تازہ، گاتے بجاتے نوجوانوں کے جم غفیر کے ساتھ ساتھ ہم تینوں جہاز سے اتر کر ساحل پر آگئے۔ اور جلدی جلدی ایک طرف کو چلنے لگے۔ پتہ ہی نہیں تھا کہ کدھر جا رہے ہیں۔ غرض محض بھاگنے سے تھی۔ سال بھر کے ایڈونچر کی خواہش جو تجھ سے کی تھی۔

چلتے چلتے ہم لوگ ایک جگہ پہنچے جہاں بہت ساری کشتیاں کھڑی تھیں۔ ابھی سورج نکلنے میں دیر تھی اور ساحل سنسان پڑا تھا۔ فادر گریگری نے ایک موٹر بوٹ کا رسہ اس کے کھونٹے سے علیحدہ کیا اور تیرا نام لے کر اس میں کود گئے۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے سوار کرایا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ وہ تیسرا کنارے پر موجود۔ یا اللہ۔ سنا تھا کہ موت زندگی کا تعاقب کرتی ہے۔ یہاں الٹا حساب تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر زور سے کہا ــــ مجھے بھی ساتھ لے چلو ــــ مجھے بھی۔ اس نے پہلی دفعہ بات کی تھی۔ فادر نے اشارے سے اس کو بوٹ میں بلا لیا۔ اور انجن اسٹارٹ کیا۔ اس مہارت سے گویا ساتویں صدی عیسوی کے دریائے کرا میں آپ موٹر بوٹ ہی پر طفلس آیا جایا کرتے تھے۔

وہ شخص نامعلوم آکر ہمارے برابر بیٹھ گیا۔ فادر گریگری نے ایکدم پروفیشنل آواز میں دریافت کیا ــــ "پیارے بیٹے تمھیں کیا تکلیف ہے۔ تم ملکہ گوران دخت کے گرجا سے لے کر یہاں تک ہمارا تعاقب کیوں کر رہے ہو ــــ؟"

معاً مجھے مخاطب کیا ــــ "یہ جیٹ کشتی ہے ــــ" پھر اس آدمی کی طرف متوجہ ہوئے "ہاں۔ تو پیارے بیٹے تمھیں کیا تکلیف ہے۔؟"

اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے کہا" فادر۔ میں ایک ڈسی ڈنٹ انٹلکچوئیل ہوں۔ ویسٹ کو ڈی فیکٹ کر رہا ہوں۔ میری مدد کرو"۔

"ویسٹ ــــــ؟" فادر نے فوراً کشتی کا رخ مغرب کی طرف کر دیا۔ "بلغاریہ کی کون سی بندرگاہ جانا چاہتے ہو؟" اس لمحے فادر گریگری اور بیلیانی کی کھوپڑی سے علوم حاضرہ اور معلوماتِ عامہ شاید عارضی طور پر غائب ہو چکی تھی۔ یا ان کی کھوپڑی اس وقت کہیں اور تھی۔ بہر حال۔ اس شخص نے گھبرا کر کہا ــــــ "فادر شاید آپ ۱۹۴۵ء کے بعد سے اپنی خانقاہ سے سے باہر نہیں نکلے"۔

"۱۹۴۵ء میں میں طبلسی میں تھا" ــــــ فادر بولا۔ مگر شکر ہے موٹر کے شور میں اس شخص نے یہ بات نہیں سنی۔ وہ کہتا رہا۔ "فادر۔ ویسٹ اب دیوارِ برلن کے دوسری طرف سے شروع ہوتا ہے ــــــ"

خداوندا۔ میں بھولی بھالی حوا کی ناقص العقل بیٹی۔ میں بول اٹھی :

"دیوارِ چین تو میں نے بھی سنی ہے ــــــ سدِ سکندری اور دربند ہمارے کوہستان قفقاز ہی میں موجود ہیں ــــــ یہ دیوار برلن کہاں ہے؟"

فادر نے مجھے ٹہوکا دیا کہ چپ رہوں۔ اس لحظے فادر گریگری کی ساری "عصری حسیت" واپس آ چکی تھی انھوں نے موٹر بوٹ کا رخ ترکی کی طرف کر دیا۔ کشتی کھلے سمندر میں فراٹے بھرتی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ فادر نے اس ڈسی ڈنٹ انٹلکچوئیل سے کہا "پیارے بیٹے۔ خدا کو یاد کرو۔ جس نے یونسؑ پیغمبر کو بچایا۔ ہمارا ابھی حافظ و ناصر ہے اور سمندروں کا ستارہ ــــــ عذرا مریم ہماری رہنمائی کرنے والی ہیں ــــــ"

"آمین ــــــ" میں نے کہا۔ "پیارے بیٹے۔ خداوند کریم بادبانی جہازوں اور کاروانوں کے رہبر کو یاد کرو۔ میں امید کرتی ہوں کہ تم صحیفۂ اولیاء اور مسیحی شہیدوں کے احوال، پابندی سے پڑھتے ہو گے"۔

اس نے جواب دے دیا : "میں صرف ملارمے، کافکا، اور بودلیئر کا مطالعہ کرتا ہوں"۔

خدایا۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے ان اولیاء کے نام پہلے نہ سنے تھے۔

ربّ العالمین ــــــ اس کے بعد کا سارا احوال تجھ پر روشن ہے۔ ہم کس طرح کن ایڈونچرز کا سامنا کر کے بالآخر دی آنا پہنچے۔ وہاں کس طرح ہمارا خیر مقدم ہوا۔ ڈسی ڈنٹ انٹلکچوئیل نے کس طرح پریس کانفرنس بلائی۔ ٹی۔ وی اور پریس سے انٹرویو کتابوں کے کنٹریکٹ۔ دعوتیں اور عصرانے۔ میں اور فادر گریگری ہر جگہ ساتھ۔ لیکن دی آنا پہنچتے ہی فادر نے ڈسی ڈنٹ انٹلکچوئیل سے کہہ دیا تھا کہ تم سب کو اچھی طرح سمجھا دو ایں اور مدر فلورا دونوں کلیسائے گرجستان کے ایک ایسے قدیم ترین آرڈر سے تعلق رکھتے ہیں جس کے اراکین مرتے دم تک مکمل طور پر خاموش رہنے کا عہد کر چکے ہیں۔ لہٰذا ہم دونوں کو انٹرویو دینے سے معاف رکھا جائے۔ روزمرہ کی ضروریات کے متعلق ہم دونوں ایک پرچی پر چند الفاظ لکھ دیا کریں گے۔ علاوہ ازیں ہم تصویریں بھی نہیں کھنچوائیں گے کہ یہ اظہارِ خودستائی و خود نمائی ہے انٹلکچوئیل نے یہ پیغام صحافیوں کو دے دیا۔ ایک تہلکہ مچ گیا۔ اب ورلڈ پریس میں سرخیاں چھپیں۔ "فادر گریگری اور مدر فلورا کا ہمیشہ کے لئے خاموش رہنے کا عہد"۔ اس کے بعد پیرس میں ایک صحافی نے اصرار کیا : "میرے سوالات کا جواب پرچے پر لکھ کر دے دیجئے"۔ فادر نے جواباً لکھا "میں بوجوہ کچھ نہیں کہنا چاہتا"، چنانچہ مزید سرخیاں : "فادر گریگری کا بیان۔ وہ بوجوہ کچھ کہنا نہیں چاہتے"۔

پیرس سے ہم لوگ لندن لے جائے گئے۔ وہاں بھی یہی ہنگامہ رہا۔ اب ہمارا معمول یہ تھا کہ انٹلکچوئیل میڈیا کے نمائندوں میں گھرا رہتا۔ فادر گریگری کتب خانوں میں وقت گزارتا۔ میں ونڈو شاپنگ کرتی پھرتی۔ ہم لوگ بہترین ہوٹلوں میں ٹھہرائے گئے۔ پریس نے ہماری "خواہشات کا احترام" کر کے مجھے اور فادر کو بالکل تنہا چھوڑ دیا تھا۔ ہمارے میزبان بھی اگلے دن کے پروگرام کے متعلق جو کچھ کہنا ہوتا ڈسی ڈنٹ انٹلکچوئیل کو بتا دیتے تھے۔

ایک مہینے بعد، یا غفور و رحیم۔ تجھے بخوبی علم ہے کہ ہم تینوں امریکہ مدعو کئے گئے۔

جہاں پروگرام کے متعلق ہم تینوں مستقل سکونت اختیار کرنے والے تھے۔ انٹلکچوئیل اب بے طرح مصروف تھا۔ اپنی کتاب اور سلسلہ وار مضامین کے لئے نہایت کثیر رائلٹی پیشگی وصول کرچکا تھا اور عیش کر رہا تھا۔ ہم لوگ نیویارک، ہلٹن میں ٹھیرائے گئے۔ اب یہاں مجھے اور فادر کو اسی مسئلے کا سامنا کرنا پڑا جس نے ہم کو مغربی یوروپ اور انگلینڈ کے ہوٹلوں میں پریشان کیا تھا۔ الٰہی تو واقف ہے کہ ہم دونوں بھوک، پیاس، نیند اور باتھ روم جانے کی حاجتوں سے بے نیاز تھے۔ لہٰذا ہم اپنے کمروں میں نہ بریک فاسٹ منگواتے۔ نہ کھانا کھانے کے لئے نیچے جاتے۔ نہ روم سروس کو کسی ضرورت کے لئے فون کرتے۔ لیکن سب سے بڑا معاملہ باتھ روم تھا۔ کموڈ پر بندھے کاغذی ربن جوں کے توں سلامت رہتے۔ تولیہ، صابن، واش بیسن ہر چیز UNTOUCHED صبح کو میڈ صفائی کے لئے آتی تو متحیر ہوتی۔ فادر سے اس سلسلے میں بات کرتے مجھے شرم آتی تھی۔ آخر ایک دن میں نے اس سے کہا، وہ بولا ——

"عورت واقعی ناقص العقل ہے۔ یہ تو بڑی آسان ہے۔ میں کاغذی ربن علیحدہ کر دیتا ہوں۔ واش بیسن کے آس پاس پانی چھڑک دیتا ہوں۔ ذرا سا چھینٹا صابن پر ڈال دیتا ہوں۔ یہ کوئی پرابلم نہیں۔" کھانے پینے کے متعلق ہم نے دی آنا ہی میں اپنے میزبانوں سے کہہ دیا تھا کہ ہم دونوں مسلسل روزے رکھتے ہیں اور رات کو محض جو کی روٹی پیاز پنیر اور سادے پانی سے افطار کرتے ہیں۔ چنانچہ نہایت پرتکلف نقرئی کشتیوں اور بڑھیا برتنوں میں نیپکن سے ڈھکی "افطاری" ہمیں شام کے وقت ہمارے کمروں میں پہنچادی جاتی تھی جسے ہم کاغذی بیگ میں رکھ کر صبح کو باہر لے جاتے اور سڑک کے کنارے ڈسٹ بن میں ڈال آتے۔ لیکن ہلٹن میں قیام کے چوتھے روز فادر نے مجھ سے کہا۔ "ہمارے میزبانوں نے ہمیں الاسکا کی گرہ یک اور تھوڈوکس خانقاہوں میں بھیجنے کا انتظام کیا ہے۔ نیچے آؤ تو میں تم سے مشورہ کروں۔"

میں گھبرائی ہوئی نیچے گئی۔ فادر نے کہا —— "میں نے ابھی ابھی کمیٹی کے سکریٹری سے بات کی ہے اور اس سے کہا ہے۔ ہم پہلے اپنے چند جارجین رشتے داروں سے ملنے فلاڈلفیا

جائیں گے اس کے بعد کچھ عرصہ نیویارک ہی میں چند عزیزوں کے ساتھ قیام کریں گے کیوں کہ یہاں کتب خانوں میں تھوڑا سا کام کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے مجھے ایک خطیر رقم اس عرصے کے اخراجات کے لئے دے دی ہے۔ کل صبح یہاں سے چیک آؤٹ کر جائیں۔ لہٰذا دوسرے روز ہم ڈسی ڈنٹ انٹلکچوئیل اور اپنے میزبانوں کو خدا حافظ کہہ کر ہلٹن سے سٹک لیے۔ فادر نے ایک معمولی بورڈنگ ہاؤس میں دو کمرے کرائے پر لئے۔ پیسے کی کمی نہیں تھی۔ فادر سائنس اور ٹیکنولوجی اور عالمی سیاست پر تازہ ترین کتابیں خریدتا میں فیشن میگزین۔ وہ کتب خانوں میں وقت گذارتا۔ میں ونڈو شاپنگ کرتی۔ ایک روز، ایک بک شاپ میں میں نے کیا دیکھا کہ فادر پلے بوائے کا بغور مطالعہ کر رہا ہے مجھے دیکھ کر جھینپ گیا۔ بولا۔ اس رسالے میں انٹرویو بہت عمدہ چھپتے ہیں۔ میں ساؤل بیلو پر ایک مضمون پڑھ رہا تھا۔

فادر کتب خانوں سے ایک آدھ کتاب چرا بھی لاتا تھا اور سگریٹ نوشی کی لت ایسی پڑی تھی کہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر مسلسل سگریٹ پیتا تھا۔ پبلک میں سگریٹ پی نہیں سکتا تھا کیوں کہ اس کے لئے ہڈ میں چھپا ہوا چہرہ کھولنا پڑتا۔

سال بھر کی مہلت تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ مہرگان آچکا تھا۔ ہر طرف درختوں میں سرخ پتے جھلملا رہے تھے۔ میری بڑی تمنا تھی کہ کم از کم ایک خوبصورت لباس خرید کر اپنے کمرے میں اسے پہن لوں۔ فادر پکا میل شو ونسٹ تھا میری اس تمنا کو لاپروائی سے نظر انداز کرتا رہا۔ بلکہ میرے حصے کے ڈالر بھی اپنی کتابوں پر خرچ کر ڈالے۔ اکثر جا کر سینما اور تھیٹر دیکھتا۔ مجھ سے کہہ جاتا۔ تمھارے کمرے میں ٹی۔ وی ہے اسے دیکھو۔ اور پھر عبادت کرو۔

ہائے اللہ۔ میں یہ تو بتانا بھول ہی گئی۔ میں نے تیرے بھلکڑ فرشتے سے پوچھا تھا: فرض کرو، ہم وقت مقررہ پر خاص اس مرقد میں نہ پہنچ سکے تو کیا ہوگا۔ اس نے جاتے جاتے جواب دیا تھا کہ تم جہاں بھی ہو کسی نزدیک ترین قبرستان چلے جانا اور دو خالی قبروں میں جا پڑنا۔ سال ختم ہونے والا تھا۔ خدایا تیری اتنی بڑی، اتنی دلچسپ پرکشش اور اتنی ترقی یافتہ دنیا میں، ہم تو

ابھی کچھ بھی نہ دیکھ پائے۔ فادر نے قبرستان تلاش کرنے کا کام بھی مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ خود سیر سپاٹے کے لئے نکل جاتا اور میں گورستانوں کے چکر لگاتی کہ کہیں دو خالی قبریں دکھلائی دے جائیں تو انھیں نظر میں رکھوں۔

واپسی کے لئے اب صرف چند روز باقی رہ گئے تھے۔ پیسہ قریب الختم تھا۔ فادر اس کے لئے تیار نہ تھا کہ میزبانوں کو فون کر کے مزید ڈالر مانگے۔ وہ پوچھتے تم لوگ اب تک یہاں کیا کر رہے ہو، الاسکا کی خانقاہ کیوں نہیں گئے۔ باقیماندہ ڈالر سے (جو میرے حصے ہی کے تھے) میں اپنی پہلی اور آخری خواہش ـــــــ ایک گاؤن خریدنا چاہتی تھی۔ لیکن فادر اس رقم سے عرب آئل کی اقتصادیات اور یورپین کامن مارکیٹ پر دو کتابیں اٹھا لایا۔ میں رو پڑی اس نے کہا۔ "وقت بہت کم رہ گیا ہے دن رات لگ کر یہ پڑھوں گا"۔ پھر مجھے بہلانے کے لئے بولا: "ذرا یہ تو سوچو ہمارے انڈر گراؤنڈ ہو جانے پر ساری دنیا میں کس قدر تہلکہ مچے گا"۔ (میں نے "انڈر گراؤنڈ" کی فوراً داد دی)۔ امریکن اور روسی دونوں یہ سمجھیں گے کہ ہم ڈبل ایجنٹ تھے اور بے چارے ڈسی ڈنٹ انٹلکچوئیل پر آفت آئے گی۔ مگر صورتِ حال ایسی ہے کہ ہم اس غریب کی کسی طرح مدد نہیں کر سکتے۔ آؤ ذرا ٹہل آئیں"۔

ہم گھومنے نکلے۔ ایک عالی شان دوکان میں کرسچین دیور کی تازہ ترین تخلیقات کی نمایش ہو رہی تھی۔ میں فادر کو دوکان میں گھسیٹ لے گئی۔ فیشن شو شروع ہو چکا تھا۔ اس دوکان کا مالک کوئی کیتھولک تھا۔ ہمارے سیاہ لبادے دیکھ کر کسی نے کچھ نہیں کہا۔ ہم جا کر ایک پچھلی قطار میں بیٹھ گئے۔ میں ملبوسات کو اور فادر گریگری ماڈل لڑکیوں کو دیکھتا رہا۔ اچانک میں حیرت زدہ رہ گئی۔ ایک ماڈل لڑکی ارغوانی اطلس کا گاؤن پہنے سامنے سے گزری جس کے کنارے اور پیٹی پر موتی ٹکے تھے۔ تقریباً اسی وضع کا بازنطینی قباچہ میں نے اس رات صحرائے سوریا کی خانقاہ کے حجرے میں آخری بار اتار کر راہبہ کی کھدری ردا پہنی تھی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ نہایت بیش قیمت لباس تھا۔

فادر نے چپکے سے پوچھا۔ "لیڈی فلورا سابینا۔ کیا تم بھی وہی سوچ رہی ہو جو میں سوچ رہا ہوں"؟ میں نے کہا۔ "ہاں۔ فادر گریگری"۔ وہ چپ رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا "تم اب گھر چلی جاؤ۔ میں رات کو آؤں گا"۔ میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔

رات کے دو بجے فادر بورڈنگ ہاؤس پہنچا۔ اس کا کمرہ میرے کمرے کے پہلو میں تھا۔ میں نے کھڑ پڑ کی آواز سنی ہ اس نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے کواڑ کھولا۔ اس نے اپنے کلوک کے اندر سے ایک پیکٹ نکال کر مجھے تھما دیا۔ اطمینان سے کہا ——— "بھیڑ بھڑکے میں ایک بیک روم میں جا گھسا۔ یہ گاؤن سامنے ہی ہینگر پر موجود تھا۔ خدا ہمارے ساتھ ہے"۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر آئل گراسس پر کتاب پڑھنے میں مشغول ہوا میں نے گاؤن پہنا۔ اسس میں PADDING کی کافی سے زیادہ ضرورت تھی۔ دوسرے روز میں بازار سے مطلوبہ سامان خرید لائی۔ پھر دو دن کمرے میں بیٹھ کر سارے گاؤن کے نیچے روئی کا موٹا استر لگایا۔ اب جو پہنا تو معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ ایک ڈھانچے نے زیب تن کیا ہے۔ تیسرے پہر کو فادر میرے کمرے میں آیا، مجھے اس لباس میں دیکھ کر سیٹی بجائی۔ ہم لوگ پارک میں جا کر اپنی پسندیدہ بنچ پر بیٹھ گئے۔ فادر اداسی سے مجھے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے سیاہ لبادے کی جیب سے ایک کتاب برآمد کی اور آہستہ سے بولا "آج میں لائبریری سے آئرلینڈ کے شاعر ڈبلیو، بی، ایٹس کی کتاب چرا لایا ہوں"۔ ہمارے چاروں طرف شاہ بلوط کے خزاں زدہ سرخ پتوں کی بارش ہو رہی تھی۔ سورج ڈوبنے والا تھا اور تاریکی چھا رہی تھی۔ فادر گریگری اور ملیانی نے کہا۔ "اس نظم کا عنوان ہے SAILING TO BYZANTIUM لو سنو"۔ اس نے گمبھیر آواز میں آہستہ آہستہ پڑھنا شروع کیا۔

"وہ سرزمین ضعفا کی نہیں۔ شادماں نوجواں۔ طائرانِ چمن۔ مرتے جاتے ہیں جو اور ہیں محولحن۔ یم بہ یم مچھلیوں کے وہ سیمیں شنا، مرغ و ماہی و انساں، ہر جاندار، جشنِ جاں میں ہے مشغول دقتِ ثمر۔ جوشش دم کی رامشگری میں مگن، بھول جاتے ہیں، ہم نقش ہائے

کہن ۔ ذہن جاوید کے معجزاتِ جلیلؒ۔

"ہے حقیر دتی ایک مردِ کہن ۔ چوب دستی پہ لٹکا ہوا پوستیں ۔ اگر جوش سے روح نہ ہو نغمہ زن، فانی پوشن کے ہر خستہ جاں کے لئے ۔ شعر و نغمہ کی کوئی روایت نہیں، کاملوں سے کرے جو نہ کسب ہنر، اپنی عظمت کی تعظیم خود نہ کرے ۔ تو قلزم بہ قلزم میں باز نطیم کے بلادِ مقدس میں وارد ہوا ہوں ۔

"نقش دیوار کی پچی کاری کے زر سے ۔ شعلۂ قدس میں مستمر عاقلو ۔ آتشِ پاک سے باہر آؤ ذرا ۔

"وقت و تاریخ کی گردش مستقل ـــــ رقص اس میں کرو ۔ پیرِ نغمہ بنو تم مری روح کے ۔ پھونک ڈالو یہ دل ۔ راکھ اس کو کرو ۔ کثرتِ آرزو سے جو ہے مضمحل ۔ جاں بلب جانور سے بندھا ہے اور خود اپنی حالت سے واقف نہیں ـــــ مجھے ابدیت کی صنعت کی آغوش میں کیوں نہ لے لو ۔

"اک بار فطرت سے ہو ماورا، میں، پیکر میں اپنا پھر اس سے نہ لوں گا ۔ مگر ایسا پیکر جو یونان کے کسی استاگر نے ورق طلا سے بنایا ہوا ایسا، غنودہ شہنشاہ جگائے جو رکھے ۔ یا اک شجر زریں پہ میں بیٹھ جاؤں ۔ اور باز نطیم کے امیروں کی خاطر، فلک مرتبت مہ جبینوں کی خاطر میں گیت گاؤں ۔ گاؤں میں اس کا ۔ گزر جو چکا ہے، گزر اب رہا ہے، یا ہونا ہے باقی ۔"

میں بھل بھل رو رہی تھی ۔ فادر نے کتاب بند کر کے ایک لمبی سانس لی اور کہا چلو آخری بار ڈاؤن ٹاؤن ہو آئیں ۔ ہم دونوں پارک سے نکلے ۔ ٹیکسی پر شہر پہنچے ۔ راستے میں ایک شاندار ہوٹل پر لکھا نظر آیا "اسرائیل فنڈ کے لئے ماسک بال" ۔ فادر نے مجھے دیکھا میں نے

لہ ایٹس کا نظریہ تھا کہ انسان اگر تکمیل فن میں مصروف رہے تو اسے زندگی سے کنارہ کش ہونا پڑتا ہے ۔ آرٹ اور زندگی کی DICHOTOMY ایٹس کا خاص مسئلہ ہے ۔

لہ باز نطینی موزیک کی لازوال دیواری تصاویر جو گویا شاعر کی مثالی سامعین ہیں کیونکہ مرگ و فنا سے ناآشنا ہیں ۔

اسے۔ ہم ایک ڈپارٹمنٹ اسٹور پر اتر گئے۔ پارک سے چلتے وقت میں نے اپنا سیاہ لبادہ اپنے گاؤن کے اوپر پہن رکھا تھا۔ حسب معمول سیاہ چشمے، اور ہڈ میں روپوش ہم نے دوکان میں جاکر دو ماسک خریدے اور سنہرے وگ۔ زنانے اور مردانے کلوک روم میں جاکر ہم دونوں تیار ہوئے۔

فادر چلتے چلتے اپنے لئے ایک بڑھیا اسکارف خریدنے لگا۔ تب میں نے اسے پھر یاد دلایا "آج ہماری مہلت کا آخری دن بلکہ آخری شام ہے۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ہمیں انڈر گراؤنڈ ہونا ہے۔ جو قبرستان میں نے تلاش کیا ہے ہمارے جائے قیام سے کافی دور ہے۔ سارے پیسے مت خرچ کردو۔ قبرستان جانے کے لئے ٹیکسی کرنی ہوگی" پھر بھی اس نے قیمتی سگریٹ کا ایک پیکٹ خرید لیا۔ ہم بھاگم بھاگ ہال میں پہنچے۔ داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا۔ ہم نے سب سے کم قیمت کے دو ٹکٹ خریدے۔ صدر دروازے پر فٹ مین نام اناؤنس کر رہا تھا۔ فادر نے (جو اپنے سیاہ لبادے میں تھا صرف چہرے پر ماسک پہن رکھا تھا) متانت سے کہا۔

"پرنسس کاتنکا تناتن آف جارجیا، گرینڈ ڈیوک اور بیلیانی آف طبلسی"۔

ہوٹل کا چوبدار ہمیں انقلاب کے بعد آئے ہوئے سفید روسی سمجھا۔ اندر جاکر ہم دیوار کے قریب ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ بڑا شاندار رنگارنگ مجمع تھا۔ آرکیسٹرا "بلیو ڈینوب" بجا رہا تھا۔

چند منٹ بعد فادر سگریٹ پینے کے لئے باتھ روم چلا گیا۔ میں وہاں چپ چاپ بیٹھی سوچتی رہی۔ اب صرف دو گھنٹے بعد قیامت تک قبر کی تنہائی اور تاریکی۔ تب دفعتاً مجھے وہ دکھلائی دے گیا۔ تھیوڈورک گیلاسس ـــــ وہی سنہرے گھنگریالے بال، لمبا، اونچا، پورا۔ یونانی ناک۔ وہ ایک رومن سینیٹر کا بھیس بدلے ایک "ہسپانوی رقاصہ" کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یہ کس طرح ممکن ہے۔ کیا یہ بھی ایک معجزہ ہے۔ خدایا میں بالکل بوکھلا گئی۔ وہ کئی بار ناچتا ہوا میرے سامنے سے گذرا اور شاید مجھے اپنی طرف متوجہ

پاکر رقص کے بعد خود میرے پاس آیا اور اپنے ساتھ ناچنے کی درخواست کی۔ میں نے ہڑبڑا کر کہا: "میرے پالنوں میں موچ آگئی ہے تھیوڈورک ——"

اس نے صرف آنکھوں پر سیاہ ماسک پہن رکھا تھا۔ وہ آتارا۔ وہ کوئی اور تھا —— میرے تھیوڈورک سے ہلکی سی مشابہت ضرور تھی۔ لیکن کوئی اور تھا۔ بھلا وہ کیسے ہو سکتا تھا۔ مگر مجھ سے رہا نہ گیا انتہائی حماقت سے پوچھا۔ "معاف کیجئے کیا آپ کا نام تھیوڈورک گیلاسس تو نہیں ہے؟" اس نے کہا۔ "جی نہیں۔ میں رچرڈ کوہن ہوں۔ کولمبیا میں پڑھتا ہوں۔" پھر دو چار باتیں کر کے چلا گیا۔ چند منٹ بعد فادر سگریٹ پی کر واپس آیا۔ صوفے پر بیٹھتے ہی دیوار کے کلاک پر نظر ڈالی —— اور کہا "لیڈی فلورا —— اب چلنا چاہئے —— دس بج چکے ہیں —— چلو —— اٹھو ——"

تب اس وقت معاً ایک دہشت ناک خیال میری کھوپڑی میں آیا۔ میں نے بوکھلا کر کافی اونچی آواز میں بزبانِ انگریزی کہا —— (ہم دونوں جب سے لندن پہنچے تھے اور وہاں سے امریکہ، اب مستقل انگریزی میں ایک دوسرے سے بات کرتے تھے۔ فادر کی تاکید تھی —— کہ اس طرح ایک نئی زبان بولنے کی پریکٹس رہے گی۔ میں چڑ کر اس سے کہتی فادر ہمیں صرف چند مہینے اس دنیا میں اور رہنا ہے۔ میں کیوں اپنی کھوپڑی کھپاؤں تو وہ جواب دیتا لیڈی فلورا —— انسان عام طور سے حد سے حد ساٹھ ستر سال دنیا میں زندہ رہتا ہے۔ بعض دفعہ اس سے بھی بہت کم۔ لیکن اس احساس کے باوجود کہ اس کی عمر کی مدت بہت مختصر ہے، وہ زندگی کا آدھا حصّہ حصولِ علم میں صرف کرتا ہے دماغ کھپاتا ہے محنت کرتا ہے۔ اور اپنی ساری تعلیم، علمیت، تجربے خود آگہی کے باوجود —— ایک روز پٹ سے مر جاتا ہے۔ اب چاہے ایک شخص کو دس سال اور جینا ہو یا ایک سال بات تو ایک ہی ہے۔" اللہ فادر بڑا جھکّی تھا ——) بہرحال۔ تو ہم لوگ ہمیشہ سرگوشی میں گفتگو کرتے تھے لیکن اس وقت کلاک پر نظر پڑتے ہی میں گھبرا کر اونچی آواز میں بزبانِ انگریزی بول اٹھی" ہمیں جو وقت

بتایا گیا تھا کیا وہ گرینچ مین ٹائم تھا ـــــ؟ روس کے اور یہاں کے وقت میں تو کم از کم اٹھارہ گھنٹے کا فرق ہوگا ـــــ اور ـــــ اس نے تو پرانے روسی کیلنڈر کے حساب سے ۲۳ر ستمبر کہا تھا ـــــ"

اس پر فادر گریگری بھی ہڑبڑا کر بولا ـــــ "ارے ـــــ اب کیا ہوگا ـــــ؟"

"اب ـــــ یہ ہوگا ـــــ" ایک پولیس افسر نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ہم دونوں دہشت زدہ ہوکر صوفے سے کھڑے ہو گئے۔ ہمارے گرد ناچنے والوں کا مجمع لگ گیا۔ پولیس افسر کے ساتھ دو سپاہی موجود تھے۔ اس نے فادر کو درشت آواز میں مخاطب کیا ـــــ "فلاں ڈپارٹمنٹ اسٹور سے یہ گاؤن جو تمہاری گرل فرینڈ نے پہن رکھا ہے تم چرا کر بھاگے تھے۔ پولیس اس رات سے تمہاری تلاش میں مصروف ہے۔ یہ گاؤن جیکلین اوناسس کی فرمائش پر خاص طور پر تیار کیا گیا تھا۔ مختلف لائبریریوں سے بھی ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ایک شخص راہب کے بھیس میں نادر کتابیں چُراتا پھر رہا ہے۔ لیکن یہ بیش قیمت گاؤن ـــــ تم دونوں کو ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔"

تب فادر گریگری اور بیلیانی نے مجھے دیکھا اور میں نے فادر گریگری اور بیلیانی کو۔ ہم دونوں نے پہلے اپنے دستانے اتارے۔ اپنے پنجے اپنے چہروں کی طرف لے گئے۔ سیاہ چشمے الگ کیے اور اپنے اپنے ماسک اتارے۔

روشنی کی رفتار

ڈاکٹر (مس) پدما میری ابراہام کُرین۔ عمر: ۲۹ سال۔ تعلیم: ایم۔ ایس سی۔ (مدراس) پی ایچ۔ ڈی (کولمبیا)۔ قد: پانچ فٹ ۲ انچ۔ رنگت: گندمی۔ آنکھیں: سیاہ۔ بال: سیاہ۔ شناخت کا نشان: بائیں کنپٹی پر بھورا تل۔ وطن: کوچین (ریاست کیرالا)۔ مادری زبان: ملیالم۔ آبائی مذہب: سیرین چرچ آف مالابار۔ ذاتی عقائد: کچھ نہیں۔ پیشہ: سرکاری ملازمت۔

امریکہ سے لوٹنے کے بعد ڈاکٹر کُرین پچھلے دو سال سے جنوبی ہند کے ایک اسپیس ریسرچ سنٹر (SPACE RESEARCH CENTRE) میں کام کر رہی تھی۔ اسے سرکاری کالونی میں ایک مختصر سا بنگلہ ملا ہوا تھا، جس میں وہ اپنے دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ مقیم تھی۔ دونوں بھائی کالج میں پڑھ رہے تھے۔ والدین (پنشن یافتہ اسکول ٹیچر) کوچین میں رہتے تھے۔ پدما میری ایک خاموش طبع محنتی لڑکی تھی جو بڑی لگن سے اپنے فرائض منصبی انجام دیتی تھی۔

مہینے میں ایک آدھ بار سنیما دیکھ آتی تھی۔ اور اوقات فرصت میں دوستوں کو چینی کھانے پکا کر کھلانا اس کا مرغوب مشغلہ تھا۔ ایک سیکنڈ ہینڈ کار خریدنے کے لئے روپیہ جمع کر رہی تھی اور

سائیکل پر دفتر آتی جاتی تھی۔ ایک بالکل نارمل قسم کی سیدھی سادھی ساؤتھ انڈین لڑکی!

اپریل ۱۹۶۶ء کے ایک خوشگوار دن، لیبوریٹری میں کام کرتے کرتے پدمانے گھڑی پر نظر ڈالی صبح وہ جلدی میں ناشتہ کئے بغیر آگئی تھی۔ اور اب اسے سخت بھوک لگ رہی تھی ایک بجنے والا تھا۔ چند منٹ بعد وہ بیگ اٹھا کر باہر آئی۔ سائیکل پر بیٹھی اور اپنے کالج کی سمت روانہ ہوئی۔

راستے میں ایک جگہ ایک پتلا سا نالہ اور پل پڑتا تھا۔ دوسری طرف سبزہ زار اور گھنا جنگل خاصی سنسان سڑک تھی۔ اس وقت پل پر سے گزرتے وقت اس کی نظر گھاس کے میدان پر پڑی تو اسے بڑا اچنبھا ہوا۔ ایک چھوٹا سا بیضوی روکٹ گھاس پر کھڑا عجیب سی روشنی میں دمک رہا تھا۔ وہ سائیکل سے اتری اور نرسلوں میں سے گزرتی اس کے قریب پہنچی۔ چاروں طرف سے بغور دیکھا ایک دروازہ اندر دو سیٹیں۔ خلاباز غائب۔ دروازے پر جونہی ہاتھ رکھا وہ آپ سے آپ کھل گیا۔ ڈاکٹر کرین خود اسپیس ریسرچ میں مصروف تھی۔ بڑے شوق سے اس نے روکٹ میں قدم رکھا۔ دروازہ فوراً بند ہوگیا کوک پٹ میں بیٹھ کر سب کل پرزے دیکھے بھالے کچھ پلے نہ پڑا۔ متعدد پش بٹن اور سوئچ اور روشن ڈائل جن پر صدیوں کے اعداد تھے سرخ رنگ کی سوئی ۱۹۶۶ء پر ساکت کھڑی تھی۔

اب کیا ہوا کہ ڈاکٹر صاحب باہر نکلنے کے لئے سیٹ پر سے اترنے لگیں۔ ان کی داہنی کہنی ۱۳۱۵ق۔م۔ والے پش بٹن سے ٹکرا گئی۔ سفید روشنی کا ایک کوندہ لپکا —— زوں —— زوں —— پل کی پل میں روکٹ نہ معلوم کہاں سے کہاں —— ڈاکٹر کرین کے ہوش اڑ گئے، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑے، سر گھوم گیا، آنکھیں بند کیں۔ آنکھیں کھولیں چاروں طرف روشن آسمان نیچے نیلا سمندر۔ دریا کا ڈیلٹا۔ دلدل۔ سرکنڈے۔ ریگستان۔ اطمینان کا سانس لیا۔ اجی کہاں کا سائنس فکشن۔ وہی اپنی جانی پہچانی پرانی دھرانی دنیا تھی۔ شکر خدا کا۔ روکٹ زمین پر اتر چکا تھا۔ سرخ سوئی ۱۳۱۵ق۔م پر اٹک گئی۔ دروازہ خود بخود کھلا —— پدما میری

باہر نکلی۔ سامنے جھیل کے کنارے ایک ننھا گڈریا پتھر پر بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔ کھجوروں کے نیچے بکریاں چر رہی تھیں۔ افق پر اہرام ——— گڑ ہیونز ——— یہ تو مصر نکلا ——— گُڈ اولڈ ایجپٹ۔

دو برس قبل نیویارک سے بمبئی جاتے ہوئے وہ مصر سے گذری تھی۔ اہرام کی خوب، تصویریں کھینچیں۔ یہی چرواہے۔ یہی نخلستان، یہی فلاحین۔

یہ ۱۳۱۵ ق م ہے کہاں سے آیا۔ صریحاً ۱۹۶۶ء ہے۔ چلو بھئی۔ نہ ٹائم مشین۔ نہ کچھ۔ تازہ ترین قسم کا روکٹ ہے، جسے کوئی وزِٹنگ امریکن یا روسی سائنسدان ہمارے یہاں لایا ہوگا ———

یہ سوچ کر اسے بڑا اطمینان ہوا۔

اچانک ایک اور پریشانی۔ ممکن ہے یہ جگہ سوئیز کے نزدیک ہو۔ "مشتبہ حالات میں پھرتی" پکڑی گئی تو اور مصیبت۔ ہندوستان مصر کا لاکھ دوست سہی مگر نہ پاسپورٹ، نہ ویزا۔ اب فوراً پہنچنا چاہیئے انڈین ایمبیسی کائیرو!۔

اہرام کے آس پاس کے فلاحین اور چرواہے مغربی سیاحوں کی مسلسل آمد و رفت کی وجہ سے تھوڑی بہت انگریزی سمجھ لیتے ہیں۔ لہذا پدماسیری نے اس گڈریے سے کہا۔

"کائیرو ——— بس ——— ٹیکسی ——— او ٹوموبیل ———"

لڑکے نے سر ہلایا۔ دور ایک کسان گدھے پر سوار بگٹٹ چلا جا رہا تھا۔ لڑکے نے اسے آواز دی۔ وہ دھول اڑاتا قریب آیا۔ گڈریے نے اس سے کچھ کہا۔

تب دفعتاً پدماسیری پر ایک خوفناک انکشاف ہوا۔ گڈریا اور کسان جو زبان بول رہے تھے، وہ عربی نہیں تھی (کولمبیا یونی ورسٹی کے لبنانی طلباء سے کافی عربی سنی تھی) اور یہ اجنبی بھاشا نہ صرف اس کی سمجھ میں آ رہی تھی بلکہ اس نے خود کو اس ادق افریقی زبان میں فر فر باتیں کرتے پایا۔ "قاہرہ" اس نے دریافت کیا "یہاں سے کتنی دور ہے"؟

دونوں مصریوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

معاً اس نے کہا۔"ممفس"۔

کسان نے ایک سمت کو اشارہ کیا۔ وہ اچک کر گدھے پر سوار ہوگئی۔ بھوک کے مارے برا حال تھا۔ شہر پہنچ کر سب سے پہلے کچھ کھاؤں ـــــ مگر فارن ایکس چینج کا کیا ہوگا۔ اور یہ قدیم جاہل جپٹ لوگ کہیں میرا روکٹ توڑ پھوڑ کر برابر نہ کردیں۔ پلٹ کر دیکھا۔ اس اثنا میں چار پانچ گڈریے روکٹ کے گرد جمع ہو چکے تھے اور سجدے میں پڑے تھے۔ اسے دیکھ کر باقی بھی غڑاپ سے سربسجود ہو گئے۔

ان میں سے ایک نے زمین پر پڑے پڑے نعرہ لگایا۔"مرحبا۔ دیبی حاتھور!"

باقیوں نے کورس میں کہا۔"آسمانی رتھ پر آنے والی مادرِ ہورس ہم پہ کرم کر ـــــ"

پدما میری چند لمحے خاموش رہی۔ پھر وقار سے بولی۔"میرے بچو ـــــ! میں دیبی حاتھور کی داسی ہوں ایک خفیہ کام سے دیبی نے مجھے زمین پر بھیجا ہے ـــــ کسی کو میرے متعلق ہرگز نہ بتانا۔ ورنہ دیبی کا ایسا قہر نازل ہوگا یاد کروگے اور میرے آسمانی رتھ کی نگرانی کرتے رہو۔ خبردار جو اسے ہاتھ بھی لگایا ـــــ"

ممفس بڑا بارونق شاندار شہر تھا۔ جیسا کہ ممفس کو ہونا چاہئے تھا۔ گدھے والا کینز حاتھور کی دہشت میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اسے ایک چوک میں اتار کر بھیڑ میں غائب ہوگیا۔ پدما نے چاروں طرف دیکھا۔ یہاں ریستوران نہیں ہوتے ہوں گے؟ اس نے سوچا۔ وہ ایک بڑی دوکان کے سامنے کھڑی تھی۔ اندر الماریوں میں پیپائرس کے گٹھر رکھے تھے ایک جوان خوش شکل، سروقامت ـــــ سنہری لنگی جس پر سیاہ دھاریاں پڑی تھیں، چُنی ہوئی ململ کی قبا گلے میں چوڑا طلائی کنٹھا، زلفوں کے چوکور پٹے، پیشانی پر بالوں کی جھالر۔ دوکاندار سے باتیں کررہا تھا۔ دو حبشی غلام اس کے پیچھے پیپائرس کے بنڈل اٹھائے کھڑے تھے۔

اب یہاں سے سائنس فکشن میں رومانس شروع ہوجانا چاہئے۔ مگر نہیں ہوگا۔ پدما

بھوک سے بے حال تھی۔ ریستوران کی تلاش میں ذرا آگے بڑھی تو ایک بند دوکان (جس پر لکھا تھا کرائے کے لئے خالی ہے) کے تھڑے پر ایک باریش بزرگ اکڑوں بیٹھے تسبیح پھیرتے نظر آئے۔ سر پر گول ٹوپی لمبا چغہ۔ کوچین کے یہودیوں یا سیرین چرچ کے پادریوں یا موپلا مولویوں کی سی وضع قطع۔ ہالی ووڈ کے فلموں والی "پیریڈ کوسٹیوم" پہنے قدیم مصریوں کے اس انبوہ کثیر میں یک لخت ایک مانوس سی شخصیت۔ اسی وقت ایک لمبا تڑنگا خشمناک مصری چابک اور ایک طویل کاغذ لہراتا بازار کی بھیڑ میں سے نمودار ہوا۔ کاغذ پیر مرد کو تھمایا اور اکڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بزرگ نے نوشتے پر نظر دوڑائی اور دلدوز آواز میں پکارے۔

"میخائیل بن حنان ——"

لمبی پتلی ناک، سیاہ حساس آنکھوں، حساس چہرے والا ایک عبا پوش نوجوان برابر کی گلی سے برآمد ہوا۔ "خدائے واحد کی لعنت ہو اس بدبخت زمانے پر"

"اے عزیز! گریہ کر۔ اور سر پر خاک ڈال کہ ترا نام بھی فہرست میں آگیا" ——

میخائیل کا رنگ زرد پڑا۔ اور اس نے آہستہ سے کہا "رب ذوالجلال شاید توت کے دل میں نیکی ڈال دیوے۔ وہ رب ذوالجلال میری روشنی اور میری نجات ہے، جس نے اسرافیل شاہ شنعار اور آریوخ شاہ ایلازار کے عہد میں اہل ایمان کی حفاظت کی ——"

"امیرزادہ توت ——"؟ بزرگ نے سرگوشی میں پوچھا۔

"یا ربیّ! میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ کاغذ خریدنے آیا ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں —— وہ میرا کلاس فیلو رہ چکا ہے۔ وہ میری مدد کرے گا۔"

میخائیل جو عہد نامہ قدیم کے اولین صحایف سے بھی پہلے کی عبرانی میں بات کر رہا تھا۔ اس نے یہ لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ لیکن میں قدیم ترین قبطی اور عبرانی دونوں سے ناواقف ہوں۔ (واضح ہو کہ ڈاکٹر کرین اس وقت عبرانی بھی بخوبی سمجھ رہی تھی) میخائیل لپک کر اسٹیشنری مارٹ میں گیا۔ پدماسٹرک کے کنارے کھڑی یہ سارا ماجرا دیکھتی تھی۔ خوبرو

سنہرے نوجوان نے زرد رو عبرانی سے پوچھا ـــــ

"کہو میخائیل آج کل کہاں رہتے ہو"۔

"دریائی چنگی پر کام کرتا ہوں"۔

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ کبھی کبھی ملتے رہو"۔ سنہرے نوجوان نے سرپرستانہ انداز میں اس کا کندھا تھپکایا۔

"ٹوٹش مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے"۔ عبرانی لڑکے نے جھجک کر کہا اور سرگوشی میں کچھ بتایا۔ امیرزادہ ٹوٹش باوقار انداز میں ایک ابرو اٹھا کر بہ غور سنتا رہا پھر بولا۔

"فکر نہ کرو۔ میں آنریبل منسٹر سے بات کروں گا"۔

دفعتاً ان دونوں نوجوانوں کی نظریں اس اجنبی لڑکی پر پڑیں۔ دونوں ایک ساتھ سیڑھیاں اترے۔ امیرزادہ ٹوٹش نے اپنی کہنی کی جنبش سے میخائیل کو پیچھے ہٹایا۔ ظاہر تھا کہ ٹوٹش اور میخائیل میں آقا و محکوم کا رشتہ ہے۔ اب امیرزادہ ٹوٹش ڈاکٹر گرین کی طرف آرہا تھا۔

پدما نے جلدی جلدی سوچا ان لوگوں سے اگر کہوں کہ انڈین ڈانسر ہوں، فارن ٹور پر نکلی ہوں۔ کیا پتہ لے جاکر بازار میں بیچ ڈالیں۔ "وہ دیو جانور کی داسی" والی بات بہتر ہے۔ مگر کسی مندر میں پہنچا کر ناک میں اتنی دھونی دیں گے کہ پانچ دس منٹ میں دم نکل جائے گا۔ اصل واقعہ بتاؤں تو ان کی سمجھ میں نہ آئے گا۔ ان کی کیا خود میری سمجھ میں نہیں آرہا۔

امیرزادہ ٹوٹش اس کے سامنے کھڑا تھا۔ "لڑکی تم کون ہو؟" اس نے ذرا ڈپٹ کر پوچھا۔ "اور ہماری باتیں اتنے غور سے کیوں سن رہی ہو۔ ؟ کس ملک کی جاسوس ہو؟ ایلام ـــــ اسوریہ ـــــ ؟ ارارتو ـــــ ؟"

پدما نے ہونقوں کی طرح زور زور سے سر ہلایا اور خوف سے لرز گئی۔ ٹوٹش اس کی نائیلون ساڑی اور امریکن بیگ کو دھیان سے دیکھ رہا تھا۔ پدما نے عجز سے کہا۔ "حضور! شہزادہ

سلامت! کنیز بھوک سے بے دم ہے۔ پہلے کچھ کھلا دیجیے۔ بندی سب کچھ سچ سچ عرض کر دے گی"۔

"میرے ساتھ چلو ـــــــ" امیر زادے نے حکم دیا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے ہو لی۔ نکڑ پر رتھ اسٹینڈ تھا۔ یار تھ پارک کہہ لیجیے۔ امیر زادے نے پدما کو اپنی برابر بٹھا کر اسپ کو چابک لگایا۔

وہ بازار سے نکلے اور ہیلیو پولس کے فیشن ایبل محلے میں پہنچے۔ کشادہ سڑک کے دونوں جانب شاندار مکان استادہ تھے۔ کوڑا کرکٹ پڑا تھا۔ بچے کھیل رہے تھے۔ ایک سہ منزلہ حویلی کے سامنے پہنچ کر رتھ رکا۔ وہ اتر کر برآمدے میں گئے۔ جس کے قرمزی پیل پایوں کے سرے کنول کی وضع سے تراشے گئے تھے۔ ایک سیاہ فام بھینگے غلام نے سرخ رنگ کا صدر دروازہ کھولا۔ وہ ہال میں داخل ہوئے۔ اس کے جھلملاتے سرمئی فرش کے وسط میں سنگ سیاہ کا حوض تھا۔ سنہرے فیتوں میں لپٹے پیپائرس کے رول الماریوں میں رکھے تھے۔ دیواروں پر رنگین فریسکو۔ یک رخی شکلوں کی قطاریں سنہرے کاؤچ اور کرسیاں! لگتا تھا یہ سارا فرنیچر برٹش میوزیم کے "ایجپشین رومز" سے واپس لا کر یہاں سجا دیا گیا ہے۔

ثوث نے کھانا لانے کا حکم دیا اور حوض کے کنارے بچھی چرمی گدوں والی ایک کرسی پر بیٹھ گیا سینڈل اتارے اور سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر میری کرسین کو دیکھنے لگا۔

پدما میری نے مقابل کی کرسی پر ٹک کر گلا صاف کیا۔ "حضور ـــــ میں ـــــ میں انڈیا سے آ رہی ہوں ـــــ"

"ـــــ؟"

"رقص کرتی ہوں ـــــ" اس نے کھڑے ہو کر موہنی آٹم کے چند مدرا دکھائے۔ ثوث قطعی متاثر نہ ہوا۔ وہ پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔ "جس بادبانی جہاز پر ـــــ" اس نے بہت سوچ بچار کر کہنا شروع کیا ـــــ "بادبانی جہاز پر آ رہی تھی وہ سوئز کنال میں تباہ ہو گیا۔ میں ایک

تختے پر ____"

"سوئیز کنال ____" ثوث نے بہ دقت یہ نام دہرایا اور مزید تشریح کا متوقع رہا۔ اب وہ بالکل ہڑبڑا گئی۔ ثوث نے جھنجلا کر پوچھا "اس عبرانی چھوکرے کو جانتی ہو؟"

"عالی جاہ! ربّہ جانور اور اس کے بیٹے کی قسم ____ میں یہاں کسی کو نہیں جانتی حضور!" لگتا تھا مقدس ماں اور بیٹے کی قسم پر اسے دفعتاً اعتبار آ گیا۔ "اچھا مجھے حضور، حضور مت کہو اور چلو کھانا کھاؤ۔" اس نے کہا اور پدما کو ایوانِ طعام میں لے گیا ____ کنیزوں نے نقرئی قابیں لا لا کر میز پر چننا شروع کیں۔ پدما نے صبح دس بجے بنگلور میں لیبورٹری کی کنٹین میں ڈاکٹر رام ناتھن اور ڈاکٹر رفیق فتح علی کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے فقط ایک پیالی کافی کی پی تھی۔ اس وقت شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ اس نے ثوث کی نظر بچا کر رسٹ واچ اتاری اور بیگ میں رکھ دی اور کھانے کی طرف متوجہ ہوئی جو خاصا بد ذائقہ تھا۔

○

سورج دریائے نیل میں ڈوبنے والا تھا اور صحرائی ہوا میں فرحت بخش خنکی آ چلی تھی۔ وہ اپنی خلیق میزبان کے ساتھ محل کے طویل دالان میں ٹہل رہی تھی۔ اب تک اسے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہو چکی تھیں: ثوث کا اصل نام اسطالیس تھا۔ ثوث اس کا سرکاری لقب تھا۔ یہی لقب اس کے باپ کا بھی تھا اور ربِّ ایوانِ کتب ثوتؔ ہرمیز کے نام پر رکھا گیا تھا (اس دیوتا کا ہیبت ناک بت اندر ہال میں ایک مقدّس بلی کی ممی کے نزدیک استادہ تھا)

مسٹر ثوث سینئر فرعون کے چیف اسکرائب اور خاندانی رئیس تھے۔ ثوث جونیئر بھی لکھتا لکھاتا رہتا تھا۔ رسمُ الخط چونکہ تصویری تھا لامحالہ مصوّری بھی آتی تھی۔ درباری سازشوں سے الگ رہتا تھا اور شہر کے ادیبوں اور مصوّروں کے حلقے میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ اپنے ملک کے بہت سے دقیانوسی عقائد اور رسوم سے نالاں تھا ____ لیکن یہ بڑھے نئی نسل والوں

کی کچھ چلنے نہ دیتے تھے۔ چنانچہ یہ ہے "مصر قدیم کے اسرار اور رومان" کی اصلیت۔ پدما نے مایوسی سے سوچا۔ لائبریری میں جو کاتب بیٹھے صحیفہ متوفین کی نقلیں کرنے میں مصروف تھے، ان میں سے ایک کو زکام ہو رہا تھا۔ دوسرا مسلسل اپنا سر کھجاتا تھا۔ دو نوجوان کاتب برابر ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ انوتی نامی کنیز نہ حسین تھی نہ مہ جبیں۔ چیچک رو اور بھدی سل۔ خود ثوث بالکل نارمل سا لڑکا تھا۔ سوائے اس کے کہ کورٹ پتلون کے بجائے ہالی وڈ والی پیریڈ کوسٹیوم پہن رکھی تھی۔

فرعون اپنی افواج کے معائنے کے لیے اشوریہ کی سرحد پر گیا ہوا تھا۔ اشوریہ سے کئی سال سے لڑائی جاری تھی۔

"ہم دنیا کی قدیم ترین تہذیب ہیں"۔ ثوث نے ٹہلتے ٹہلتے بڑے جوش سے کہنا شروع کیا۔ "یہ کلدانیہ اور اشوریہ والے بھی اپنے متعلق یہی دعویٰ کرتے ہیں اور ہم سے لڑنے آتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ ہمارا ان کا کیا مقابلہ۔ ہم ان سے ہر لحاظ سے برتر ہیں"۔

پدما زیر لب مسکرائی۔ "مگر ایک بات ضرور ہے"۔ ثوث نے دالان کے کتب خانہ میں واپس آتے ہوئے کہا۔ "کلدانی اور اشوری بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ یہ الواح دیکھو، اور ساتھ ہی اس قدر سفاک"۔ اس نے سفالی الواح کے انبار کی طرف اشارہ کیا۔ "جنگ سے پہلے ان کی یہ کتابیں سیکڑوں اونٹوں پر لاد کر ہمارے یہاں لائی جاتی تھیں"۔ اس نے جھک کر باریک خط میخی میں کندہ ایک لوح اٹھائی۔

"یہ تو میں برٹش میوزیم"۔ پدما نے فوراً زبان دانتوں تلے دبائی۔ پھر جلدی سے پوچھا۔ "تم یہاں تنہا رہتے ہو ثوث ______؟"

"والد بادشاہ سلامت کے ہمراہ محاذ کے معائنے کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ اماں اور بہنیں ملکۂ عالم کے ساتھ موسم گرما کے لئے تھیبز جا چکی ہیں۔ جانا تو مجھے بھی ہے۔ ملکہ عالم نے وہاں جل محل کی دیواریں مصور کرنے کا حکم دے رکھا ہے۔ لیکن میں جب تک صحیفہ

متوفین[1] کا نیا اڈیشن پورا نہیں کر دالیتا کہیں نہیں جا سکتا۔"

"ایک بات بتاؤ ثوث۔ تم لوگ موت سے اس قدر مسحور کیوں ہو ـــــ؟" پدما نے دریافت کیا۔

"اور کاہے سے مسحور ہوں؟ فانی زندگی سے؟" ثوث نے سوال کیا۔ وہ اس کے ساتھ الماریوں کے آگے سے گزر رہی تھی (اب وہ تصویری رسم الخط بھی پڑھ سکتی تھی) اس نے مختلف عنوانات پر نظر ڈالی ـــــ مذہب، اخلاقیات، قانون، طب، علم نجوم، خطابت، ریاضی اقلیدس، سفرنامے ناول، اینطیف[2] کا لکھا ہوا رومان

"موت کے علاوہ اور دلچسپیاں بھی ہیں"۔ ثوث نے مسکرا کر کہا۔ "یہ سب کتابیں یہاں سے نقل کروا کے تھیبز کے کالج اور لائبریری میں بھیج دی جاتی ہیں"۔

"مجھے نہیں معلوم تھا، تم لوگ اتنے پڑھے لکھے تھے ـــــ میرا مطلب ہے ـــــ ہو ـــــ اقوال تاہ ہوتیپ[3] ـــــ کیا فرماتا ہے تمہارا تاہ ہوتیپ"۔

"وہ فرماتا ہے"۔ ثوث نے ایک ریشمی پارچے کا ٹکڑا الماری میں سے کھینچا اور پڑھنا شروع کیا ـــــ

"انسانوں میں خوف و دہشت نہ پھیلاؤ خدا اس کی سزا دے گا۔ جو شخص کہتا ہے ساری طاقت اور سارا اقتدار میرا ہے اکثر وہی ٹھوکر کھا کر گر بھی پڑتا ہے۔ ہمیشہ بیت ترحم میں سکونت رکھو۔ دینے والا خدا ہے۔ بندہ یہ نہ سمجھے کہ وہ خود کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اور خبردار ـــــ الفاظ کے ذریعہ کبھی فساد نہ پھیلانا ـــــ"

وہ پھر ٹہلتی ہوئی صحیفہ متوفین کے کاتبوں کی طرف آئی اور دو زانو بیٹھ کر دیکھنے لگی۔ ایک

---

[1] BOOK OF THE DEAD دنیا کی قدیم ترین کتاب ہے جو آج سے تقریباً چھ ہزار سال قبل مصر میں لکھی گئی۔ اس کا ایک ایک نسخہ حنوط شدہ لاشوں کے ساتھ دفن کیا جاتا تھا۔

[2] اینطیف ۲۶۰۰ ق۔م۔ ، [3] تاہ ہوتیپ ۳۵۵۰ ق۔م۔ میں ممفس میں پیدا ہوا۔

موٹے کاتب نے ناک سنکتے ہوئے ایک تصویری نقطے کے گرد قرمزی موقلم سے بیضوی حلقہ کھینچا۔
"یہ ایک بادشاہ کا نام ہے"۔ اس نے چھتری کی تصویر بنائی۔ "شمالی مصر کا تاج سرخ۔ جنوبی کا سفید۔ اور فرعون سورج دیوتا رع کا بیٹا ہے" کاتب نے اسے بتایا۔ سورج کے لئے بطخ کی شکل بنا کر اس کے بیچ میں نقطہ لگا دیا اور پانی پینے کے لئے اٹھا۔
"صحیفہ متوفین میں بیالیس اخلاقی احکام درج ہیں"۔ توث نے کہا۔ (موسیٰ نے تو یہاں سے جا کر صرف دس احکام ہی دیے۔ شکر ہے۔ پدما نے سوچا)
"اور ہمارے بیس شاہی خاندانوں کے حالات درج ہیں جو پچھلے تین ہزار سال تک مصر میں حکمراں رہے"۔
"صاحب" ایک بڑا کاتب بولا۔ "اب چھٹی کریے۔ مجھے بہت دور جانا ہے۔ بیوی بیمار ہے۔ کل کے پیسے ملیں گے ــــــ"؟
"کتنی بار لوگے۔ پیشگی بھی لے چکے ہو" ــــــ توث نے بگڑ کر کہا۔
"صاحب مجھے بھی کچھ رقم ادھار دے دیجئے۔ میرا لڑکا ــــــ" دوسرا ملتجی ہوا۔
آہ مصر قدیم کا رومان ــــــ پدما وہاں سے اٹھ کر دالان میں آ گئی۔ توث کاتبوں سے نپٹ کر باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پارچہ تھا۔ "تمہاری دلچسپی کے لئے صحیفۂ متوفین کی ایک حمد نکال کر لایا ہوں"۔ اس نے پدما کو چڑانے کے لئے تبسم کے ساتھ کہا۔ "اس کا عنوان ہے "ایک مردہ زندہ ہو کر رع کی مناجات کرتا ہے، سنو"۔
اس نے برآمدے کے جنگلے پر ٹک کر پڑھنا شروع کیا۔ "تیرے پُرجلال طلوع پر تیرے کاہن ہنستے ہوئے باہر نکلے۔ تری کشتی سحر سفینۂ شب سے آملی اور اتو کے ایوان آوازوں سے گونج اٹھے۔ زمانے گذر جائیں گے۔ وقت تیرے نیچے اپنی خاک اڑاتا رہے گا۔ تو کہ درخشں دام وزرد فرد ہے۔ اے رع! ۔ لاکھوں برس گزر گئے۔ لاکھوں گزر جائیں گے۔ الونی کھانا لگاؤ"۔
"تم کھانا بہت جلد کھا لیتے ہو ــــــ"؟ پدما نے کہا۔

"ہاں ورنہ پھر مچھر اور پتنگے بہت ستاتے ہیں۔"

"تم آج شام کو کیا کر رہے ہو؟"

"انوتی ــــــ" ثوث نے دوبارہ پکارا "معلوم کر کے آؤ چشم ہورس کے بجے شروع ہوگا؟"

"شروع ہو چکا۔" انوتی نے جو کافی منہ چڑھی تھی اندر سے جواب دیا۔

"اچھا! ابھی کھانا رہنے دو۔ چلو" اس نے بیدلی سے پدما کو مخاطب کیا۔ "تمھیں باہر گھما لاؤں۔ میں نے یہ تماشا اتنی بار دیکھا ہے کہ عاجز آچکا ہوں۔ چلو ــــــ"

وہ دالان سے اتر کر نیم تاریک سڑک پر آئے۔ کچھ لوگ تھیٹر ہال کی سمت جا رہے تھے۔ ہیلیوپولس بہت وسیع علاقہ تھا۔ آدھ میل چلنے کے بعد راستے میں ایک مقبرہ پڑا اس سے ملحق معبد میں بڑی خلقت جمع تھی۔ عود و لوبان کے مرغولے باہر نکل رہے تھے۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" پدما نے پوچھا۔

"کسی آنجہانی فرعون کی روح کو نذرانہ چڑھایا جا رہا ہوگا۔ دیکھو گی؟" وہ پدما کا ہاتھ پکڑ کر معبد کے تنگ صحن میں لے گیا۔ "آج کس کی رات ہے؟" اس نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"فرعون نفر کارع" اس شخص نے جواب دیا۔ اور زیر لب منتر دہرانے میں مصروف ہو گیا۔ ثوث اور پدما دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ اندر مقبرے کے سنگلاخ تہ خانے میں نفر کارع کا کھلا تابوت دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔ ململ کی پٹیوں میں ملفوف ممّی بالکل جیتی جاگتی معلوم ہوتی تھی۔

"موصوف کو مرے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ یہی کوئی ایک ہزار سال ہوئے ہوں گے۔" ثوث نے سرگوشی میں پدما کو بتایا۔ کاہن کی لرزہ خیز آواز گونجی ــــــ "او بادشاہ نفر کارع! چشم ہورس قبول کر اور اسے اپنے چہرے تک لے جا۔" پھر اس نے روٹی اور جو کی شراب کا پیالہ سونے کی تھالی میں رکھ کر ممی کے سامنے پیش کیا۔ "او نفر کارع جس کا جاہ و جلال ختم ہو چکا۔ جو کچھ تیری

طرف سے آیا ہے اس پر نظر کر اور غسل کر۔ چشم ہورس کے وسیلے سے اپنا منہ کھول۔ او بادشاہ نفر کارع ــــــ"

پجاریوں کے اژدہام کی وجہ سے دم گھٹا جا رہا تھا توث پدما کو باہر نکال لایا۔ "اب ناٹک بھی دیکھو گی ــــــ"؟

"اس میں بھی یہی چشم ہورس کا وظیفہ ہوگا ــــــ"؟ پدما نے گھبرا کر پوچھا "اتنی دور چل کر آئے ہیں تو دیکھ ہی لیں"۔

توث چپ چاپ پھر اس کے ساتھ سڑک پر آ گیا۔ بے چارہ مجھے انٹرٹین کرنے کی خاطر کتنا بور ہو رہا ہے۔ مگر اتنی ڈپریسنگ اندھیری شام کس طرح گزاری جائے۔ تھیٹر ہال وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ پلے[1] شروع ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔

اسٹیج پر ہورس، توث، سیت اور سائرس دیوتا لوگ اور چند گوالین قصائی اور بچّے موجود تھے۔ ہورس نے بچّوں سے کہا "میری دنیا کو میری آنکھ سے معمور کر دو ــــــ"

اسی وقت پردہ گر گیا۔ دوسرا سین شروع ہوا۔ عقیق کی مالا اسٹیج پر لائی گئی۔ ہورس نے سیت سے کہا۔ "میں نے اپنی آنکھ اٹھا لی جو تیرے لئے مثل عقیق ہے۔ میری آنکھ لاؤ جو تیرے لئے عقیق کی طرح سرخ ہو گئی تھی۔ جو تیرے منہ میں جا کر سرخ خون کی طرح سرخ ہو گئی"۔

پدما نے توث سے سرگوشی میں پوچھا۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

"چمکیلے آسمان کے دیوتا ہورس کو ربِّ طوفان سیت نے اندھا کر دیا تھا۔ رب طوفان وہ آنکھ ہورس کو واپس کر دیتا ہے۔ یعنی طوفان کے بعد پھر خوشگوار موسم ــــــ"

پدما نے سوچا ــــــ مصر میں ریتیلے طوفانوں سے اندھے ہونے کی بیماری اتنی قدیم ہے اور اس کی کیسی اساطیر تیار ہوئیں۔

---

[1] یہ ڈرامہ فرعون سیسوترس اوّل کے جشن تاج گزاری کے موقعہ پر پہلی بار اسٹیج کیا گیا تھا۔ فرانسیسی باستان شناسوں کو اس کا مسودہ راس شمرہ کی کھدائی میں ملا۔

"یہ تماشا تو ابھی بہت دیر تک جاری رہے گا ــــ چاند نکل آیا ہے۔ دریا پر چلتی ہو ــــ؟" ٹوٹ نے دریافت کیا۔

"اگر تم برا نہ مانو ٹوٹ! تو میں اب گھر جا کر سوؤں گی ــــ صبح آٹھ بجے دفتر ــــ" اس نے پھر اپنے آپ کو چیک کیا۔

"بہت خوب"۔ ٹوٹ نے کہا۔ وہ گھر واپس پہنچے۔ غلام کھانے کی میز پر ان کے منتظر تھے ــــ ڈنر کے دوران میں پدما نے اپنے میزبان سے پوچھا "ٹوٹ ــــ تم نے مجھے عبرانیوں کی جاسوس کیوں سمجھا تھا؟ کیا یہ لوگ تمہارے لئے ایک مسئلہ ہیں"؟

"ہاں" ٹوٹ نے مچھلی سے کانٹا نکالتے ہوئے جواب دیا۔ مشعلوں کی روشنی اس کے شکیل چہرے پر جھلملا رہی تھی "مگر ہمارے فرمانرداؤں نے اس مسئلے کا بڑا انسانیت کش حل تلاش کیا ہے۔ سارے عبرانی مردوں سے جان لیوا بیگار لی جاتی ہے۔

"یہ اہرام جو تم دیکھتی ہو ان میں سے کئی انھوں نے بنائے ہیں۔ بے چارے لاکھوں من پتھر میلوں دور سے ڈھو کر لاتے ہیں اور خون تھوک کر مر جاتے ہیں ــــ بے چارہ میخائیل ــــ اسے دریائی چنگی پر منشی گیری مل گئی تھی اس کا خیال تھا بچ نکلے گا مگر اس کا نام بھی فہرست میں آگیا ہے ــــ"

"تم کچھ نہیں کر سکتے؟"

"اکیلا میں ــــ ایک پورے نظام کے خلاف کیا کر سکتا ہوں ــــ؟" اس نے افسردگی سے پوچھا۔

کھانے کے بعد ٹوٹ اسے بالائی منزل پر ایک بڑے کمرے میں لے گیا جس کا فرش زرد سوڈانی پتھر کا تھا۔ دریچے کے نزدیک منقش پایوں والی مسہری بچھی تھی۔ وسط میں آبنوس کی گول میز۔ ایک طرف چند منقش چوبی صندوق۔ سنگھار میز کے فولادی آئینے کے سامنے ہاتھی دانت کی مرصع کنگھی ماہی نما نقرئی سرمہ دانی، سرخی وغازے کی جڑاؤ شیشیاں، اور اسی طرح

کا دوسرا نسوانی آلمِ غلم۔

"یہ میری چھوٹی بہن کا کمرہ ہے"۔ ثوث نے کہا۔ "تم یہاں آرام سے سوجاؤ۔ صبح جس وقت چاہو اٹھنا۔ اِنوتی کو آواز دے لینا وہ غلام گردش میں سوئے گی۔ شب بخیر"۔

"شب بخیر ثوث ——"

وہ سر جھکائے شہ نشین میں سے گزرتا زینے کی طرف چلا گیا۔

پلنگ پر لیٹ کر وہ بہت دیر تک باہر دیکھتی رہی۔ کھڑکی کے عین نیچے سنگ سرخ کا وسیع تالاب تھا۔ جس میں کنول کھلے تھے —— دور صحرا پہ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے ایک جھپکی لی تھی کہ مچھروں کی بھنبھناہٹ نے چونکا دیا۔ یہ بڑا مچھر اس کی ناک پر بیٹھا تھا۔ وہ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھی اور پھر دریچے کے باہر جھانکنے لگی۔ تھوڑی دیر میں بانسری کے سُر خاموش فضا میں بلند ہوئے۔ اس نے نیچے جھک کر دیکھا وہ ثوث تھا جو تالاب کی سیڑھیوں پر چاند کے رخ بیٹھا بانسری بجاتا تھا۔

کہیں یہ بےچارہ عشق میں تو مبتلا نہیں ہو گیا۔ یقیناً ہو گیا۔ آدھی رات کو بیٹھے بیوقوفوں کی طرح بانسری بجا رہے ہیں۔ اب بھاگو یہاں سے صبح منہ اندھیرے۔

ہیلیوپولس سے شہر پناہ تک کا راستہ یاد ہے وہاں سے خرمے کے جھنڈ تک پہنچنے میں آدھ گھنٹہ لگے گا۔ روکٹ میں سات بجے تک گھر۔ یہ حساب لگا کر وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ کچھ دیر ثوث کی بانسری سنا کی۔ پھر اسے گہری نیند آ گئی۔

ایک گمبھیر آواز نے اسے صبح پانچ بجے ہی جگا دیا۔ اس نے تکیئے سے سر اٹھا کر باہر جھانکا۔ تالاب کے کنارے ایک بہت لمبا قوی ہیکل معمر آدمی جو حلیئے سے ثوث کا خاندانی کاہن معلوم ہوتا تھا۔ ایک کنول نما ستون پر کھڑا بازو ہلا ہلا کر پانچ سُروں میں رع کی حمد خوانی کر رہا تھا۔

مرحبا آتون —— مرحبا —— خرپر ——

لبیک چشمِ ہورس ——

اتوم —— ربّ الشمس —— خالقِ اکبر تاہ —— سارے جانداروں کے دلوں میں موجود تاہ —— جو سوچتا ہے سو ہوتا ہے اپنے کلمے[1] سے اس نے کائنات تخلیق کی —— تاہ تانین —— بجرے پر سوار خپری —— اتوم —— خالق جن و بشر۔ ان داتا —— جس نے اقوام عالم کی تفریق ان کی رنگت سے کی۔ جس کی محبت میں نیل رواں —— رحیم وکریم، خدائے واحد ——

دریا کی مچھلی اور آسمان کے پرندے کو زندہ رکھنے والے ——

کیڑوں اور بھنگوں کے پالن ہار ——

آموں —— آتون ہیراختے۔

میرے اوپر جگمگاتا تارہ ——

تیرے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں۔

رع کی روشنی افق پر پھیلنے لگی، توث کا پروہت لمبے لمبے ڈگ بھرتا مندر کی سمت چلا گیا۔ جس کی پرشکوہ عمارت فجر کے دھندلکے میں دور سے نظر آرہی تھی۔ پدما نے تکئے کے نیچے سے بیگ نکالا۔ کل سے اس نے چائے کافی کچھ نہ پی تھی اور سر میں درد ہو رہا تھا۔ صبح کو یہ لوگ جانے بریک۔ فاسٹ کیا کرتے ہوں گے۔ تعجب کی بات ہے۔ چائے کی دریافت سے پہلے لوگ کس طرح زندہ رہتے تھے۔ اب یہی دیکھ لو توث کس مزے سے جی رہا ہے۔ چائے کافی سگریٹ، سنیما، ٹیلی ویژن، ٹیلیفون، ہوائی جہاز، کمپیوٹر، ایڈورٹائزنگ، پبلک ریلیشنز، جرنلزم بے چارہ کچھ بھی نہیں جانتا —— پیچ —— اس نے پھر نیچے جھانکا —— میاں توث تالاب میں غوطہ لگا رہے تھے اور نیلگوں پانی کا عکس محل کی زمردیں دیواروں پر جل پریوں کے مانند رقصاں تھا۔

---

[1] شروع میں کلمہ تھا اور کلمہ خدا کے ساتھ تھا اور کلمہ خدا تھا۔ یوحنا کی انجیل کا ابتدائی جملہ ہے۔ عہد نامہ جدید بھی قرون اولیٰ میں لکھا گیا ہے۔ تاہ کی یہ حمد ۲۳۰۰ ق۔ م کی تصنیف ہے۔

پیرتے، پیرتے نورش نے سر اٹھا کر اوپر جھروکے پر نظر ڈالی اور مسکرایا۔ پھر سیڑھیوں پر جا کر ایک سرخ کنول توڑنے میں مصروف ہو گیا۔

بھاگو ـــــ بھاگو ـــــ سرپٹ ـــــ پدما ہڑبڑا کر اٹھی۔ چپل پہنے، خواب گاہ کا دروازہ کھولا اور باہر نکلی۔ حویلی ابھی خاموش پڑی تھی۔ سارے لونڈی غلام برآمدوں میں فرش پر لمبی تانے سو رہے تھے۔ وہ دبے پاؤں زینہ اتر کر صحن میں آئی۔ مقدس بیل آئی پیز کے مہیب بت کے نیچے سے گزرتی پکی سڑک پر پہنچی۔ اور بھاگنا شروع کیا۔ مکانوں کے دروازے ابھی بند تھے۔ اکا دکا کنجڑا یا ماہی فروش بہنگیاں اور ٹوکریاں اٹھائے کہرے میں سے گزرتا نظر آجاتا تھا۔ ہانپتے کانپتے اس نے در شہر پناہ پر پہنچ کر ہی دم لیا۔ مگر پھاٹک مقفل پڑا تھا۔ چند پہریدار اوپر فصیل پر ٹہل رہے تھے۔ چار پانچ سنتری پھاٹک کے سامنے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک للکارا ـــــ "اوچھوکری! کدھر منہ اٹھائے چلی جاتی ہے ـــــ"

"دریا پر ـــــ" اس نے ہکلا کر جواب دیا ـــــ "مچھلی پکڑنے ـــــ"

"مچھلی کی بچی ـــــ آج جہاں پناہ واپس آرہے ہیں۔ ان کے آنے سے پہلے پھاٹک نہیں کھلے گا ـــــ"

"کس وقت آئیں گے؟"

"کیا معلوم کس وقت آئیں گے۔ تو پوچھنے والی کون ـــــ؟"

وہ نڈھال ہو کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ کافی کی طلب میں درد سر بڑھتا جا رہا تھا۔ رتھ میں، آ رہا ہوگا، مجوں کی چال۔ کمبخت فرعون کا بچہ۔ خدا اسے غارت کرے۔ نہ جانے کب تک پہنچے گا۔ اور اب تک اس حرافہ انوتی نے جا کر نورش سے جڑ دی، ہو گی کہ ہندوستانی رقاصہ غائب ہو گئی۔ وہ بے چارہ کیا سوچے گا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ کیا پتہ اب اسے یقین ہو جائے کہ میں اشوری جاسوسہ ہوں پکڑ وا دے پھر بھیانک قید خانہ ـــــ اور ـــــ اور ـــــ اور مدراف گوڈ ـــــ ہولی میری مدراف گوڈ ـــــ برسوں بعد بے اختیار اس نے

ساری دعائیں زور زور سے دہرانی شروع کر دیں۔ پھر اس پر منکشف ہوا کہ وہ قبطی میں "مادرِ خداوند ــــ مادرِ خداوند" رٹے جا رہی ہے۔

ایک بانکا پہریدار ڈھال تلوار جھنجھناتا اس کے نزدیک آیا اور پوچھا۔ "او چھوکری! کیا تو ربہ آئی سس کے مندر کی دیوداسی ہے ــــ؟"

پدما نے بے بسی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا کہتے ہو بھائی خوفو ــــ" دوسرا سنتری اسے بغور دیکھ کر بولا "یہ تو وہی ہے دوشیزۂ فلک، ــــ کل رات ایک گڈریا مجھے بتا رہا تھا ــــ" دونوں سنتری فوراً اس کے سامنے سجدے میں گر گئے۔

عین اس وقت پھاٹک کی بھاری زنجیریں کھڑکھڑائیں۔ نفیری، نقارے اور طبلِ جنگ کی فلک شگاف صدائیں بلند ہوئیں مسلح پیادے اور تیر انداز مارچ کرتے، گھوڑے ہنہناتے، اراکین سلطنت کی سواری کے پیچھے داخل ہوئے۔ بے انتہا اونچا طلائی تاج اور لباسِ فاخرہ پہنے فرعونِ شمال و جنوب اپنے طلائی رتھ میں اکڑا بیٹھا تھا۔ شکل سے کافی بے وقوف معلوم ہوتا تھا۔ اس بھیڑ بھڑکے غل غپاڑے میں پدما نے نکل کر بھاگنا چاہا۔ ایک سپاہی نے نیزے سے اس کا راستہ روک لیا۔

"ربہ حاتور کی پیغامبر ــــ دوشیزۂ افلاک ــــ لبیک ــــ چشمِ ہورس ــــ بڑا زبردست شور مچا۔ ہجوم نے اسے بری طرح گھیر لیا۔ اس کا دم لوٹنے لگا۔ اور اسے غش آگیا۔

○

جب ڈاکٹر پدما میری ابراہام کرین کو ہوش آیا دن ڈھل رہا تھا۔ وہ قصرِ عین الشمس کے عبادت خانہ میں ایک جواہر نگار مسند پر نیم دراز تھی۔ طرح طرح کی خوشبوئیں سلگائی جا رہی تھیں۔ کاہنوں کی جماعت "آمون رع ــــ تاہ[1] ــــ" کے ورد میں مصروف تھی۔ تاہ

[1] قدیم مصری تثلیث۔ تاہ کے آٹھ اوتار تصور کئے جاتے تھے۔

تھیبز ـــــ آنیتر ـــــ کاگیمنی ـــــ کسی کو کیا معلوم کیا، ہونے والا ہے ۔ یا خدا کس وقت اپنا فیصلہ صادر کرے گا ـــــ سراپس ـــــ سراپس ـــــ ایدفو ـــــ تاہ ـــــ تاہ ـــــ تاہ ـــــ

ڈاکٹر کرین کا سر چکرا گیا۔ وہ پھر مسند پر ڈھیر ہو گئی۔ سامنے ضعیف العمر فرعون ایک طلائی کرسی پر بیٹھا دانت نکوسے بڑی دلچسپی سے اسے گھور رہا تھا۔ ایک نرم مزاج شاندار سا شخص جو توتؔ کا والد معلوم ہوتا تھا۔ بستہ سنبھالے بادشاہ کے نزدیک، اسٹول پر بیٹھا تھا۔ دیو قامت، چیف پروہت اور زریں کمر دیو داسیوں نے بے چاری پدما کو گاؤ تکئے کے سہارے بٹھایا۔ اس نے نحیف آواز میں کہا۔ "تھینک یو ـــــ بلیک کافی ـــــ پلیز ـــــ نو شوگر ـــــ"

"دوشیزۂ فلک کیا کہہ رہی ہے؟" فرعون نے مرعوب آواز میں بڑے کاہن سے دریافت کیا۔

اس نے سر ہلایا۔ "جہاں پناہ! یہ الوہی زبان میری سمجھ میں بھی نہیں آتی"۔

فرعون مصر ہاتھ باندھ کر ادب سے ڈاکٹر کرین کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور یوں گویا ہوا ـــــ "زہرہ جبیں دخترِ افلاک! یہ مصر کی عین خوش نصیبی ہے کہ اشوریہ سے جنگ کے دنوں میں مادرِ خداوندؔ[1] نے تم کو یہاں بھیجا اور فتح کی بشارت دی۔ ما بدولت چونکہ خود رعٔ دیوتا کے فرزند ارجمند ہیں، ہمارا فرض ہے کہ بطور مہمان نوازی و سپاس گزاری کل شام کے پانچ بجے تم سے شادی کر لیں ـــــ"

پدما نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ یہ ہیر فرتوت، ـــــ اس کی ممی میں نے برٹش میوزیم میں دیکھی ہے ـــــ میں اس سے شادی کروں گی ـــــ کل ـــــ اسے دوبارہ

[1] دیبی حاتور ہورس دیوتا کی ماں مورتیوں میں شیر خوار ہورس کو دودھ پلاتی دکھائی جاتی تھی۔ مسیحیت سب سے پہلے مصر، شام میں پھیلی اور قبیلیوں نے عیسائی ہونے کے بعد "الوہی ماں اور بیٹے" کے تصور کو مریم عیسیٰ کی پرستش میں منتقل کر دیا۔ کیتھولک کلیسا حضرت مریم کو مادرِ خداوند کہتا ہے۔

چکر آگیا ـــــ آنکھیں بند کرلیں۔ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔

"دوشیزۂ فلک مراقبے میں چلی گئی" چیف کاہن نے آہستہ سے کہا۔ کمرے میں بڑی مؤدبانہ خاموشی طاری تھی۔ اس وقت پدما کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ ایک موہوم سی امید ـــــ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور کمزور آواز میں کہا۔ "تخلیہ ـــــ تخلیہ ـــــ میں دیوی سے رابطہ قایم کرنا چاہتی ہوں ـــــ"

فرعون، توت کا باپ، چیف کاہن اور دوسرے حوالی موالی سب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

پدما نے دوسری آکاش بانی سنائی۔

"فرزند رع سے شادی سے قبل مکمل تنہائی سب دروازے کھلے رکھو ـــــ پہریدار ہٹادو ـــــ"

"جو حکم بنتِ تاہ ـــــ" بڑے کاہن نے سر جھکا کر عرض کی۔

"کوئی ارضی مخلوق، مرد، عورت، چرند پرند مجھے اپنی صورت ـــــ نہ دکھلائے"۔

وہ سب مع فرعون مصر فی الفور غائب ہو گئے۔

پدما نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ نذرانے میں جتنے پھل اور مٹھائیاں اسے چڑھائی گئی تھیں چُن چُن کر پہلے تو وہ صاف کیں۔ منتر پھونکا شربت غٹ غٹ پی ڈالا۔ تب ذرا حواس بجا ہوئے۔ پھر دریچے سے باہر نظر ڈالی۔ شام ہو چکی تھی۔ ہر سو مشعلیں روشن تھیں ـــــ مغنیوں اور سازندوں کا طائفہ بارہ دری کی طرف جاتا نظر آیا جہاں ضیافت کا انتظام کیا جا رہا تھا بڑی گھما گھمی تھی۔ رفتہ رفتہ خاموشی چھائی۔ سارا شاہی خاندان، درباری اور خدام رنگ محل کی سمت چلے گئے۔ کچھ دیر بعد دریچے کے نیچے دو عبرانی غلام چپکے چپکے باتیں کرتے گزرے۔ "نئی شادی کی خوشی میں جشن منا رہا ہے۔ کل ہو گی۔ بڈھا بالکل بولا گیا ہے"۔ پدما کھڑکی میں سے ہٹ گئی۔ آدھ گھنٹے بعد وہ عبادت خانہ سے پنجوں کے بل باہر نکلی۔ سنسان برآمدے کے

سرے پر ایک دراز ریش عبا پوش عبرانی حلقہ بگوش ہاتھ میں مشعل لئے چپ چاپ کھڑا تھا۔ مارے خوشی کے پدما کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے اشارے سے عبرانی کو اپنی طرف بلایا۔ وہ پیر مرد مشعل دیوار کے بریکٹ میں اٹکا کر اس کے قریب آیا۔

پدما نے اس کے کان میں کہا ـــــ "چچا میں ربہ حاتور کی آسمانی خواص نہیں ہوں"۔ بوڑھے نے اسے دھیان سے دیکھا۔ وہ بہت محتاط بزرگ تھا۔ خاموش رہا۔ پدما نے کہا۔ "میرا نام مریم بنت ابراہیم ہے۔ خدائے ابراہیم و اسحٰق کی قسم میرا نام ـــــ"

گرفتار بلا عبرانی ایک دوسرے کو فوراً پہچان لیتے تھے۔ شکلاً یہ لڑکی بنی اسرائیل میں سے نہیں لگتی تھی مگر خدائے ابراہیم کی قسم کھا چکی تھی۔ بوڑھا متفکر ہوا۔ لڑکی نے دوبارہ کہا۔

"بابا ـــــ ربّی ـــــ کیا آپ کا خیال ہے کہ میں دیبی حاتور کی ـــــ"

"لاحول ولاقوۃ"۔ مرد ضعیف نے دفعتاً جوش سے کہا۔

"میں مریم بنت ابراہیم ہوں"۔

"جزاک اللہ ـــــ"

"مجھے کسی طرح عبرانیوں کے محلے تک پہنچا دیجئے۔ میخائیل بن حنان کے گھر تک"۔

"میخائیل بن حنان بہت عام نام ہے اور کچھ اتہ پتہ بتاؤ ـــــ"

"وہ دریائی بندرگاہ کی چنگی میں ملازم ہے۔ اور ـــــ اگر امیرزادہ ثوث ـــــ"

"امیرزادہ ثوث اس وقت ایوانِ ضیافت میں فرعونِ ملعون کے ساتھ کھانا کھا رہا ہے۔ تم کو اس بت پرست نوجوان سے کیا غرض ہے۔ مریم بنت ابراہیم ـــــ؟"

"کچھ نہیں ـــــ" پدما میری ابراہام کریسن نے جلدی سے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ"۔ اس نے اپنی عبا اتار کر پدما کو اڑھائی۔ مشعل بجھائی۔ اور اسے چور راستے سے باہر نکال لے گیا۔ تاریک گلیوں میں سے گزرتے وہ ایک خراب وخستہ محلے میں

پہنچے۔ ایک شکستہ دروازے پر جا کر بوڑھا آہستہ سے پکارا۔

"شالوم علیخم یا یعقوب بن شمعون ——"

"شالوم۔ کون ہے بھائی ؟"

"حزقیل بن ذکریا۔"

"آجاؤ" —— وہ دونوں اندر گئے وہ جمعے کی رات تھی۔ ایک عمر رسیدہ عبرانی اس کی بیوی اور بچے زیتون کے تیل سے روشن منورہ کے سامنے بیٹھے راگ عدتون میں دھیرے دھیرے ایک مناجات گا رہے تھے۔

پدما میری نے عبا اتاری اور کھجور کی چٹائی پر بیٹھ گئی۔ پچھلے کمرے سے میخائیل بن حنان نکل کر آیا۔ حزقیل بن ذکریا نے اس کے کان میں کچھ کہا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔

۱۳۱۵ ق۔م کی اس شب جمعہ (مہینہ اور تاریخ مجھے معلوم نہیں) میری کرین نے ان دکھیاروں کی داستان سنی اور اپنی انھیں سنائی۔ یہ لوگ اس کے ماضی بعید میں موجود تھے۔ اور وہ ان لوگوں کے مستقبل بعید سے آئی تھی۔ لیکن یہ غیر معمولی طور پر ذہین و فہیم انسان جو کچھ اس نے بتایا با آسانی سمجھ گئے خصوصاً نوجوان میخائیل بن حنان جو کرید کرید کر اس سے سوالات کر رہا تھا۔

یعقوب بن شمعون نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "ہمارا مورث اعلیٰ ایک ارمی تھا۔ ابراہیم پیغمبر! وہ عبرالنہر کے اس پار کلدانیہ کے شہر ار میں رہتا تھا۔ وہ اپنے خاندان کو لے کر وادیٔ فرات سے نکلا اور قحط کے دنوں میں چراگاہیں تلاش کرتا پھرا۔ کنعان، مصر —— پھر کنعان اور یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم کے بارہ لڑکے ہوئے۔ اور یوسف بن یعقوب کو اس کے سوتیلے بھائیوں نے ——"

"مجھے سارا واقعہ معلوم ہے۔" پدما نے بے صبری سے کہا۔ رات تیزی سے گزر رہی تھی۔ اگر میخائیل جلد از جلد کسی طرح دریائی راستے سے رو کٹ تک پہنچا دے۔

"یوسف کو" پیر مرد کہتا رہا۔" اسی ممفس کے بازار میں بیچا گیا۔ مگر خدا یوسف کے ساتھ تھا۔ اور ـــــ"

"مجھے معلوم ہے"۔ پدما نے کہا "جوزف ـــ میرا مطلب ہے کہ یوسف نبی کو منسٹر آف فوڈ اینڈ ایگریکلچر بنا دیا گیا تھا ـــــ میرا مطلب ہے ـــــ اور انھوں نے اپنے قبیلے کو کنعان سے بلا بھیجا۔"

"اور بنی اسرائیل مصر میں خوب پھولے پھلے۔ اور ملک ان سے بھر گیا اور ایک نئے بادشاہ نے کہا۔ بنی اسرائیل ہم سے زیادہ طاقتور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بنی اسرائیل پر نگراں مقرر کئے جو ان سے کڑی محنت کرواتے اور انھوں نے فرعون کے لئے پتھوم اور رعمسیس کے شہر تعمیر کئے۔"[1] یعقوب بن شمعون نے کہا۔

"اور بادشاہ مصر نے دو عبرانی دایاؤں سے جن کے نام شفیرہ اور پوعاہ تھے، کہا جب عبرانیوں کے یہاں لڑکے پیدا ہوں انھیں مار ڈالو ـــــ" میری کرین نے بے اختیار انجیل مقدس کی اگلی عبارت دہرائی ـــــ اس کے میزبانوں نے چونک کر اسے دیکھا ـــ "تم کیا کہہ رہی ہو ـــــ یہ کب ہوا ـــــ؟"

تب پدما میری نے سوچا۔ انھیں بتا دینا چاہیے کہ ان کی نجات کا زمانہ دور نہیں۔ اس نے دریچے میں جا کر دیکھا۔ دور قصر عین الشمس میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں اس نے کہا ـــــ "پھر بادشاہ رعمسیس دوئم نے ـــــ عبرانیوں کو حکم دیا، اپنے سارے نوزائیدہ لڑکوں کو دریا میں ڈبو دیں"[2] ـــــ "کیا ابھی ہم پر اور بلائیں نازل ہونے والی ہیں ـــــ؟" زوجہ یعقوب نے دہل کر پوچھا ـــــ

"ہاں! لیکن ایک بچہ موشے بچ جائے گا اور وہ رعمسیس دوئم کے محل میں پلے گا۔ اور وہ تم کو مصر سے نکال لے جائے گا ـــــ"

---

[1] عہد نامہ قدیم کتاب دوم۔ باب ۱ : ۱۔ ۱۳۔ [2] عہد نامہ قدیم کتاب دوم باب ۱ : ۱۵۔ ۱۶۔

عبرانیوں نے مبہوت ہوکر اسے دیکھا ـــــ "لڑکی کیا تم کاہنہ ہو ـــــ؟ غیب کا علم جانتی ہو ـــــ؟"

"یہی سمجھ لو اور سنتے جاؤ۔ یہاں سے نکل کر تم بنی اسرائیل کنعان میں سلطنت قایم کرو گے۔ پھر اشوریہ کے بادشاہ تم کو قید کرکے بابل لے جائیں گے۔ تم تورات کے صحائف لکھو گے۔ ایران کا شاہ سائرس تمھیں آزاد کرکے فلسطین بھیج دے گا۔ تمھارے ہاں داؤد بادشاہ کی نسل میں یسوع پیدا ہوگا۔" پدمانے غیر ارادی طور پر صلیب کا نشان بنایا۔ متحیر عبرانی اسے تکتے رہے۔ اس نے کہا۔ "رومن تمھیں جلاوطن کریں گے۔ تم ساری دنیا میں مارے مارے پھرو گے۔ پھر۔ آج کی رات سے پورے سوا تین ہزار سال اور ولادت مسیح سے انیس سو اڑتالیس برس بعد تم اسی کنعان میں نئی حکومت قایم کرو گے۔ اور جس طرح تم کو دوسری قوموں نے جلاوطن کیا تھا۔ تم عربوں کو ان کے وطن سے نکال دو گے۔"

"عرب، کون ـــــ؟" میخائیل نے دریافت کیا۔

پدمانے اکتا کر اپنے دور کی عالمی سیاست سے اسے مختصراً آگاہ کیا۔ میخائیل نے جو بڑے دھیان سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس سے پوچھا۔ "تمھارے سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ تم روشنی کی رفتار سے تیز تر پرواز کرکے ارضی وقت کی حدود سے باہر ماضی میں پہنچ گئیں۔ اس کے آگے کیا ہوگا ـــــ؟"

پدمانے گھڑی دیکھی۔ "مجھے کچھ معلوم نہیں میخائیل۔ لیکن مجھے جلدی سے شہر پناہ کے باہر پہنچا دو ـــــ" رات گزر چکی تھی۔ اور دریائے نیل پر اجالا پھیل رہا تھا۔

"ہمیں بھی اپنے ساتھ اپنے وقت میں لے چلو۔" عبرانیوں نے اس سے التجا کی۔

"نہیں"۔ پدمانے دل کڑا کرکے جواب دیا۔ "یہ ممکن نہیں۔ ہم اپنے اپنے وقت سے آگے یا پیچھے نہیں جاسکتے۔ اپنے اپنے دور کی آزمائشیں سہنا ہمارا مقدر ہے۔ ہم تاریخ کو آگے یا پیچھے نہیں سرکا سکتے۔ کاش ـــــ وہ سب ہوتا جو نا ہونا چاہیے تھا۔ میں اسرائیل کی بنیہ

دیوره کی طرح تم کو یہ سب بتا رہی ہوں۔ دبورہ چند صدیوں بعد تمھارے ہاں پیدا ہوگی۔ مگر جس زمانے سے میں آئی ہوں، وہ انبیاء کے بجائے سائنسدانوں کا دور ہے"۔ عبرانی کنبہ آنسو بہا رہا تھا۔ طرف میخائیل چہرہ سخت کیے دیوار سے لگا کھڑا رہا۔ پدما نے تاسف سے اسے دیکھا۔

دروازے کی کنڈی کھڑکی۔ وہ سب دم بخود رہ گئے۔ یعقوب کی بیوی نے پدما کو ایک کمبل میں چھپا دیا۔ میخائیل نے کواڑ کھولا۔ دہلیز پر امیر زادہ ثورث کھڑا تھا۔

○

ثورث نے عبرانیوں سے کہا۔ "چراغ بجھا دو ــــ" اور میری سے مخاطب ہوا۔ "میں شاہی دعوت میں شریک تھا۔ جب میرے ایک خادم نے آکر میرے کان میں چپکے سے کہا کہ آسمانی دوشیزہ غائب ہوگئی۔ ایک پہریدار نے اسے عبرانیوں کے محلے کی طرف دیکھا ہے۔ میں نے خادم کو حکم دیا کہ اپنی زبان بند رکھے اور سیدھا یہاں آرہا ہوں۔ تم نے مجھے کل صبح کو نہ بتایا چپکے سے بھاگ گئیں۔ فرعون سمیت سارا دربار اور فوجی افسر نشے میں دھت پڑے ہیں۔ مگر تمھیں ڈھونڈ نکالنے میں انھیں دیر نہ لگے گی اور اگر ان کو شبہ ہوگیا کہ تم اشوری جاسوس ہو۔ پتھر سے باندھ کر نیل میں ڈبو دیں گے۔ اپنے متعلق سچ سچ بتا دو شاید میں تمھیں بچا سکوں"۔

پدما اور عبرانیوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ عبرانی ذہنی ارتقاء کی اونچی سطح پر پہنچ چکے تھے اور پدما کے متعلق سمجھ گئے تھے۔ لیکن بے چارہ ثورث ــــ اتون اور رع اور جانوروں کا پجاری۔ صحیفہ متوفین کا کاتب۔ موت کا پرستار ــــ بعید ترین مستقبل کے متعلق اس کی عقل میں کیا آئے گا۔ پدما نے میخائیل کو دیکھا۔ میخائیل نے آہستہ سے کہا۔ "بتا دو حد سے حد یہ تم کو ایک کاہنہ یا ساحرہ تصور کرے گا۔ ورنہ شاید یہ کبھی تم کو فرعون کے حوالے کر دے"۔

پدما نے چند الفاظ میں ثورث کو بتایا۔ بڑی حیرت کی بات تھی۔ ثورث سمجھ گیا۔ دو تین منٹ خاموش رہا۔ پھر بولا۔ چلو۔ میں تم کو تمھاری ٹائم مشین تک پہنچائے دیتا ہوں"۔

جس وقت وہ عبرانیوں کو خدا حافظ کہہ کر مکان سے نکلی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ وہ ان بے چاروں کو جن کی نسل میں موسیٰ اور عیسیٰ اور کارل مارکس اور سگمنڈ فرائیڈ، اور آئین اسٹائین پیدا ہونے والے تھے، ۱۳۱۵ ق۔م کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بے یار و مددگار کھڑا چھوڑ کر ثوث کے اسپ تازی پر سوار ہوگئی۔ شاید اسی وجہ سے انسان کو یہ صلاحیت نہیں دی گئی ہے کہ وہ آگے یا پیچھے دیکھ سکے۔ ورنہ رو رو کر مر جائے۔ پدما نے سوچا۔

جس وقت وہ دونوں نخلستان میں پہنچے سورج نکل آیا تھا۔ روکٹ کھجور کے سامنے کھڑا دمک رہا تھا۔ پدما کی جان میں جان آئی۔ لیکن عین اسی وقت فصیل شہر کی طرف سے گرد و غبار کے بادل اٹھے۔ فرعون کے شہسوار نیزے چمکاتے اس کے تعاقب میں اڑے چلے آرہے تھے۔ پدما لپک کر روکٹ کی سیڑھیاں چڑھ گئی اور دروازہ کھولا۔ ثوث نیچے کھڑا رہ گیا۔ وہ گھبرا کر چلا رہا تھا۔ "مجھے ساتھ لے چلو ـــــ وہ مجھے مار ڈالیں گے ـــــ تمھیں فرار ہونے میں میں نے مدد کی ہے ـــــ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔" پدما نے بوکھلا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اندر کھینچ لیا۔ دروازہ بند ہوگیا۔ پدما نے ۱۹۶۶ء کا بٹن دبایا۔

○

روکٹ ڈاکٹر کرین کے بنگلے کے لان پر اترا۔ وہ دونوں باہر نکلے، صبح کے سات بجے تھے ابھی چاروں طرف سناٹا تھا۔ پدما نے جلدی سے روکٹ کو خالی موٹر خانے میں مقفل کیا۔ گم صم ثوث سبزے پر کھڑا حیرت سے گرد و پیش کو تک رہا تھا۔ دھاری دار اطلسی لنگی، چوڑا طلائی کنٹھا، بالوں کے چوکور پٹے۔ عجب مسخرا لگ رہا تھا۔ پدما کا دل ڈوب گیا۔ یہ بے چارہ یہاں کیا کرے گا۔ وہ اسے ساتھ لے کر بنگلے میں گئی۔ خوش قسمتی سے دونوں بھائی ایسٹر کی تعطیل میں کوچین گئے ہوئے تھے۔ ملازم صبح دس بجے آتا تھا۔ وہ ثوث کو بھائیوں کے کمرے میں لے گئی۔ ان کا وارڈ روب کھول کر اس کے ناپ کے کپڑے تلاش کیے۔ "لباس تبدیل کر لو۔ میں ناشتہ تیار کرتی ہوں"۔ اس نے کہا اور ڈائننگ روم میں جا کر فرج میں سے مکھن انڈے نکالے، ٹوسٹر

کا پلک لگایا، پر کولیٹر اٹھایا۔ صبح کا ٹائمز آف انڈیا دہلیز میں پڑا تھا اس کی سرخیوں پر نظر ڈالی اور برقی اسٹو جلا کر انڈے ابالنے میں مشغول ہو گئی۔

"ہائے گڈ مارننگ" اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ دروازے میں توث کھڑا تھا۔ ڈریسنگ۔ گاؤن میں ملبوس، انگلیوں میں سلگتا سگریٹ۔ امریکن لہجے میں "بریک فاسٹ ریڈی ؟" پوچھتا کرسی پر بیٹھا اور ٹائمز آف انڈیا کے مطالعے میں منہمک ہو گیا۔

واضح ہو کہ جس طرح ۱۳۱۵ ق۔م میں پہنچتے ہی ڈاکٹر پدما کرین قدیم ترین قبطی اور عبرانی سمجھنے پڑھنے اور بولنے لگی تھی امیر زادہ توث ۱۹۶۶ء میں داخل ہو کر انگریزی، ملیالم اور ہندوستانی سے فی الفور واقف ہو چکا تھا۔

آگے کا قصہ کوتاہ کرتی ہوں۔ پدما نے اپنے حلقے میں توث کو ایک "مصری قبطی دوست" کی حیثیت سے متعارف کیا۔ "مصور ہیں، کلاسیکل مصری آرٹ کے استاد۔ میں ان سے امریکہ میں ملی تھی"۔ پھر السید دکتور توث الہرمیز نے ٹریڈیشنل مصری تصویریں بنانا شروع کیں۔ جو دھڑا دھڑ بکیں۔ بمبئی میں آپ نے کمبالاہل پر ایک فلیٹ کرائے پر لیا اور بہت جلد شہر کے متمول و مقبول شخصیت بن گئے۔ کسی ترکیب سے ایک گلف اسٹیٹ کا پاسپورٹ حاصل کر لیا۔ مغربی یورپ اور امریکہ کے کئی چکر لگائے۔ عمر شریف کی طرح ہینڈسم، کامیاب، دولت مند رومینٹک، بھائی توث ٹھاٹھ کر رہے تھے۔

پدما بدستور جنوبی ہند کی اس لیبوریٹری میں ملازم تھی۔ سال پہ سال گزرتے گئے تو ایک روز اس کی ماں نے کہا۔ "تمھارا ایجپشین کو پٹک دوست شادی نہیں کرے گا کیا؟ سنا ہے بمبئی میں ہر وقت چھوکریوں میں گھرا رہتا ہے"۔ پدما خاموش رہی۔ توث کو اس سے ملاقات کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ کبھی سال دو سال میں اتفاقاً مل جاتا۔ کرسمس اور سال نو کے کارڈ البتہ پابندی سے بھیجتا۔ بات دراصل یہ تھی کہ پدما معمولی شکل صورت کی سیدھی سی لڑکی تھی۔ اور موسیو توث ہرمیز ایک گلیمرس CELEBRITY جو حسیناؤں کے نرغے

میں شاداں و فرحاں تھے۔ دوسری بات یہ کہ مرد چاہے وہ ۱۲۱۵ء ق۔م کا ہو، چاہے ۱۹۷۳ء کا، ذہنیت اس کی وہی رہے گی ——— بیہودہ ———

یہ جون ۱۹۷۵ء کا ذکر ہے۔ پدما دو ہفتے کی چھٹی لے کر اپنی خالہ کے ہاں بمبئی آئی ہوئی تھی اور باندرہ میں ٹھہری تھی۔ ایک شام اس نے ثروث کی خیر خبر لینے کے لئے اسے فون کیا۔

"اگر تم زیادہ مصروف نہ ہو تو کھانا ہم لوگوں کے ساتھ آکر کھاؤ ———"

"تم ہی آجاؤ ———" ثروث کی بیزار سی آواز آئی ——— "میں اتنی دور باندرہ کہاں آتا پھروں گا ———"

بد دماغی کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔ پدما نے سوچا۔ مگر وہ ثروث کو بہرحال اپنی ذمے داری سمجھتی تھی۔ ٹیکسی لے کر کمبالا ہل اولپیا بلڈنگ پہنچی۔ وہ اپنے لگژری اپارٹمنٹ کے ڈرائنگ روم میں ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھا BROOD کر رہا تھا۔ اسکرین پر مصر و اسرائیل کے متعلق ایک مباحثہ ہو رہا تھا۔ پدما جا کر ایک صوفے پر ٹک گئی۔ ثروث اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ پھر دفعتاً ٹیلی ویژن بند کر دیا۔ اور بولا "میں مصر جا کر لڑنا چاہتا ہوں ———"

"یوم کپر وار تو کافی پرانی بات ہو چکی ———" پدما نے آہستہ سے کہا۔

"رمضان وار ———" ثروث نے گرج کر تصحیح کی۔

"او۔ کے۔ رمضان وار ———"

"میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں گا ———"

"اس کے لئے غالباً اب تمہاری عمر نہیں ہے ———"

"شٹ اپ!" اس نے اسکاچ وہسکی کا دوسرا گلاس بھرا۔

"ثروث تم شراب بہت پینے لگے ہو"۔ پدما نے نرمی سے کہا۔

ثروث نے جھنجھلا کر جواب دیا ———

"مجھ سے بیویوں کی طرح بات مت کرو"۔

"آئی بگ یور پارڈن"۔ اب پدما کو واقعی غصہ آگیا۔

"سوری! ___ پدما ___ آئی ایم سوری"۔

ثوث نے دھیرے سے کہا۔ وہ بہت آزردہ نظر آرہا تھا۔

"ثوث ___ ہنی ___ آخر بات کیا ہے ___؟" پدما نے دریافت کیا۔

"بتاؤں ___؟" اس نے رک کر کہا" بات یہ ہے پدما! کہ مجھے اپنا وقت یاد آرہا ہے۔ میں اپنے وقت میں واپس جانا چاہتا ہوں"۔

"اپنے وقت میں ___؟" پدما نے حیرت سے دہرایا۔ "یہ زمانہ چھوڑ کر ___؟"

"یہ زمانہ ___!؟ اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں ___؟" اس نے تلخی سے کہا اور پھر ٹیلی ویژن کھولا ___ نیوز ریل میں دنیا بھر میں بپا جنگوں اور نسلی اور مذہبی فسادوں کے مناظر دکھائے جارہے تھے۔

"بتاؤ مجھ سے ساڑھے تین ہزار سال بعد تم کتنی متمدن ہو ___؟ ہم بنی اسرائیل پر ظلم ڈھاتے تھے اور اشوریہ سے لڑتے تھے۔ تم سب ایک دوسرے کے ساتھ بے انتہا پیار محبت سے رہتے ہو۔ ہمارے فراعنہ ستم پیشہ تھے۔ تمہارے حکمراں فرشتے ہیں۔ ہم موت سے ڈرتے تھے تم موت کے خوف سے آزاد ہو چکے ہو۔ تم عالی شان مقبرے نہیں بناتے، مردہ پرستی نہیں کرتے، نوحے نہیں لکھتے، شعر و شاعری بھی ترک کر چکے ہو۔

"تمہارے مذاہب، فلسفے، اخلاقیات، نفسیات ___" وہسکی کا گلاس میز پر پٹخ کر زور سے ہنسا۔ "تمہاری دیو مالائیں، نظریہ تثلیث، روحانیت، یہ، وہ، سب عین سائنٹفک ہیں۔ تمہاری جنگیں ہیومنزم پر مبنی ہیں۔ تمہارا نیوکلیر بم بھی خالص انسان دوستی ہے ___ ہے نا ___؟ تمہاری روشنی کی رفتار واقعی تیز ہے ___؟"

"تم تھوڑی دیر کے لئے خود کو OUT OF TIME محسوس کر رہے ہو اور کوئی بات نہیں۔ چلو پکچرز ہو آئیں"۔

"اوہ ڈونٹ شٹ اپ۔ اینڈ لیو می الون"۔

"او۔کے"۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "گڈ نائٹ ثوث ——" وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

"پدما ——" ثوث نے آواز دی —— "پدما آئی ایم سوری ——"

"ٹھیک ہے ثوث ——"

"پدما یہاں آؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ سنو۔ بات یہ ہے کہ مجھے اپنے ماں باپ اور بہنیں یاد آ رہی ہیں میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ تمھارا وہ روکٹ وہ ابھی تمھارے موٹر خانے میں مقفل پڑا ہے نا ——؟"

"ہے تو سہی۔ میں اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ ڈر لگتا ہے"۔

"مجھے اس میں واپس پہنچا آؤ۔ میں نے کافی مستقبل دیکھ لیا"۔

"تم زیادتی کر رہے ہو۔ ہم اتنے بُرے تو نہیں۔ یہ تمھارا وقتی موڈ ہے ——"

"ممکن ہے۔ مگر اصلیت یہ ہے کہ میں ہوم سِک ہوں ——"

"ٹایم سِک ——" پدما نے تصحیح کی۔ "اچھا جو تمھاری مرضی۔ لیکن یاد رکھو۔ یہ روکٹ روشنی کی رفتار سے آگے صرف چار مرتبہ سفر کر سکتا ہے۔ تم کو ممفس میں چھوڑ کر جب میں اس دفعہ واپس آؤں گی اس کے بعد تم دوبارہ یہاں نہ آسکو گے"۔

"منظور!" ثوث نے کہا۔

○

۱۳۰۶ ق۔م۔ میں جھیل کے کنارے چرواہا اسی طرح بکریاں چرا رہا تھا۔ نو برس میں وہ جوان ہو چکا تھا۔ پدما اور ثوث کو روکٹ کی سیڑھیاں اترتے دیکھ کر فوراً سجدے میں گر گیا۔ ثوث نے ۱۹۷۵ء سے روانہ ہوتے وقت اپنے پرانے کپڑے اور زیورات پہن لئے تھے اور وہی پرانا ثوث لگ رہا تھا۔ میں شہر نہیں جاؤں گی۔ تمھارا بادشاہ پھر پکڑے گا۔

"جہاں پناہ قصر الشمس میں تشریف رکھتے ہیں یا تھیبز گئے ہوئے ہیں ____؟" ثوث نے چرواہے سے دریافت کیا۔

"پچھلے فرزندرع رحلت فرما چکے ____" اس نے اہرام کی سمت اشارہ کیا، جہاں ایک نیا مقبرہ تعمیر کیا جارہا تھا۔ "رعمیس دوم آج کل تھیبز میں رونق افروز ہیں"۔

"پدما! چلو تمھیں تھیبز دکھلا لاؤں۔ نیا بادشاہ طبعاً بے رحم ہے، لیکن میرے ساتھ کا کھیلا ہوا ہے تم کو کوئی گزند نہ پہنچائے گا۔ اور اپنی ملکہ پر عاشق ہے۔ دوسری شادی کی کبھی نہیں سوجھے گی۔ چلو کل پرسوں واپس آجانا۔"

وہ بجرے پر سوار ہو کر تھیبز روانہ ہوئے ثوث اپنے وقت میں واپس آکر واقعی بے حد خوش اور مطمئن نظر آرہا تھا۔ دریا پر دور سے فلک بوس محلات نظر آئے۔

"یہ اسوان ڈیم میں ڈوب چکے ہیں"۔ ثوث نے پدما کو یاد دلایا۔

"بہت سے بچا بھی لئے گئے ہیں"۔ پدما نے فوراً جواب دیا۔ ملکہ ہاتشیپست، طوطمس سویم سیتی اول، ہورتنا اور مین تاہ کے عظیم الجثہ مجسموں کے نیچے سے گزرتا ہوا بط نما بجرہ سمر پیلیس کی سیڑھیوں سے جا لگا۔ ثوث کے والدین بہنیں، اور شاہی خاندان کے چند افراد سامنے وسیع دالان میں کرسیوں پر نیم دراز خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وہ موسم گرما کی ایک سست خرام، کاہل سہ پہر تھی اور دھوپ دریائے نیل پر سے اترتی جا رہی تھی۔ ثوث نے ان سب سے کہا کہ دیبی جانور کا حکم نہیں کسی کو بتائے کہ دوشیزۂ فلک کے ساتھ اتنے عرصے کہاں غائب رہا۔

چوتھے دن وہ تھیبز سے روانہ ہوئے ____ ثوث اسے نخلستان تک پہنچانے آیا۔ جھیل کے کنارے انھوں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، پدما سکتے میں رہ گئی۔ کھجوروں کے سامنے روکٹ موجود نہ تھا۔ پدما کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ زمین پاؤں تلے سے نکل گئی۔ اور وہ وہیں ریت پر بیٹھ گئی۔ ثوث سراسیمگی سے نخلستان کے گرداگرد دیکھ آیا، چرواہوں کو آواز

دی۔ سپاٹ ریتیلے میدان میں رد کٹ کا کہیں دور دور پتہ نہ تھا۔ ثوث پدما کے پاس ایادہ ریت پر سرنگوں بیٹھی تھی۔ ثوث کی نظر قریب کے ایک پتھر پر پڑی۔ اس کے نیچے پیپائرس کا ایک زرد ٹکڑا دبا ہوا تھا۔ ثوث نے اسے کھینچ لیا۔ پڑھا اور پدما کو دے دیا۔ عبرانی میں لکھا تھا:

مریم بنت ابراہیم۔ شالوم علیخم۔

کل دوپہر پچھلے فرعون علیہ اللعنۃ کے مقبرے کے لئے پتھر ڈھوتے ہوئے مجھے اتنے کوڑے لگائے گئے کہ میں جاں بلب ہو کر پانی پینے کے لئے گھسٹتا گھسٹتا اس جھیل پر آیا اور یہاں تمہارا روکٹ فرشتۂ رحمت کے مانند جگمگاتا دیکھا۔ نو برس قبل اس رات تم نے مجھے جو کچھ بتایا تھا سب رتی رتی مجھے یاد ہے۔ زیرِ تعمیر مقبرے کے مصری انجینئر تین چار دن سے آپس میں تذکرہ کر رہے ہیں کہ دو شیزۂ فلک امیر زادہ ثوث ہرمیز کو واپس لے آئی ہے اور تعبیر گئی ہوئی ہے۔ اس سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ ابھی تم شاید چند روز یہاں قیام کرو گی۔ تم نے یہ بھی کہا تھا کہ رعمسیس دوم کے عہد میں موسیٰ پیدا ہوں گے اور کیا معلوم اس وقت جب کہ میں تم کو یہ سطور لکھ رہا ہوں وہ ہمارے محلے کے کسی گھرانے میں پیدا ہو چکے ہوں لیکن ان کے بڑے ہونے اور ہمارے ایکزوڈس میں ابھی بہت دیر ہے، کیا جانیے کب ہوگا۔ اور کیا ہوگا۔ میں اب اگر شہر واپس جاتا ہوں، عبرانی غلاموں کا نگران اعلیٰ جو میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے، مجھے ریت میں زندہ دفن کر دے گا۔ لہٰذا جان عزیز بچانے کے لئے تمہارے روکٹ پر بیٹھ کر تمہارے وقت میں جا رہا ہوں۔ سب سے پہلے نیویارک جاؤں گا جس کے بارے میں تم نے مجھے اس رات بتایا تھا، اس کے بعد اسرائیل، وہاں سٹیل ہوتے ہی فوراً جلد از جلد، خدائے ابراہیمؑ و اسحٰقؑ کی قسم، میں یہاں آکر تم کو تمہارے وقت میں لے جاؤں گا۔ جو آج سے میرا وقت بھی ہے۔

تمہارا بھائی

میخائیل بن حنان بن یعقوب

(آج سے مائیکل۔ ایچ۔ جیکب عرف مائیک)

پرچہ پدما کے ہاتھ سے ریت پر گر گیا اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا یا اور چکرا کر گرنے لگی۔ ثوث نے اسے فوراً سنبھالا۔

"پدما! اس نے لکھا ہے تم کو لینے واپس آئے گا۔ گھبراؤ نہیں میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ ایماندار، راستباز لڑکا ہے۔ یاد کرو۔ میں بھی اپنی جان بچانے کی خاطر تمھارے ساتھ بھاگ نکلا تھا۔ وہ ضرور واپس آئے گا۔"

"ثوث ـــــ" پدما میری نے آہستہ سے کہا۔ "۱۹۷۵ء سے روانہ ہوتے وقت میں نے تم کو بتایا تھا یہ روکٹ روشنی کی رفتار سے آگے صرف چار مرتبہ پرواز کر سکتا ہے۔"

لکڑ بگّے کی ہنسی

ہمالیہ اور شوالک کی درمیانی وادیاں "ڈُون" کہلاتی ہیں (جن میں سے ایک ــــ دہرہ دون ہے) سوا سو مربع میل پر پھیلا ہوا کوربٹ نیشنل پارک بھی ضلع نینی تال کی ایک ڈون میں واقع ہے۔ رام گنگا پہاڑوں سے اتر کر کوربٹ نیشنل پارک میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے ایک کنارے پر پہاڑی سلسلہ ہے۔ دوسرے پر سال کا گھنا بن ــــ جنگل میں شیر اور چیتے اور ہرن رہتے ہیں، رام گنگا میں گھڑیال، جو ہمارے وقت سے علیحدہ، جیولوجیکل ٹائم اور ڈینوساروں کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں ــــ ہاتھیوں اور دریائی گھوڑوں کی طرح۔ جب کوئی جیپ جنگل کی سڑک پر سے گزرتی ہے، اس کی آہٹ پر شیر اور چیتے، چیتل اور سانبھر اور نیل گائیں چشم زدن میں غائب ہو جاتی ہیں، محض پتّوں کی سرسراہٹ، یا ایک جھلک، یا ایک پرچھائیں، جیسے انسانی دماغ کے اندرونی جنگل میں چھپا کوئی خیال۔ اور کبھی رات کے وقت جیپ یا کار کی ہیڈ لائٹس کی زد میں بیٹھا ہنستا ہوا لکڑ بگا یا اود بلاؤ یا سیاہ ریچھ دکھائی دے جاتا ہے، جیسے اچانک کوئی انجانا خوف مجسّم ہو جائے۔

ہرنوں، رنگ برنگے پرندوں اور سانپوں سے بھرے گھرے بن پر چھائی ہوئی گھپ اندھیری رات کا راگ۔ بہتے دریا اور سوتے گھڑیالوں اور پرندوں اور درندوں اور برفانی سردی

اور متحرک کہرے اور تاریکی کی بے آواز سمفنی۔

اس سال ماہ دسمبر میں جنگل کے کنارے ریسٹ ہاؤس کے کمپاؤنڈ میں حسب معمول بھانت بھانت کے لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اپنی کارواں کار میں انگلستان سے آیا ہوا ایک ریٹائرڈ فوجی افسر اور اس کی میم، کیمبرج یونی ورسٹی کے طلبا جو ہمالیہ کی نباتات کے مطالعہ کے لئے آئے تھے، چند یورپین نوجوان، یہ سب خیموں میں مقیم تھے۔ کچھ فاصلے پر چھولداریوں میں ٹھیکے دار اور مزدور کمپاؤنڈ میں نئی عمارتیں تعمیر کر رہے تھے۔ کوربٹ نیشنل پارک میں سیاحوں کی آمد و رفت بڑھتی جا رہی ہے۔

چیف مہاوت ڈنر کے بعد سارے ہاتھیوں کو لے کر آتا، جو گھٹنے ٹیک کر مغربی سیاحوں کو سلامی دیتے۔ اور میمیں ہاتھیوں کو ایک ایک روٹ کھلاتیں۔ اور پھر سب اپنے اپنے کمروں اور خیموں اور کوارٹروں اور جھونپڑوں اور بلوں اور بانبیوں اور کچھاروں اور آبی غاروں اور گھونسلوں میں جا کر سو رہتے اور صبح کو رام گنگا پر سورج جھانکتا اور جنگل جاگتا اور احاطہ جاگتا۔ اور سب زندہ ہرنوں اور زندہ بکروں اور مردہ بھینسوں (اور کبھی کبھار انسانی لاشوں) اور کچے گوشت اور کیڑے مکوڑوں اور کیچوؤں اور تلے ہوئے انڈوں اور پورج اور کورن فلیک اور ٹوسٹ اور جام، جیلی مارملیڈ اور چائے، کافی یا پوری، بھاجی یا خاگینہ، پراٹھے یا سوکھی روٹی کا ناشتہ کر کے اپنا اپنا دن شروع کرتے۔

اور تب دبے پاؤں بدھو احاطے میں داخل ہوتا۔ وہ نئی عمارت کے نیچے جا کھڑا ہوتا اور رام پوری پیرا آواز دیتا —— بدھو آگیا۔ اور سڑک پر ٹہلتی ہوئی معمر مسز فری مینٹل کہتیں —— "ہلو بوڈو —— گڈ مارننگ ——" اور بریگیڈیر فری مینٹل غراتے "ہلو بوڈو۔ اولڈ راسکل"۔ اور امریکن سیاح مسکرا کر کہتے "ہائی بوڈو"۔ اور کوئی امریکن لڑکی پکارتی "از نٹ ہی کیوٹ؟"

بدھو دو مرتبہ کمپاؤنڈ میں آتا ہے۔ صبح کو ناشتہ کرتا ہے۔ واپس چلا جاتا ہے۔ رات کو

کھانا کھا کر پھر واپس۔

شام ہوئی۔ اس کہر آلود شام ایک سبز رنگ کی جیپ اسٹیشن ویگن آکر نئی عمارت کے سامنے رکی۔ دو مرد اور ایک عورت اس میں سے اترے۔ نئے ریسٹ ہاؤس کے ملازموں نے دوڑ دوڑ کر اسباب اتارا، کیوں کہ وہ بہت متمول سیاح معلوم ہوتے تھے۔ امریکن میچنگ کا سنی پھول دار سوٹ کیس، ہولڈال اور بیگ۔ بڑھیا پکنک باسکٹ۔ وہ تینوں استقبالیہ کمرے میں داخل ہوئے جس کے ایک کمرے میں بھدی چمکیلی بار بنا دی گئی تھی۔ لڑکی نے ابرو اٹھا کر ناگواری سے چاروں طرف نظر ڈالی جیسے وہ صرف پانچ ستاروں والے ہوٹلوں کی عادی ہو۔

بار پر بریگیڈیر فری مینٹل تنہا بیٹھا تھا۔ نوواردوں میں سے ایک بار کی طرف آیا۔ جودھپوری میں ملبوس۔ سر پر صافہ۔ ایک کان میں سوراخ، نوکیلی مونچھیں۔ کہ ایسے کردار روہیل کھنڈ کے افسانوی خطے میں آج بھی نظر آتے ہیں۔ اس نے انگلی اٹھا کر پہاڑی لڑکے سے کہا "ایک برانڈی اور سوڈا" —— اور عنابی چمڑے کے اسٹول پر ٹک گیا۔ چند منٹ بعد اس نے بریگیڈیر پر نظر ڈالی اور اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ مگر بریگیڈیر نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ کسی بھی سفید فام مغربی کی موجودگی میں ہندوستانی عموماً بے حد سیلف کونشس ہو کر عجیب لہجے میں انگریزی بولنے لگتے ہیں اور بہت فخر کرتے ہیں کہ گوری چمڑی والے سے ہم کلام ہیں اور ان کے پورے انداز میں ایک عجیب لجاجت اور مسکینی آجاتی ہے۔ اہل مغرب اس وقت دل میں ان پر ہنستے ہیں —— اور یہی ہندوستانی اپنے ہم وطنوں سے عموماً سخت کلامی سے پیش آنے کے عادی ہوتے ہیں۔

دوسرا آدمی دبلا پتلا، پستہ قد اور گنجا تھا اور اس کی کاہل غلافی آنکھیں SLOTH BEAR (ریچھ) کی آنکھوں سے مشابہ تھیں جنھیں وہ بڑی سستی سے گھماتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور ریسٹ ہاؤس کے منیجر سے مصروفِ گفتگو تھا۔ لڑکی اکتائی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ کوئی سنیما اسٹارلٹ معلوم ہوتی تھی یا کوئی کامیاب، مہنگی، فیشن ماڈل، خوش شکل، کھلتی رنگت،

صحت مند، دراز قد، شربتی آنکھیں۔ اس نے بیش قیمت ہیرے پہن رکھے تھے۔ ناٹا آدمی عمر میں اس سے دگنا نظر آتا تھا۔ چند منٹ بعد وہ دونوں اوپر چلے گئے۔ کن چھدا آدمی بار پر برانڈی پیتا رہا۔ باہر سے شیروں کی دہاڑنے کی آواز آئی۔

"افسوس کہ یہ لاجواب "ٹائیگر کنٹری اب کالاگرمڈ ڈیم میں ڈوب جائے گی"۔ کن چھدے آدمی نے کہا۔

"مجھے بھی افسوس ہے"۔ بریگیڈیر نے مختصر جواب دیا۔

"میں بڑے بڑے رؤسا کو شکارگاہوں پر لے جاتا رہا ہوں۔ وہ زمانے لد گئے۔ آپ؟"

"مچھلی کے شکار کے لئے ہر سال انگلستان سے آتا ہوں"۔ بریگیڈیر نے جواب دیا۔

"آپ کی کوئی خدمت کر سکوں تو حاضر ہوں"۔ کن چھدے آدمی نے کہا۔

"نہیں۔ شکریہ"۔ بریگیڈیر نے رکھائی سے جواب دیا۔

باہر رات کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ کن چھدا آدمی بریگیڈیر کو گھورنے لگا۔ اس کی آنکھ۔ صرف ایک آنکھ۔ سرخ ہو چکی تھی۔ "ترائی کا یہ علاقہ بہت رومینٹک علاقہ ہے"۔ اس نے کہا "اگر آپ۔۔۔۔"

یہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے جو خواہ مخواہ کسی سفید فام مغربی سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ بریگیڈیر نے سوچا اور اسٹول پر سے اٹھا، چرٹ سلگایا اور اسے "گڈ نائیٹ" کہہ کر سرعت سے باہر نکل گیا۔

کن چھدا آدمی بار کی سطح پر طبلہ بجانے لگا۔ اس نے گلاس ختم کیا اور بارمین سے بولا "بل اوپر بھیج دینا۔ ان کے کمرے کا کیا نمبر ہے؟ بل صاحب کو بھیج دینا، جو میم صاحب کے ساتھ آئے ہیں۔ زینہ کدھر ہے؟"

بارمین نے راستہ بتایا۔

اوپر پہنچ کر کن چھدے آدمی نے ایک دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی

"آجاؤ"۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر گیا۔ لڑکی مسہری پر نیم دراز جم کوربٹ کی "کمایوں کے آدم خور" کی ورق گردانی کر رہی تھی جو سیاحوں کے لئے ہر کمرے میں موجود تھی۔ ناٹا آدمی دوسرے پلنگ پر لیٹا چھت کو تک رہا تھا۔ "جاؤ"۔ اس نے تحکمانہ آواز میں کہا جو اس کے نحیف سراپا سے لگا نہ کھاتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں راتوں رات ڈھکالا سے نکل جاؤں گا۔ آپ مجھے نجیب آباد..."

"جاؤ"۔ ٹھنگنے آدمی نے اس کی بات کاٹی۔

"گڈ نائٹ" کن چھدے آدمی نے لڑکی کو مخاطب کیا" اتوار کو صبح کو آؤں گا تیار رہنا۔"

"جاؤ"۔ ناٹے آدمی نے دہرایا۔

کن چھدے آدمی نے جھک کر سلام کیا اور باہر چلا گیا۔

ناٹے آدمی نے اٹھ کر ایک سوٹ کیس کھولا۔ اس میں سے چمڑے کی پیٹی نکالی اور ایک چابک۔ اس نے دونوں چیزیں لڑکی کی طرف پھینکیں اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

○

صبح سویرے مسز فری مینٹل کارواں کار کے سامنے کپڑے دھو کر الگنی پر ٹانگ رہی تھیں۔ ان کے شوہر نزدیک کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ دفعتاً وہ بولیں "پُور گرل۔ پور تھنگ"۔

بریگیڈیر خاموش رہے۔

"انڈین چائلڈ برائیڈ ——— بے چاری! کیا ہم اس کے لئے کچھ کر نہیں سکتے ہنری؟"

"کیا ہے ڈورس؟" بریگیڈیر نے ذرا جھنجلا کر پوچھا۔

"وہ لڑکی بے چاری جو کل رات یہاں آئی ہے ——— وہ صبح شال اوڑھے اس طرف

چہل قدمی کر رہی تھی۔ ساڑی کے نیچے اس کی پیٹھ پر چابک کے نشان نظر آرہے تھے۔ اس کا شوہر اسے مارتا ہے۔ کیا ہم ..... "

"ڈورس، دوسروں کے معاملات میں ناک مت ڈبوؤ"۔

"لیکن ہنری ...."

○

صبح کو گیارہ بجے کے قریب لڑکی اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے تیار ہو رہی تھی۔ اس نے باقاعدہ سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ بونا شوقین آدمی تھا۔ وہ بالوں کی کھچڑی جھالر میں سوئس پین ٹین لگاتے ہوئے لہک لہک کر گاتا جاتا تھا "دل جنگل ہی میں بہلتا ہے۔ یہاں حسن پہ عشق مچلتا ہے ....."

لڑکی غور سے اس کا گانا سن رہی تھی۔

"یہ گانا جب تم پیدا نہیں ہوئی ہو گی تب کا ہے"۔ اس نے کیمرہ اور دوربین اٹھاتے ہوئے کہا۔

دونوں باہر آئے۔ دروازے میں تالا لگایا۔ نیچے اترے اور ہاتھی کے چبوترے کی طرف بڑھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر پلیٹ فارم کے اوپر پہنچے اور ہتھنی پر سوار ہوتے ہوئے جو کار کی طرح پلیٹ فارم سے لگی کھڑی تھی۔

ہودے میں بیٹھ کر لڑکی کھلکھلا کر ہنسی۔ وہ بچوں کی طرح خوش تھی۔ دھوپ میں اس کے ہیرے چمک رہے تھے۔ گندا بوسیدہ خاکی کوٹ پہنے منحنی مہاوت نے انکس سنبھال کر ہتھنی کو آہستہ سے پچکارا "چل بیٹا رام کلی ــــ بسم اللہ!"

رام کلی پھاٹک کی طرف چل پڑی۔

کمپاؤنڈ سے باہر نکل کر وہ رام گنگا کے ایک اتھلے حصے پر سے گزرتے جنگل کی طرف بڑھے۔ لڑکی بے حد مسرت سے دوربین کے ذریعہ چاروں طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار ناٹے آدمی

سے کہتی "وہ ـــــ وہ ـــــ دیکھو مور ـــــ ارے ! بارہ سنگھا ـــــ وہ دیکھو گھڑیال ـــــ مائی گاڈ ـــــ کتنا بڑا مگرمچھ ـــــ وہ دیکھو۔ وہ کیا ہے مہاوت سیاں ؟"

"سانبھر میم صاحب۔ بولئے مت۔ آواز سنتے ہی سب غائب ہو جاتے ہیں ـــــ"

رام کلی جنگل میں پہنچی، جہاں بئے کے ان گنت گھونسلے پیڑوں میں قندیلوں کی طرح آویزاں تھے۔ دور سے انھیں دو ہاتھی اور نظر آئے، جن پر کیمبرج سے آئے ہوئے انگریز طلباء سوار تھے۔

جنگل کے ایک حصّے کا چکّر لگا کر سدھی ہوئی رام کلی واپس مڑی۔ ریسٹ ہاؤس پہنچ کر لڑکی نے فیل بان کو بیس روپے بخشش دئے۔ کمپاؤنڈ کے عملے میں لڑکی کی امارت اور دریا دلی کا شہرہ ہو چکا تھا۔ ایک بیرے نے اسے خوش کرنے کے لئے آگے بڑھ کر کہا "وہ دیکھئے میم صاحب، بدّھو آگیا ـــــ"

"بدّھو ـــــ ؟ اسے جانے نہ دینا۔ میں اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤں گی"۔ لڑکی نے کہا اور ڈائننگ ہال کی طرف چلی گئی۔

ڈائننگ ہال ڈیپرسنگ تھا۔ لڑکی، جو جنگل میں بہت خوش نظر آرہی تھی، اب بڑی بے کیفی کے ساتھ کھانا کھانے میں مصروف ہوئی۔

اس وقت صرف ایک اور کنبہ وہاں موجود تھا۔ لڑکی نے اکتا کر ان پر نظر ڈالی۔ بیوی کے سر میں تیل۔ کسا ہوا جوڑا۔ بھدی چھینٹ کی نائیلون ساڑی سونے کی چوڑیاں، مانگ میں سیندور، ماتھے پر پلاسٹک کی نیلی بندی۔ بچے بازار کے سلے ہوئے "بابا سوٹ" پہنے، شوہر کے ہاتھ میں "دھرم یگ" کا تازہ پرچہ۔ وہ سب بھی ایک دوسرے سے بے راز بیٹھے تھے۔

○

بیرے نے کھانا سرو کیا۔ وہ رام پور کا تھا اور شکل سے احمد جان تھرکوا کا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ زندگی بڑی بے رنگ، مضمحل، نجالت انگیز اور بے ہودہ شے تھی۔

کھانے کے بعد وہ پلیٹ لے کر بدّھو کو کھلانے کے لئے باہر آئی۔ پھر وہ ٹہلتی ہوئی دریا کی طرف چلی گئی۔ راستے میں اسے وہ پلاسٹک کی بندی والی بیوی ملیں۔ انھوں نے اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ مسکرائی۔ وہ بھی مجبوراً مسکرائیں۔ لڑکی ان سے باتیں کرنے لگی۔

انھوں نے پوچھا "کون ذات ہو؟"

"برہمن"۔ اس نے جواب دیا۔

"کیا نام ہے؟"

"بن دیوی"۔ اس نے کہا۔

"وہ تمھارے ہز بنڈ ہیں؟"

"اور آپ کو کیا لگتے ہیں؟" لڑکی نے ہنس کر پوچھا۔

وہ تیوری پر بل ڈال کر آگے بڑھ گئیں۔

وہ کمپاؤنڈ سے نکل کر اس جگہ پہنچی جہاں ایک نئی عمارت تعمیر کرنے والوں کے خیمے لگے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ جنگل کے کنارے باجماعت نمازِ ظہر ادا کرنے میں مشغول تھے۔ انگیٹھیوں پر مرغن کھانے پک رہے تھے۔ ایک آدمی نے سلام پھیر کر نظر ڈالی اور دریافت کیا "جی میم صاحب، فرمائیے"۔

"کچھ نہیں۔ ایسے ہی چلی آئی تھی۔ کیا پک رہا ہے؟"

"بسم اللہ کیجئے۔ ارے دلاور، ذرا میم صاحب کے لئے زردہ تو نکال کر لانا"۔ اس نے کرسی پیش کی۔ "ہم لوگ بجنور کے رہنے والے ہیں۔ سال بھر سے اس جنگل میں پڑے ہیں۔ کام ختم ہو تو واپس جائیں"۔

"نیاز کی قاب میں سے مت دینا"۔ ایک نورانی صورت والے سفید ریش نے آہستہ سے لڑکے سے کہا۔ لڑکی نے سن لیا۔

دلاور پھول دار تام چینی کی پلیٹ میں زردہ نکال کر لایا۔ لڑکی نے مسکرا کر پوچھا "کس کی نیاز

تھی ؟"

"بڑے پیرکی"۔ لڑکے نے ذرا جھینپ کر جواب دیا۔

لڑکی نے زردہ چکھا اور ایک بیس روپے کا نوٹ دلاور کو بھی تھما دیا۔

"آداب عرض سیم صاحبہ"۔ ٹھیکے دار نے شائستگی سے کہا۔

"وعلیکم السلام"۔ اس نے جواب دیا اور کمپاؤنڈ کی طرف واپس چلی گئی۔ بجنوریوں نے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

تیسری صبح، گیارہ بجے ـــــ بریگیڈیر دھوپ میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ناٹا آدمی تیز تیز چلتا اس کے پاس آیا اور بولا "میں ایک ضروری کام سے شہر جا رہا ہوں۔ رات کو آؤں گا یا کل صبح۔ آپ اور مسز فری مینٹل ذرا میری بیوی کا خیال رکھئے گا"۔ اور اپنی جیپ اسٹیشن ویگن میں بیٹھ کر پھاٹک سے باہر چلا گیا۔

مسز فری مینٹل نے کہا۔ "بدتمیز آدمی ایسی پھول سی لڑکی کو مارتا ہے۔ مجھے یقین ہے اس بے چاری کے غریب ماں باپ نے روپے کی خاطر اس کے ہاتھ بیچ دیا ہوگا۔ مشرق میں یہ عام طور پر ہوتا ہے"۔

بدھو آکر کرسی کے برابر کھڑا ہو گیا۔ مسز فری مینٹل نے پیار سے اس کی تھوتھنی پر ہاتھ پھیرا۔ وہ ایک جنگلی سور تھا جو جنگل سے نمودار ہوتا تھا اور اپنی خاطریں کرا کے جنگل میں واپس چلا جاتا تھا۔ حاطے والوں نے اس کا نام بدھو رکھ چھوڑا تھا۔

لڑکی ریسٹ ہاؤس سے نکل کر آئی۔ "گڈ مارننگ" کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"بدھو جنگل کا بہترین پبلک ریلیشنز افیسر ہے۔ وہاں کا نمائندہ جو انسانوں کے جنگل سے رابطہ رکھتا ہے!" بریگیڈیر نے کہا۔

"وہ جنگل اندر سے نہ جانے کیسا ہوگا"۔ لڑکی بولی۔

"تم اسے اندر سے دیکھ تو چکی ہو"۔

"بالکل، بے حد اندر سے نہیں دیکھا۔"

"اس کے اندر بسنے والوں کے لئے وہ ایسا ہی ہوگا جیسے ہمارے لئے ہماری دنیا۔ جب ہم اور جاپانی برما کے جنگلوں میں لڑ رہے تھے تو دونوں درندے لگتے تھے"۔

پچھلے ایک دن میں اس ملنسار لڑکی سے دونوں میاں بیوی کی دوستی ہو گئی تھی۔ مسز فری مینٹل کارواں کار کی طرف چلی گئیں۔

"کیا میں لنچ تک آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟" لڑکی نے بریگیڈیر سے پوچھا۔ یقیناً۔ تمہارا شوہر بھی ہم سے کہہ گیا ہے کہ ——"

وہ ہنس پڑی۔ "وہ میرا شوہر نہیں ہے۔ میں اس سے کلکتہ ریس کورس پر ملی تھی۔ وہ ایک مال دار جوکی ہے۔ بیوی بچوں والا اور پرورٹ۔ میں چھ مہینے سے اس کے ساتھ ہوں۔ مگر اب بور ہو چکی ہوں اور اسے چھوڑنا چاہتی ہوں۔ مگر وہ مجھے چھوڑنے کو تیار نہیں۔ میں اس سے اتنا مال بٹور چکی ہوں جتنا سال بھر میں بھی نہیں کما سکتی تھی۔ یہ ہیرے دیکھئے —— 'بلیو بیلجیم'۔"

"آئی سی"۔ بریگیڈیر کے منہ سے نکلا۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا تھا۔ "مگر میری بیوی کے سامنے یہ سب نہ کہنا۔ وہ ایک قدامت پرست انگریز خاتون ہے۔ پھر وہ تم سے بات نہ کریں گی۔"

"ویری ویل بریگیڈیر"۔

"مگر تم ایک شریف خاندانی لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ تم ...."

"کیا آپ بھی وہی بات دہرانے والے ہیں کہ تم جیسی شریف لڑکی یہ کیا کر رہی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے جناب کہ THERE IS BIG MONEY IN IT۔

اور اب ہماری بزنس انٹرنیشنل بنتی جا رہی ہے۔ میری چند سہیلیاں مڈل ایسٹ اور مغرب کے چکر لگاتی ہیں۔ میرے والدین اور بھائی کو میرے متعلق معلوم ہے۔ وہ دلی میں ہیں!"

"وہ خوفناک آدمی جو تمہارے ساتھ آیا تھا وہ کون ہے؟" بریگیڈیر نے دریافت کیا۔

"میرا پبلک ریلشینز آفیسر۔"

بریگیڈیر نے نرمی سے کہا "مائی ڈیر، کیا تم کو ڈر نہیں لگتا؟ کبھی تم کسی ایسے شخص کے ہاتھ لگ جاؤ جو نیم مجنوں ہو یا سادیت پسند —— یا —— کیوں کہ پاگل پن اور صحیح الدماغی میں بال برابر کا فرق ہے۔"

"یہ آدمی بھی SADIST ہے۔ مگر میں اسے ہینڈل کرنا جانتی ہوں۔ اور بہر حال یہ OCCUPATIONAL HAZARDS تو ہیں ہی۔ میری ایک سہیلی جو اسکول میں میرے ساتھ پڑھتی تھی نرس بن کر ویسٹ جرمنی گئی۔ نرسنگ چھوڑ کر وہ ہیمبرگ کے ایروس پیلس میں شامل ہو گئی۔ بس چند روز میں لکھ پتی۔ شاندار گھر۔ سوئمنگ پول۔ بڑھیا کار۔ موقع ملا تو میں بھی باہر جا کر یہی کام کروں گی۔"

"کیا کام مائی ڈیر؟" مسز فری مینٹل نے اپنی کارواں کار سے واپس آتے ہوئے دریافت کیا۔

"سوشل ورک، خدمتِ خلق، مسز فری مینٹل"۔ لڑکی نے متانت سے جواب دیا۔

"ہچ"۔ بریگیڈیر نے زیرِ لب کہا۔

کچھ دیر بعد وہ لنچ کے لئے چلی گئی۔ تیسرے پہر کو برآمدے میں نکلی۔ ایک زخمی پرندہ، جو پھڑپھڑاتا برآمدے میں منڈلا رہا تھا، ایک در سے ٹکرا کر نیچے گرا۔ لڑکی نے اسے اٹھایا اور بڑے رنج اور دردمندی سے اسے پچکارتی رہی۔ پھر اسے کچھ خیال آیا۔ پرند کو ساری کے آنچل میں چھپا کر کیمبرج والوں کے خیموں کی طرف روانہ ہو گئی۔

○

ایک چھولداری کے سامنے وہ پانچوں بیٹھے تھے۔ تین لڑکے، دو لڑکیاں، صحت مند، لمبے تڑنگے، سنہری بالوں، سنہری داڑھیوں والے نوجوان یورپ کے شمالی جنگلوں کے دیوتا،

سورج کی اولاد، اور لڑکیاں ــــ گوری چٹی، سنہری، تروتازہ، بن دیویاں۔ کیا شاندار لوگ ہیں یہ یورپین۔ ایک ہم ہیں سڑے بسے، کالے کلوٹے، سوکھے چمرخ، ناٹے، بدشکل، لاغر، ٹڈے، جھینگر ــــ اس نے سوچا اور اشتیاق سے ان کو تکتی رہی۔ پھر ذرا جھجک کر آگے بڑھی۔ وہ پانچوں تبادلۂ خیالات میں منہمک تھے۔ ان کے علوم کی کتابیں قریب رکھی تھیں۔

"گڈ مارننگ"۔ اس نے کہا۔ "اکسکیوز می"۔

"ہلو۔ گڈ مارننگ"۔ ایک سورج کا بیٹا اٹھ کر اس کی طرف آیا۔

اس نے زخمی چڑیا پیش کی۔ "مجھے خیال آیا، آپ لوگ جنگل کے مطالعے کے لئے آئے ہیں۔ آپ کو دلچسپی ہو گی"۔

"اوہ ہاؤ ویری نائس آف یو ــــ تھینکس"۔ لڑکے نے پرندہ بڑی احتیاط سے ہاتھ میں لیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف لپکا۔ وہ لوگ فوراً پرندے کی مرہم پٹی میں منہمک ہو گئے۔

چند منٹ تک وہ اس امید میں کھڑی رہی کہ وہ اس سے بات کریں گے پھر مایوس ہو کر واپس لوٹ گئی۔

شام کے وقت وہ برآمدے میں اکتائی ہوئی کھڑی تھی جب وہی انگریز لڑکا بار کی سمت جاتا نظر آیا۔ وہ فوراً اندر گئی اور بار روم کے صوفے پر ٹک گئی۔ لڑکا بیئر کی بوتلیں خرید کر دروازے کی طرف بڑھا۔ لڑکی نے ہاتھ اٹھا کر "ہلو" کہا ــــ وہ سر خم کر کے مسکرایا اور اس کے نزدیک آیا۔

"گڈ ایوننگ میم ــــ مسز۔۔۔"

"مسز ایل۔۔۔۔"

"ہاؤ آر یو مسز ایل؟"

"میرا اپنا نام رم ہے"۔

"آپ مذاق تو نہیں کر رہی ہیں؟ رم اور ایل!"

"بالکل نہیں۔ میں اپنے شوہر کو ALE پکارتی ہوں۔ وہ اسی نام سے مشہور ہو گیا ہے۔

میرا اپنا نام دراصل رمبھا ہے جو ہماری ہندو مائیتھولوجی میں ایک آسمانی رقاصہ تھی۔"
"کس قدر دلچسپ ——" لڑکے نے کہا "میرا نام محض برنارڈ کریگ ہے ——"
"بیٹھو۔ کافی پیو —— بیرا!" لڑکی نے آواز دی۔ وہ یک لخت بہت خوش اور پُر امید نظر آ رہی تھی۔ "تمھارا پرند اب کیسا ہے؟"
"مرہم پٹی کے بعد وہ اچھا ہو گیا' اپنے جنگل واپس چلا گیا"۔ انگریز نوجوان نے جواب دیا اور بیٹھ کر رسمی گفتگو کرنے لگا۔
"میں سوچتی ہوں، ہم بھی اپنے جنگل واپس جائیں، یعنی مہذب دنیا۔ یہاں وقت گزارنا بہت مشکل ہے۔ وقت یہاں ساکن ہے۔ لیکن کیپٹن کا ارادہ ہے کہ چند روز اور قیام کر کے مہا شیر پکڑیں، پہاڑوں کے نیچے جہاں سے رام گنگا نکلتی ہے"۔
"ہم لوگ بھی وہ جگہیں دیکھنے آئے تھے جہاں سے دریا نکلتے ہیں"۔ سورج دیوتا نے کہا۔ سنہرے بالوں کا ہالہ۔ سنہری ڈاڑھی۔ بار روم کی نیم تاریکی میں سورج کی طرح روشن۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے ہندوستان اتنا اچھا لگا کہ دل چاہتا ہے کہ کسی ہندوستانی لڑکی سے شادی بھی کر لوں۔ انگلستان میں میرے انگریز دوست جنھوں نے ہندوستانی لڑکیوں سے شادیاں کی ہیں بہت خوش ہیں۔ وہ کہتے ہیں آپ لوگ نہائت وفا شعار اور خدمت گزار بیویاں ثابت ہوتی ہیں۔ ہماری لڑکیوں سے بالکل مختلف"۔
لڑکی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بے حد مضطرب نظر آئی۔
بیرا قہوے کی ٹرے لے کر آ گیا۔ وہ کافی بنانے میں مصروف ہو گئی۔ پھر اس نے پوچھا۔ "تم نے یہاں شیر دیکھا؟"
"نہیں۔ پرسوں یہاں گارا باندھا گیا تھا۔ ہم لوگ بہت دیر تک مچان پر بیٹھے رہے، مگر شیر نہیں آیا۔ اب پرسوں ترسوں ہم لوگ دہلی چلے جائیں گے۔ پھر واپس انگلینڈ"۔
لڑکی نے آہستہ آہستہ اداس آواز میں کہنا شروع کیا —— "میرے والد ہز ہائی نس

آف کرن پور اپنے زمانے کے نامور شکاری تھے۔ ان کے ساتھ میں بہت سی شکار گاہوں پر گئی ہوں۔ میرا بھائی بھی ماہر شکاری ہے۔"

انگریز نوجوان بڑے اشتیاق سے اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ کہتی رہی "جب رجواڑے ٹوٹے میں بہت چھوٹی تھی۔ ہمارا طرزِ زندگی بدل گیا۔ بڑی ہو کر مجھے ایر ہوسٹس بننا پڑا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر انگوٹھی دکھائی ——— "یہ بلیو بلجیم ——— ہمارے آبائی خزانے کی آخری یادگار ہے۔"

"فینسی نیٹنگ! چنانچہ تم فلائنگ پرنسس تھیں!"

"پرواز کے دوران طیارے کے کیپٹن سے دوستی ہو گئی۔ ہم نے شادی کر لی۔ وہ شراب بہت پینے لگا تھا، اس لئے اسے گراؤنڈ کر دیا گیا۔ اب میں اپنے ناقابلِ برداشت شرابی شوہر سے طلاق لینے والی ہوں ——— کاش ———"

انگریز نوجوان خاموش رہا۔

"یہ جگہ فطرت کا ایک حصہ ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان سچ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے میں تم کو یہ سب بتا رہی ہوں۔"

"میری عزت افزائی ہے مسز ایل ———" برنارڈ کریگ نے نرمی سے کہا۔

ایک آدمی بھاری سیاہ اوورکوٹ پہنے کمرے میں داخل ہوا۔ برنارڈ نے اس پر نظر ڈالی اور بولا۔ "مسز ایل، آپ نے کبھی غور کیا۔ بعض انسانوں کی صورتیں اور حلیے جانوروں سے ملتے جلتے ہیں؟ کیا یہ آدمی ہمالیہ کا سیاہ ریچھ نہیں ہے؟ اور کل ہم نے ایک پستہ قد شخص دیکھا۔ وہ بالکل SLOTH BEAR معلوم ہوتا تھا۔"

"اور میں کس حیوان سے مشابہ ہوں؟" لڑکی نے مسکرا کر دریافت کیا۔

برطانوی نوجوان نے اسے دھیان سے دیکھا اور بولا "چیتل ——— یا جنگلی بلی ———"

"شکریہ! کیوں کہ میری آنکھیں شربتی ہیں؟ ہاں انسانوں اور جانوروں کی آنکھیں

ایک سی ہوتی ہیں۔ بجو کی منحوس آنکھ۔ مچھلی کی سرد آنکھ۔ بیل کی احمقانہ آنکھ ـــــ"

"وہ دیکھئے، ایک پہاڑی بکرا اسٹول پر جا بیٹھا ـــــ" لڑکے نے ہنس کر کہا۔

وہ بھی ہنس پڑی "کچھ لوگ مینڈک معلوم ہوتے ہیں، کچھ ہاتھی، کچھ گینڈے اور ٹڈے اور بیل اور سارس۔ بعض عورتیں چھپکلی معلوم ہوتی ہیں، یا بے وقوف چڑیاں"۔

"یہ سارا ایک خاندان ہے"۔ برنارڈ نے جواب دیا "میرا ایک ہندو دوست کہتا ہے کہ سب جاندار ایک کنبہ ہیں اور سب آواگون کے قانون کے مطابق اسی ہزار جونیں بدلتے رہتے ہیں"۔

"اچھا؟" لڑکی نے تعجب سے پوچھا۔

"آپ ہندو نہیں ہیں؟"

"نہیں ـــــ میں ـــــ میں عیسائی ہوں۔ میری ممی ہر ہائی نس آف کرن پور عیسائی تھیں"۔

"اوہ!" برنارڈ نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ کافی ختم کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا "کافی کا شکریہ۔ شب بخیر پرنسس۔ کل ملاقات ہوگی"۔

وہ ذرا تیزی سے باہر جا کر کہرے میں غائب ہو گیا۔

چوتھی صبح برطانوی طلباء ایک درخت کے نیچے مصروفِ مطالعہ تھے۔ لڑکی ٹہلتی ہوئی ان کے قریب سے گزری۔ انھوں نے اسے نہیں دیکھا۔ ("میں کسی ہندوستانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں ہندوستانی لڑکی سے ....") وہ تیز تیز چلتی ہوئی بجنوریوں کی خیمہ گاہ تک پہنچی۔ نورانی صورت والے بڑے میاں مصلّے پر بیٹھے تھے۔

"السلام علیکم"۔ اس نے قریب جا کر کہا۔

"وعلیکم السلام"۔ بڑے میاں نے ذرا مشتبہ نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ آہستہ سے ملتجیانہ آواز میں بولی "حضور میرے لئے دعا کیجئے ـــــ میرے

لئے دعائے خیر کیجئے۔ نیاز مانئے۔ میری زندگی سنور جائے، بڑے پیر کی منت مانئے۔ کچھ کیجئے۔ جلدی۔ جلدی ـــــ یہ لیجئے"۔ اس نے پرس سے دو سو کے نوٹ نکال کر ان کے سامنے رکھے اور الٹے پاؤں واپس ہو گئی۔ بڑے میاں بھونچکے ہو کر اسے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

شام ٹھنگنا آدمی واپس آچکا تھا اور برآمدے میں کھڑا جیپ اسٹیشن ویگن میں مچھلی کے شکار کا سامان رکھوا رہا تھا۔ اس نے ایک بیرے کو حکم دیا۔ "میم صاحب کو بولو، جلدی کریں"۔

بیرے نے اوپر جا کر دروازے پر دستک دی۔ لڑکی نے اودے رنگ کا ٹراؤزر سوٹ پہن رکھا تھا اور آئینے کے سامنے کھڑی میک اپ کر رہی تھی۔ دروازہ کھول کر اس نے کہا "صاحب کو بولو ابھی آتے ہیں"۔ پھر وہ پچھلے زینے سے اتر کر کیمبرج والوں کے کیمپ کی طرف بھاگی۔

برنارڈ برگد تلے پتھر پر بیٹھا پائپ پی رہا تھا "گڈ ایوننگ مسز ایل!" اس نے چونک کر کہا۔

"رم ـــــ!" لڑکی نے مسکرا کر جواب دیا۔

وہ خاموش رہا۔ وہ ایک شادی شدہ عورت سے دوستی بڑھا کر کسی مصیبت میں نہیں پھنسنا چاہتا تھا۔

"میں مسز ایل نہیں ہوں"۔ لڑکی نے انتہائی مضطرب ہو کر کہا "مجھے اپنا دلی کا پتہ دیتے جاؤ۔ میں اس گورکھ دھندے سے نکلنا چاہتی ہوں۔ میں برطانیہ آنا چاہتی ہوں۔ کیا تم میری مدد کرو گے"؟

"بڑے تعجب کی بات ہے جو ہندوستانی مجھ سے ملتا ہے، یہی درخواست کرتا ہے کہ وہ برطانیہ آنا چاہتا ہے"۔ برنارڈ نے ترشی سے جواب دیا۔

"میں تم کو پوری بات بتاؤں گی۔ پوری بات۔ مجھے اپنا دلی کا پتہ دے دو"۔

"ابھی ہم لوگوں نے طے نہیں کیا ہے کہ وہاں کہاں ٹھیریں گے"۔

جیپ قریب آکر رکی۔ ناٹے آدمی نے دروازہ کھولا اور سرد آواز میں کہا "چلو ـــــ"

اس نے گھبرا کر برنارڈ پر نظر ڈالی اور جیپ میں بیٹھ گئی۔ پھاٹک میں پہنچ کر جیپ ریت میں دھنس گئی۔ بریگیڈیر فری مینٹل ٹہلتے ہوئے آرہے تھے۔ انھوں نے چند آدمیوں کو بلایا۔ سب نے مل کر گاڑی کو دھکا دیا۔ وہ پھاٹک سے نکل گئی۔ لڑکی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بریگیڈیر نے رومال سے چندیا اور چہرہ صاف کرکے 'خدا حافظ' کہنے کے لئے ہاتھ ہلایا۔ دور کیمبرج والوں کی خیمہ گاہ میں روشنیاں جل رہی تھیں۔

○

جنگل کے راستے میں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ ڈر کر ناٹے آدمی سے سٹ گئی "بڑی خوفناک جگہ ہے۔ واپس چلو ——"

"کل تمھارا وہ میر شکار بھائی آرہا ہے۔ کیا اسے اسی لئے بلایا ہے؟ دیکھتا ہوں کیسے جاتی ہو۔"

اس نے دل میں کہا۔ اس ساتھ بھی نہیں جاؤں گی۔ عین اس وقت مولوی صاحب وظیفہ پڑھ رہے ہوں گے۔ مسز برنارڈ کریگ —— میں بہت وفا شعار خدمت گزار ہندوستانی بیوی ثابت ہوں گی۔ ورنہ جرمنی کا ایر دس پلیس 'بڑی گدھیا ہے' —— کن چھدرے آدمی کی آواز۔ وہ بندوق سنبھالے مچان پر بیٹھا تھا۔ نیچے وہ چارے کی طرح بندھی ہوئی تھی۔ پھر بجنوری مولوی کا نورانی چہرہ۔ اس چہرے کا تصور کرکے اچانک وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا اور بشاش اور محفوظ محسوس کرنے لگی۔ اس نے کہا "وہ گیت تو سناؤ۔ دل جنگل ہی میں ——"

گویا کسی نے ریکارڈ پر سوئی رکھ دی —— آدمی نے فوراً الاپنا شروع کیا: "دل جنگل ہی میں بہلتا ہے۔ یہاں پریم کا ساغر چلتا ہے۔ پردیسی پریت کہاں جانیں۔ ہم ایسا گیت کہاں جانیں۔ کھل جائے جس سے دل کی کلی یہاں دل کی کلی تو کبھی نہ ——" آدمی نے گاڑی ساحل پہ روک دی۔ وہ کود کر ریت پر اتری۔ فشنگ کا سامان اتارنے میں آدمی کی مدد کی۔

رام گنگا پگھلی چاندی کے مانند چمک رہی تھی۔ آدمی نے ہپ فلاسک نکال کر شراب

کا ایک گھونٹ بھرا۔

"یہاں تو اور بھی زیادہ سردی ہے"۔ لڑکی نے لرز کر کہا۔

"دسمبر کی رات میں دریا کے کنارے کیا گرمی ہو گی ؟" آدمی نے جواب دیا "دوڑ لگاؤ۔ سردی بھاگ جائے گی"۔

وہ ریت پر دوڑنے لگی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے دلکی چلتا رہا۔ پھر ہانپنے لگا۔ اچانک لڑکی نے ٹھٹھک کر کہا "کس قدر خوبصورت جگہ ہے"۔ اس نے کافی کا فلاسک کندھے سے اتارا اور ریت پر بیٹھ گئی۔

سامنے دریا کے دوسرے کنارے پر شوالک کی ایک پہاڑی سنگی دیوار کی طرح ایستادہ تھی۔ دیوار پر ایک آبی غار کا عکس لرزاں تھا اور وہ جگہ جل پریوں کا محل معلوم ہو رہی تھی۔

آدمی بھدسے اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ اس نے ہپ فلاسک مونہہ کو لگایا اور ترنگ میں آ کر غرانے لگا —— "لبِ جو ہو، فرشِ آب ہو، شبِ ماہ ہو، بادۂ ناب ہو، میرے پاس بیٹھا ہو وہ صنم، لئے اپنے ہاتھ میں جامِ جم —— جامِ جم۔ جامِ جم —— اے لوفن اف بریڈ، اے جگ اف وائن —— لو یو"۔

"نہیں، میں کافی پیوں گی" —— پھر اس نے دل میں کہا۔ میرے لئے مولوی صاحب اس وقت وظیفہ کر رہے ہوں گے۔ میں شراب کیسے پی سکتی ہوں ؟

آدمی بڑبڑاتا رہا —— "میرے پاس بیٹھا ہے وہ پاجی صنم، حرامی، بدمعاش صنم"۔ وہ سارا فلاسک غٹ غٹ پی گیا۔ اب وہ ایسا چوہا معلوم ہو رہا تھا جسے سیسہ پلا دیا گیا ہو۔ وہ آنکھیں بند کر کے سر جھکا کے بیٹھ گیا۔

لڑکی بڑبڑائی —— "اتنے جاڑے میں بھلا کوئی مچھلی پکڑتا ہے۔ رات کے وقت ؟ واپس چلو، ورنہ میں نمونیہ سے مر جاؤں گی"۔

وہ انٹا غفیل رہا۔

"میں جا کر گاڑی میں بیٹھتی ہوں"۔

وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

"بن مانس!"

اس نے سر نہ اٹھایا۔

"بجّو!"

وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔

"جھینگر! ٹینی ماسٹر!"

وہ چپکا رہا۔

"بڈھا ٹڈا!"

معاً وہ اٹھ کھڑا ہوا اور لڑکی کو ایک لات رسید کی۔ وہ پھسل کر پانی میں جا گری۔

"بچاؤ!" وہ چلائی ــــ پانی کے ریلے نے اسے آگے دھکیل دیا۔ مقابل کے آبی غار کے اوپر پانی کے عکس میں تلاطم پیدا ہوا۔ ایک گھڑیال اپنی ماقبلِ تاریخ، ارضیاتی وقت کی نیند سے چونک کر کاہلی کے ساتھ چٹان پر سے سرکا اور پانی میں اتر کر ڈوبتی ہوئی لڑکی کی سمت بڑھا۔

ہاتھ پاؤں مارتی لڑکی پانی سے ابھری۔ اسے نظر آیا۔ سرد چاندنی میں چمکتا پانی اس کے چاروں طرف تھا اور ایک سیاہ گھڑیال منہ کھولے اس کی طرف آرہا تھا۔

گھڑیال نے لڑکی کی ٹانگیں اپنے جبڑوں میں دبوچ لیں۔ لڑکی نے ایک فلک شگاف چیخ بلند کی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ گھڑیال کے منہ کے اندر پہنچتے ہی وہ دہشت سے مر چکی تھی۔

گھڑیال اسے منہ میں لئے آبی کھوہ کی جانب بڑھا۔ پہاڑی کی سنگی دیوار کے نیچے چٹان پر پہنچ کر ذرا سستایا۔ اس وقت وہ لاکھوں برس قبل کے وقت میں موجود تھا۔ اور ہمالیہ کے یہ دریا اسی طرح برف سے نکل رہے تھے اور یہ پہاڑ اور جنگل اور چٹانیں اسی طرح موجود تھیں۔ گھڑیال نے لڑکی کو چبا چبا کر نگلنا شروع کیا۔ دریا کی سطح پر خون کے چند بھنور سے ابھرے، بالوں کے گچھے

گوشت اور کپڑوں کے ٹکڑے پانی پر تیرنے لگے۔ گھڑیال بڑی طمانیت سے اپنا ڈنر کھا رہا تھا۔

ناٹے آدمی نے ساحل پر سے دیکھا۔ اس کے جسم کے رونگٹے سر کے بال کھڑے ہو گئے۔ اس کی کاہل ریچھ جیسی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ ہڑبڑا کر جیپ کی طرف دوڑا، جو دور ساحل کے کنارے ایک قدیم درخت کے نزدیک کھڑی تھی۔ اس گھنے درخت کے تنے میں جسے دیمک چاٹ گئی تھی سانپ کے بل تھے۔ آدمی کی آہٹ پر پتے سرسرائے ایک اژدہا بل سے نکلا ایک ہرنی جاگ اٹھی۔ کپکپاتے ہوئے آدمی نے مڑ کر دیکھا۔ رام گنگا شانت تھی اور پگھلی چاندنی کی طرح بہہ رہی تھی۔ آدمی نے انجن اسٹارٹ کیا۔ اس کی گڑگڑاہٹ سناٹے میں بہت ہیبت ناک معلوم ہوئی۔ اندھا دھند جیپ دوڑاتا وہ جنگل کی سڑک پر واپس آیا۔ ہیڈ لائٹس کے سامنے اچانک ایک لکڑ بگا آگیا اور زور سے ہنسا۔

○

رات گذری، چاند ڈوبا، سورج رام گنگا پر طلوع ہوا۔ جنگل جاگا۔ بریک فاسٹ کے وقت بڈھو جنگل سے نکل کر کمپاؤنڈ میں آیا، ریسٹ ہاؤس کے برآمدے کے نیچے پہنچا اور لڑکی کے انتظار میں سر جھکا کر کھڑا ہو گیا، جو روز اسے ناشتہ کراتی تھی

آئینہ فروش شہر کوراں

میں تسبیح پڑھتا ہوں اس کی جو بادشاہ اور عالم ملکوت کا صاحب ہے۔ اس بادشاہ زندے کی جو نہیں سوتا اور نہیں مرتا ہے وہ بہت طاہر اور بہت پاک۔ اور فرشتوں اور ارواحوں کا پروردگار ہے۔

اور ثریٰ ایک سبز پتھر کا نام ہے اور نیچے ثریٰ کے دوزخ کو بنایا۔ اور اس میں ایک سردار کہ مالک اس کو کہتے ہیں۔

اور اسی وقت ایک زلزلہ زمین اور پہاڑوں پر آیا اور حضرت جبرئیلؑ نے کہا سات ہزار برس کے آگے سے آدم کے ایک پتھر ستر ہزار من کا کنارے پہ دوزخ کے پڑا تھا۔ وہ پتھر پندرہ ہزار برس سے نیچے کی طرف لڑھکتا چلا جاتا تھا ابھی قعر حطمہ میں پہنچا تھا۔ اسی کی آواز تھی اور وہ جگہ منافقوں کی ہے۔

اور جب آدم بہشت سے نکلے صرف ایک ٹکڑا لکڑی کا مسواک کے واسطے لیا۔ جس طرح لوگ کہیں "اوورنائٹ" جانے کے لئے ٹوتھ برش اپنے بیگ میں ڈال لیتے ہیں۔ اور زمین پہ آکر جب آدم نے ہل جوتا اور بیل کج چلنے لگا تو حضرت نے اس پر لکڑی ماری اور بیل نے کہا "اے آدم تو مجھے کیوں مارتا ہے۔ اگر تجھ میں عقل ہوتی اس دنیا میں نہ پھنستا"۔

الغیاث۔ الغیاث۔ مہلائیل بن شیث بن آدمؑ کے انتقال کے بعد لوگ ان کی زیارت کے لئے آتے رہے فرزندانِ مہلائیل نے ابلیس کے کہنے پر اپنے والد کا بت بنا کر برقعہ اس پر ڈالا اور لوگ اس کی زیارت کرنے لگے اور عالم میں بت پرستی پھیلی پھر اس قوم میں ادریسؑ پیدا ہوئے پڑھانے کی کثرت سے لقب ان کا ادریس ہوا۔ علم نجوم ان کے معجزات میں سے ہے۔ اور آپ درزی کا کام کرتے تھے۔ قوم ان کی پھر بت پرستی پر راغب ہوئی۔ بعد چار سو سال کے نوحؑ آئے۔ کہ اپنی قوم کی حالت پر نوحہ بہت کرتے تھے اور جب بڑھیا کے تنور سے گرم پانی نکلا اور طوفان۔

اور قوم عادؔ اور ہودؔ پیغمبر۔ اور ساتویں زمین پر ایک ہوا ہے نام اس کا ریح العقیم ہے۔ ستّر ہزار زنجیروں سے اس کو باندھ رکھا گیا۔ اور ستّر ہزار فرشتے اس پر محافظ ہیں۔ جب روزِ قیامت وہ ہوا چھوڑی جاوے گی پہاڑوں کو مانند ریزہ ابریشم کے اڑا دیوے گی اسی ہوا نے ظالم قوم عادؔ کو برباد کیا۔

بعدہٗ صالحؔ پیغمبر کو قوم ثمود پر ـــــ بعد اس کے فرشتوں نے شہرستان لوط کا قصد کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟ انھوں نے کہا ہمارے ساتھ مت آئیو۔ ہم اس شہر کے لوگوں کو ہلاک کرنے جاتے ہیں۔ عذاب کو دیکھنے کی تم میں طاقت نہ ہوگی۔

اور ان شہروں کی شاہراہوں پر مرد و زن کے گروہ علیحدہ علیحدہ پرچم بلند کئے نعرہ زن چلے جاتے تھے ان تختیوں اور پرچموں پر ایک اجنبی زبان میں GAY LIB مرقوم تھا اور قوم موسیٰؑ اور قوم عیسیٰؑ کے فقیہہ اور مدرس اپنے کتب خانوں اور چھاپے خانوں میں اس اصطلاح کی تاویل و تفسیر و دفاع میں مشغول تھے فرشتے اس منظر کی تاب نہ لا کر الٹے پاؤں واپس بھاگے۔

الامان۔ الامان۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو مقام کریم فرمایا تھا اور تم نے اسے مقام عذاب میں بدل دیا۔ اور صبح سے شام تک، سب دیوار کو آ کر چاٹتے ہیں مگر اس کو توڑ نہیں پاتے۔ سکندر ذوالقرنین قاف سے قاف تک گیا پر کوئی معاملہ درست نہ کر سکا۔ وہ آدمی

دو گروہ کے تھے۔ بے عدد۔ بے شمار ان کی قوم گویا جوج ماجوج ـــــ اولاد یاجوج ایک پہاڑ پر رہتی ہے اور اپنی مردم شماری نہیں کرواتی اور عدد ان کا سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ اور سب زرد زرد اور پستہ قد۔ اولاد ماجوج دوسرے پہاڑ پر۔ سفید فام اور سرو قامت و قوی ہیکل۔ دونوں اقوام کوئی دین و مذہب نہیں رکھتے اور خدا کو نہیں جانتے اور اب کچھ عرصے سے ایک دوسرے سے بھی برگشتہ ہیں۔ اور تب کھڑی ہوئی درمیان یاجوج ماجوج کے دیوار موٹی۔ اور بہت سوں نے ان کو بہت سوں سے بہتر پایا۔

خبر میں آیا ہے کہ لقمان حکیم بن باعور نے وصیت کی اپنے بیٹے کو کہ قایم کر نماز اور لوگوں کی طرف غرور سے نہ دیکھ اور نرم کر اپنی آواز کہ بہ تحقیق ناپسندیدہ آواز گدھے کی ہے۔

اور سلیمانؑ بن داؤدؑ کے بیٹے بطشا بن حنّا کے بطن سے، ایک دن مع اپنے وزیر آصف (جس کے نام پر بعد میں شاہان عالم اسلام نے اپنے وزیروں کو آصف الدولہ اور آصف جاہ پکارا اور نام جنرل موشے دیان کے فرزند کا بھی یہی ہے) تخت پر بیٹھے ہوا میں جاتے تھے وزیر اعظم آصف دیو بھی ساتھ تھا اور سب دیو پری جنات گرد بہ گرد تخت کے مودب کھڑے تھے اور پرندوں کے جھنڈ ان کے سر پر اپنے پروں سے سایہ ڈالے تھے اور ہوا نے تخت کو اوس زمین پر لے جا کر رکھا جہاں چیونٹیوں کی بستی تھی۔ کہا ایک چیونٹی نے اے چیونٹیو.... گھس جاؤ اپنے گھروں میں نہ پیس ڈالے تم کو سلیمانؑ اور اوس کا لشکر۔ اور اون کو خبر نہ ہو۔ پس مسکرائے سلیمان علیہ اسلام چیونٹی کی بات سے اور شاہ مور کو پکڑ کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور پوچھا اے شاہ مور تم نے اپنے لشکر کو کیوں کہا کہ سلیمان آتا ہے اپنے غاروں میں گھس جاؤ ـــــ پھر حضرت نے پوچھا سلطنت تمہاری بہتر ہے یا میری؟ چیونٹی نے کہا۔ میری بادشاہی بہتر ہے یا تمہاری ہے۔ کیونکہ ہوا اٹھاتی ہے تمہارے تخت اور بساط کو اور تخت اٹھاتا ہے تم کو۔ اوس پر تم بیٹھتے ہو۔ یہ اتنا تکلف ہے تمہاری بادشاہی میں سلیمان نے ہنس کر پوچھا تم کس طرح یہ جانتے ہو۔ شاہ مور نے جواب دیا اے سلیمان اللہ نے صرف عقل تم کو نہیں دی۔ ہم ناتوانوں کو بھی کچھ عنایت کی ہے۔

اور یعقوبؑ نبی کہ راتوں رات اپنے بھائی عیص کے ڈر سے شام کی طرف نکل گئے تھے اس لئے نام ان کا اسرائیل ہوا اور یعقوب بہ سبب عقب ہونے عیص کے یہ حال سب توریت میں بھی مرقوم ہے۔

اور زکریا پیغمبر کہ خدا کا ہر وقت ذکر کرتے تھے اور بیٹے ان کے یحییٰ جن کو اہل فرنگ JOHN بولتے ہیں پہاڑوں پر روتے چلاتے پھرتے تھے۔ خدا کی محبت اور دوزخ کے خوف سے۔ اور بہت وحشت میں پڑے تھے عمر اس وقت ان کی سات برس کی تھی مسجد میں جا کے گوشہ اختیار کیا اور قوم بنی اسرائیل نے فساد برپا کیا اور بے شرع چلنے لگے۔ اور جرجیس نبی کہ مشرک۔ ان کو 'جارج' (GEORGE) پکارتے ہیں اور حنّہ کہ فرنگستان پہنچ کر یہ نام ANNE ہوا اور حنّہ کی بیٹی مریم عذرا۔

خبر میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کو لے کر بیت المقدس سے شام جاتے تھے راہ میں بی بی مریم بیمار پڑیں چونکہ وے سوائے بیخ گیاہ کے اور کچھ استعمال نہ فرماتی تھیں عیسیٰ سے بولیں اے بیٹے مجھ کو وہی لا دے۔ وہ اپنی ماں کو اس جگہ چھوڑ کر اس جڑ کو لینے گئے۔ بی بی مریم نے اس میدان میں وفات پائی۔ اور خدا کے حکم سے بہشت کی حوروں نے آن کر ان کو غسل دیا اور بہشت کے کپڑے سے کفنایا اور اسی جگہ دفن کر کے چلی گئیں۔ اور بعد اس کے عیسیٰ نے آن کر اپنی والدہ کو دو دفعہ پکارا۔ کہیں سے جواب نہ ملا۔ تیسری پکار میں جواب دیا۔ لَبَّیْكَ اے بیٹا کیوں بلاتے ہو مجھے حضرت عیسیٰ نے کہا اے امّی جان۔ تین دفعہ پکارا آپ کہاں تھیں؟ جواب آیا۔ بیٹے۔ پہلی پکار میں میں فردوس اعلیٰ میں تھی دوسری پکار میں سدرۃ المنتہیٰ میں۔ اور تیسری پکار میں آسمان اوّل سے آ کے میں نے جواب دیا۔

اور قصہ دقیانوس شاہ روم اور اصحاب کہف کا۔ ایک جنگ میں اپنا دشمن بادشاہ قتل کر کے اس کے لڑکوں کو قید کیا۔ اور ان سے اپنا ہاتھ رومال صاف کرواتا تھا۔ اور خود کو سجدہ کرواتا تھا ان پانچوں شہزادوں نے آپس میں صلاح و مشورت کی کہ ہم پر واجب ہے کہ اس کی خدمت

سے باز رہیں وہ جب وہ ملعون چوگان کھیلنے جاوے گا البتہ ہم کو بھی لے جائے گا۔ میں چوگان میدان سے باہر پھینکوں گا تم سب ہمارے پیچھے بہانہ چوگان میدان سے نکل چلیو۔ بس اس طرح وے اس میدان سے نکل بھاگے۔ صبح کو گھوڑوں کو چھوڑ کر ایک۔ شہر کے کنارے پہنچے وہاں چند گڈریئے ملے۔ دے بولے۔ اے عزیزو تم کہاں جاتے ہو۔ انھوں نے کہا خالق ارض و سما کی طلب کو جاتے ہیں گڈریوں نے بھی صحبت شاہ زادوں کی اختیار کی۔ اور گڈریوں کا کتا بھی ہمراہ ہو لیا شہزادے بولے اس کتے کو ہنکار دو تو بہتر ہے وگرنہ یہ بھونکے گا اور لوگ آکر ہمیں پکڑ لیں گے۔ تب بکریوں کے گلہ بانوں نے کتے کو مارا پیٹا وہ لہولہان ہو گیا مگر اس نے ساتھ نہ چھوڑا۔ اللہ نے اس کو زبان دی۔ اس نے کہا اے یارو مجھے مت مارو۔ تم جس کے بندے ہو میں بھی اس کا تابعدار ہوں۔ پس وہ کتے کو باری باری اپنے کاندھے پر اٹھا کر لے چلے۔ تمام رات چلا کئے۔ جب روز روشن ہوا سب جاکر ایک پہاڑ کے غار میں داخل ہو گئے اور نام ان کے یہ ہیں مکسلمیان۔ امليخا۔ مرکوش۔ نوازنش۔ سالینوس۔ اریطاس۔ کفسطوطس۔ کھنسطوطس۔ کشفوطط۔ یارطوس اور کشفوطط کا نام کشف طیط بھی آیا ہے اور کتے کا نام قطمیر تھا۔ قاموس میں یہی لکھا ہے۔

اور نینوا کے پیغمبر یونس کہ نسل ہوڈ سے تھے وہاں قوم ثمود کی تھی۔ سب نافرمان تھے اور جب اللہ تعالیٰ نے یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ میں گرفتار کیا وے پکارے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ پس پکارا بیچ اندھیروں کے کہ کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے۔ تو بے عیب ہے۔ بیشک میں تھا ظالموں میں۔

○

اور میں کشفطیط —— جب میں جاگا میں نے دیکھا کہ میں ایک مہیب عظیم الجثہ فولادی مچھلی کے پیٹ میں ہوں۔ اور وہ آسمانوں پر اڑی چلی جاتی ہے اس کے پیٹ میں میں تنہا نہیں ہوں اقوام عالم کے مرد و زن اس میں موجود مصروف اکل و شرب ہیں اور کوہ قاف کی پریاں تمام مردوں کو بلوریں جام مے اور فواکہات پیش کرنے میں مشغول ہیں۔ اور سامنے

مچھلی کے جبڑے کے نزدیک ایک پردہ سیمیں پر متحرک تصاویر دکھلائی دیں۔ اور نام اس تماشے کا DEEP THROAT تھا۔

میں نے آنکھیں مل کر اپنے برابر بیٹھے شخص سے پوچھا اے برادر کیا تم میرے ساتھی سلطبوطس ہو؟ اور وہ ہمارا کپتان قطمیر کہاں ہے؟

وہ بولا۔ نہیں میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھے پھر اس نے اپنا نام بتایا اور اپنے گہرے زخم دکھلائے۔ اور خاموش ہو گیا۔ اور خون کے آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔

کیا تم بھی دقیانوس کے ظلم کا شکار ہو۔؟ میں نے ہمدردی سے دریافت کیا۔ وہ بولا۔ میں دقیانوسی تصورات و تعصبات و نظریات کے جور و ستم کا شکار ہوں۔

اس کی یہ تقریر میں سمجھ نہ سکا۔ وہ بولتا رہا۔ میں ایک شہر سے کہ جس کا نام قدیم لکھشمن ٹیلہ ہے، اپنی جان بچا کر بھاگ رہا ہوں۔ میری قوم پر خدا نے عذاب الیم نازل کیا ہے کہ وہ قوم مجنون و مخبوط الحواس ہو چکی ہے اور لکھشمن ٹیلہ کی گلیوں میں ایک دوسرے کا خون بہا کر ایک دوسرے کو نیست و نابود کرنا چاہتی ہے اور دنیا کو اپنا عبرت ناک تماشا دکھا رہی ہے اور قسم ہے نوحؑ اور ہودؑ اور صالحؑ اور یونسؑ کے خدا کی کہ میری قوم اپنے آپ کو بڑے ہی شدید عذاب میں مبتلا کر چکی ہے۔ میرا گھر بار مال اسباب تباہ ہوا میرے ہم مذہبوں کے ہاتھوں جورو بچے ہلاک ہوئے میں تن واحد بھاگ کر ملک روم جاتا ہوں کہ وہاں محنت و مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال سکوں اور سر پر خاک ڈال کر گریہ وزاری کروں۔

میرے بائیں جانب ایک اور نحیف و نزار لاغر بندۂ خدا بیٹھا اخبار پڑھتا تھا۔ اس سے پوچھا اے عزیز کیا تم میرے بھائی اریطاس ہو؟ بولا۔ نہیں میں پورب کے اس ملک سے آتا ہوں جہاں خدا نے اپنا قہر نازل کیا تھا وہاں بھی میرے اہلِ قوم نے ایک دوسرے کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اب میں محنت مزدوری کرنے ملک المانیہ جاتا ہوں۔

تیسرے نے کہا۔ میں قوم گوسالہ پرست کا ایک فرد ہوں میرے ملک میں آج کل میرے

ہم وطن اور ہم مذہب اور ہم قوم ایک دوسرے کھائے جارہے ہیں۔ کہیں چین و امن نہیں۔ میں بھی ملک فرنگ بھاگ رہا ہوں۔

تب مجھ کشفطیط کو یاد آیا قصہ عامیل مقتول کا۔ کہ بعد قتل میل کے جب قبیلے کے لوگ تہمت ایک دوسرے پر دینے لگے کہ اس نے مارا ہوگا اس نے مارا ہوگا موسیٰ کے پاس آکر انھوں نے کہا یارسول اللہ آپ دعا فرمایئے کہ اللہ قاتل کی خبر دے۔ موسیٰؑ نے دعا کی۔ جبرئیل نے موسیٰؑ سے کہا حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ غماز کو ہم دشمن جانتے ہیں۔ غمازی کیوں کر کریں ان کو کہہ دے کہ ایک گائے کی زبان لے کر مقتول پر ماردیں تب وہ جی اٹھے گا۔ اور خود بول دے گا۔ جس نے مارا حق تعالیٰ نے ان کو فرمایا گائے کی بابت کیونکہ وہ قوم سنہرے بچھڑے کو پوجتی تھی۔

موسیٰؑ نے اپنی قوم کو اللہ کا حکم سنایا وے بولے "پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو کہ بیان کرے وہ گائے کیسی ہے"۔ موسیٰ نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ گائے ہے نہ بوڑھی۔ نہ بچہ نہ جوان بیچ میں ان کے ہے وہ ایک گائے ہے خوب زرد رنگ اس کا۔ خوش آتی ہے دیکھنے والوں کو۔ بدن سے پوری تندرست ہے۔ داغ اس میں کچھ نہیں ـــــ قصہ گائے یوں ہے کہ ایک شخص بنی اسرائیل میں تھا۔ مرد صالح نیک بخت اور ایک گائے اس کی تھی۔ اس نے گائے کو جنگل میں خدا پر سونپا اور وہ گائے جب بڑی ہوئی جنگل میں کوئی اسے پکڑ نہ سکتا تھا۔

معاملہ اس گائے کا بہت طویل و پیچیدہ تھا میں اسے ذہن سے ہٹا کر سامنے پردۂ سیمیں کی طرف دیکھنے لگا جہاں مناظر عجیب و غریب دکھلائی دیئے کہ جن کو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے تھے اور میں نے سوچا کہ اب عذاب الٰہی آیا ہی چاہتا ہے۔ پھر میں نے ڈر کر چاروں طرف دیکھا سب مرد و زن مشغول اکل و شرب کمال اطمینان و فرط انبساط سے وہ شیطانی تماشا دیکھنے میں محو تھے اور میرے پیچھے اور آگے ایک گروہ کثیر مسکین صورت بندگان خدا کا بیٹھا تھا میں نے ان سے سوال کیا بھائیو تم کہاں کا قصد رکھتے ہو۔ وے بولے ہم جاتے ہیں ان صحراؤں کی طرف برائے کسب زر کثیر جہاں قدموں تلے سیاہ سیّال طلائی بیش بہا کے چشمے جاری ہیں۔ اور شکر ہے اس رب ذوالجلال

کا جس نے ہمارے دن بھی پھیرے۔

تب مجھ کشفطیط کو جو اصحاب کہف میں سے جاگا ہوں یاد آیا کہ موسیٰ کلیم اللہ کو خدا کی طرف سے حکم ہوا تھا کہ فرعون کو راہِ راست پر لانے کے لئے اس سے نرم نرم بات کیجیو۔

اور میں کشفطیط۔ میں نے بھی اپنے وقت کے فرعونوں اور شدادوں اور قارونوں اور ہامانوں سے نرم نرم بات کی مگر وہ میرے مزاج کی نرمی کو کمزوری سمجھا کیئے اور مجھے مزید ایذائیں دیں۔ اور میرے دن نہ پھرے۔

اور قصہ بادشاہ قارون کا جو موسیٰؑ کا جدی چچیرا بھائی تھا بیٹا صافن کا، اور صافن بیٹا فاہش کا اور فاہش یعقوب علیہ السلام کا۔

عین اس وقت جبکہ میں ان ہیبت ناک امور پر غور کر رہا تھا معاً پردہ سیمیں پر سے تماشاگر فاجرہ عورت کی تصویر معدوم ہوئی اور اس کے عقب سے سات عدد نقاب پوش نمودار ہوئے ہاتھوں میں ان کے آتشیں گولے تھے اور دیگر اسلحہ جات۔

اور انھوں نے پکارا۔ ہم لوگ تم لوگوں کو ہلاک کر ڈالیں گے بیچ آسمان و زمین کے ورنہ لے چلو ہم کو اس شہر کی سمت جہاں ہم جانا چاہتے ہیں۔ اور وہ اطالوی قارون جو اس وقت اس جگہ موجود ہے کرے حوالے کنجیاں اپنے خزانے کی وگرنہ مار ڈالیں گے اس کو جان سے اور پکڑلیں گے تم سب کو بطور یرغمال اور اگر نہ مانا تم نے حکم ہمارا تم سب کو بھی ہلاک کر دیں گے۔ بلا تامل۔ کہ تم نے قایم کیا ہے فساد بیچ زمین کے۔

اور جواب دیا ایک شخص نے باآواز بلند کہ البتہ تم ہو ذریات ابلیس لعین کے کہ ہلاک کرنا چاہتے ہو ان بے گناہوں کو۔ جنھوں نے نہیں بگاڑا کچھ تمھارا۔

عین اس لمحے مچھلی کے پیٹ میں کڑک دار گڑگڑاہٹ ہوئی۔ اس نے فضائے تاریک میں غوطہ مارا اترنے لگی بسرعت طرف کرۂ زمین کے اور عزرائیل علیہ السلام کی صورت سب کے سامنے نمودار ہوئی اور ہم سب اس مہیب فولادی مچھلی کے پیٹ میں محبوس قعر حلمہ کی

جانب اترتے جا رہے ہیں اور وہ ریح العقیم جسے ستر ہزار زنجیروں سے باندھ کر رکھا گیا تھا آزاد ہو چکی ہے۔

لَا اِلٰہ اِلَّا اَنتَ سُبحَانَکَ اِنّی کُنتُ مِنَ الظَّالِمِینَ
لَا الٰہَ اَلَّا اَنتَ سُبحَانَکَ اِنّی کُنتُ مِنَ الظَّالِمِینَ
لَا اِلٰہ اِلَّا اَنتَ سُبحَانَکَ اِنّی مِنَ الظَّالِمِینَ
بیشک میں تھا گنہگاروں میں
بیشک میں تھا گنہگاروں میں
بیشک میں تھا ظالموں میں

○

اور اس راقم الحروف آئینہ فروش شہر کوراں نے یہ حکایت بیان کی اور پہاڑ کی کھوہ سے برآمد ہو کر اصحاب کہف کا کتا قطمیر آسمان کی طرف منہ اٹھائے روئے چلا جاتا ہے۔

پالی ہل کی ایک رات

(ایک تمثیل جس کے سارے کردار قطعی فرضی ھیں)

کردار ______

۱۔ ہومائے اردشیر جنگ والا

۲۔ رودابہ جنگ والا

۳۔ آنٹ فیروزہ

۴۔ آغائے داراب کاظم زادہ

۵۔ خانم گلچہر اسفندیاری

مقام ______ پالی ہل، بمبئی

زمانہ ــ جولائی ۱۹۷۶ء وقت آٹھ بجے شب

○

وسیع اسٹیج ــــ عقبی دیوار کے وسط میں کھلا دریچہ۔ اس کے دونوں طرف گرا کی

سیاہ تپائیوں پر منگ گلدان، بائیں دیوار پر دو روغنی اکیڈمی پورٹریٹ، ان کے عین نیچے کوئن این صوفہ۔ دو کرسیاں۔ ایک کارڈ ٹیبل۔ کونے میں کاٹیج پیانو۔ اس کے اوپر روپہلی فریم میں ایک متبسم خوبرو نوجوان کا بہت بڑا فوٹوگراف۔ بلوری مرتبان میں ایک جنک (چینی جہاز) کا ماڈل۔ ایک یونانی گلدان۔ دیواروں پر ولایتی وال پیپر جو جگہ جگہ سے اکھڑ چکا ہے۔ اسٹیج کے دائیں حصے میں گول ڈائننگ ٹیبل۔ اور دو کرسیاں۔ وکٹورین سائڈبورڈ۔ اس پر ایک شمعدان۔ WILLOW PATTERN کی نیلی برطانوی پلیٹیں — اور ملکہ الزبتھ، پرنس فلپ، شہنشاہ ایران اور شہبانو فرح پہلوی کی تصاویر۔ دو ٹوبی مگ (TOBY MUGS) میز پر تین افراد کے لئے پلیٹیں، چھری کانٹے اور گلاس مع نیپکن۔ فٹ لائٹس کے قریب اسٹیج کے بائیں کنارے چوبی منقش چینی صندوق پر ایک سیاہ ایرانی بلی نخوت سے متمکن ہے۔ کمرے کا سارا ساز و سامان خستہ اور بوسیدہ۔ دائیں اور بائیں پہلو کی دیواروں میں دروازے۔ دریچے کے اوپر کُکو کلاک جو آٹھ بجا رہا ہے۔ سیاہ ریشمی کیمونو پہنے، جس پر رنگ برنگے دھاگے سے ایک مہیب ڈریگن کڑھا ہے۔ ناظرین کی طرف سے پشت کئے ہومائے جنک والا دریچے میں کھڑی ہے۔ روڈابہ جنک والا انگریزی ڈریس میں ملبوس پیانو کے سامنے بیٹھی LET'S ALL GO DOWN THE STRAND بجا رہی ہے۔ پھر وہ اچانک ON RICHMOND HILL THERE LIVES A LASS شروع کر دیتی ہے۔

ہومائے: اوہ، شٹ اپ۔ رُوڈی — میں دعا میں مصروف ہوں، ڈسٹرب مت کرو۔

(روڈابہ TIS THE LAST ROSE OF SUMMER LEFT BLOOMING ALONE بجانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔)

ہومائے: رُوڈی — آج پورنماشی کی رات ہے اور میں آج ہی وضو کرنے میں گڑبڑا گئی — بتاؤ — منھ دھونے سے پہلے دا شم دو ہو پڑھتے ہیں نا — پھر کُلی کرنا۔

پھر تین دفعہ پنجے دھونا ــــ پھر تین دفعہ کہنیوں تک ہاتھ ــــ ہاتھ کی طرف سے کہنیوں تک نا ــــ؟ پھر پاؤں ــــ ذراسی بھول چوک میں گناہ ہوگا۔

(رودابہ سفحہ الٹھا کر "لاسٹ روز آف سمر" گانا شروع کر دیتی ہے۔ دونوں عورتوں کے چہرے اب تک چھپے ہوئے ہیں۔ اب ہومائے پہلی بار حاضرین کی طرف رخ کرتی ہے۔ ایک معمر پریشان صورت عورت۔)

ہومائے : رُوڈی ــــ بتاؤ ــــ اسکول کی چھوکریوں کی طرح شورست کرو ــــ کل میں نے پنج گاہ کی نمازیں قضا کر دیں۔ قضا پڑھنا فرض ہے نا ــــ؟ کل دستور جمشید جی سے پوچھوں گی۔ آج پورنماشی ہے۔ میں ماہ نیایش کی تلاوت کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن بادلوں میں چاند نظر ہی نہیں آرہا ــــ بڑے زور کی بارش آنے والی ہے۔ ہوشنگ کیسے پہنچے گا۔

(روداہ سنی ان سنی کر کے پیانو بجاتی رہتی ہے۔ باہر بارش شروع ہو جاتی ہے۔ بجلی چمکتی ہے۔ اوپر چھت پر سے کھٹ کھٹ کی آواز آنے لگتی ہے۔ باہر بلیاں رو رہی ہیں۔ چینی صندوق پر بیٹھی ایرانی بلی کاہلی سے اتر کر صوفے کے نیچے چلی جاتی ہے۔ بادل گرجتے ہیں۔ ہومائے اونچی آواز میں خدا کے ایک سو ناموں کا وِرد شروع کر دیتی ہے۔)

ہومائے : یزد ــــ ہروسپ توان[1] ــــ ہروسپ آگاہ[2] ــــ ہروسپ خدا[3] ــــ اودمی انجام۔ افزا۔ پرورا۔ خروشیدتم۔ ہریمد۔ ہرنیک فرہ۔ فرمان کام۔ افرموش۔ اترس۔ افرازدم۔ آدر بادگرد۔

روداہ : (زور سے گاتی ہے) WEEP NO MORE MY LADY

O WEEP NO MORE TODAY

WE SHALL SING ONE SONG OF THE OLD KENTUCKY HOME

---

[1] قادر، [2] علیم، [3] مالک کائنات

OF THE OLD KENTUCKY HOME

FAR AWAY

ہومائے : (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) آذر نمگر۔ بادنمگر۔ بادگل گر۔ اگمان۔ ازمان۔ فیروزگر۔ نیا فرید۔ دادار۔ خرہ مند۔ داور۔

(باہر دریچے کے نیچے قدموں کی چاپ)

رودابہ : (رک کر) کوئی آیا۔

(دائیں دروازے کی کال بیل بجتی ہے۔)

(کواڑ ذرا سا کھول کر باہر جھانکتی ہے پھر رودابہ سے کہتی ہے) ینگ فارنرز ــــ!

رودابہ : ہپی ــــ؟

ہومائے : نہیں ــــ ہپی نہیں۔ نہایت شاندار انگریز ــــ (دروازہ کھولتی ہے۔ ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی پانی میں شرابور ذرا جھجکتے ہوئے اندر آتے ہیں۔)

لڑکا : (اوکسفرڈ لہجے میں) تھنک یو میم ــــ موسٹ کائنڈ آف یو۔ (برساتی اتارنے میں لڑکی کی مدد کرتا ہے پھر اپنی برساتی اتارتا ہے ــــ لڑکی سنہرے بال، خوبصورت ــــ بیش قیمت امریکن فراک۔ دونوں بہت متموّل معلوم ہوتے ہیں۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک پارسل ہے۔)

لڑکی : (امریکن لہجے میں) معاف کیجئے گا ہم نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ ہم مسز کلثوم زری والا کا بنگلہ تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ کیا آپ بتا سکیں گی؟ (ایک پرچہ دکھاتی ہے۔ ہومائے جواب نہیں دیتی۔ وہ حیرت اور رشک کے ساتھ اس نوعمر حسین اور صحت مند جوڑے کو تکے جا رہی ہے۔ گویا دونوں کسی پرانے خوشگوار خواب میں سے اچانک نمودار ہو گئے ہوں۔ رودابہ فوراً اسٹول سے اٹھ کر آتی ہے۔ عینک لگا کر لڑکی کے پرچے پر لکھا پتہ پڑھتی ہے۔)

لڑکی : کسی نے کہا شاید آپ کے یہاں سے معلوم ہو جائے۔ سڑک تو یہی ہے۔

(رودابہ نفی میں سر ہلاتی ہے)

لڑکا : بجلیاں اور کتے برس رہے ہیں۔ کیا ہم آپ کے ہاں چند منٹ ٹھہر سکتے ہیں؟ ٹیکسی ڈرائیور اس طوفان میں آگے جانے سے انکار کر رہا ہے۔

ہومائے : (چونک کر) اوہ ـــ! یقیناً ـــ اندر آجاؤ ـــ

(لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے پر نظر ڈال کر کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔)

لڑکی : GEE ـــ تھینکس ـــ!!

ہومائے : امریکن ـــ؟

لڑکی : نو میم ـــ ایرانین ـــ

لڑکا : (جھک کر) خانم گلچہر اسفندیاری ـــ داراب کاظم زادے۔

ہومائے :
رودابہ : } ہاؤ ڈو یو ڈو ـــ

(وہ دونوں صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ روشنی میں گلچہر کے لاکٹ پر ہیروں سے بنا "یا علی" جگمگانے لگتا ہے۔ ہومائے کرسی پر ٹک کر بلی کو گود میں اٹھا لیتی ہے۔ رودابہ سرعت اور احساس مصروفیت کے ساتھ بائیں دروازے سے باہر چلی جاتی ہے۔)

ہومائے : تم لوگ کہاں سے آرہے ہو؟

داراب کاظم زادہ : آج صبح لندن سے۔ میں کیمبرج میں پڑھتا ہوں ـــ یہ میری کزن اور منگیتر ـــ گلچہر ـــ سیرہ لارنس میں زیر تعلیم ہے۔ امریکہ میں۔

گلچہر : کالج میں میری ایک انڈین کلاس فیلو ہے ـــ خدیجہ زری والا ـــ اس نے ایک پیکٹ اور خط دیا تھا کہ بمبئی میں اس کی والدہ کو دے دوں ـــ

داراب کاظم زادہ : (کلپیڈ برطانوی لہجے میں) مس زری والا نے اپنے مکان کا فون نمبر بھی دیا تھا۔ ہم لوگ ایئر پورٹ پہ ہوٹل سینٹور میں ٹھیرے ہیں۔ وہاں سے فون کیا مگر بارش کی وجہ سے لائن خراب تھی۔ شام کو ٹیکسی لے کر مکان ڈھونڈنے نکلے۔ (رودابہ چائے کی ٹرے لئے کمرے میں واپس آتی ہے) ہم دونوں —— کزن گلچہر اور میں —— چھٹیوں میں ہندوستان کی سیاحت کے لئے آئے ہیں۔ وطن ہوتے ہوئے اپنے والدین سے مل کر مغرب واپس جائیں گے۔

ہومائے : وطن ——؟

داراب : طہران —— ایران ——

ہومائے : اوہ —— اوف کورس ——!

(داراب نظریں اٹھا کر سائیڈ بورڈ کو دیکھتا ہے جس پر شاہ اور شہبانوئے ایران کی تصویر رکھی ہے۔ وہ ذرا تعجب اور مسرت سے مسکراتا ہے۔ ہومائے چپ بیٹھی ہے۔ ایسا لگتا ہے شاید مدتوں بعد گھر پہ مہمان آئے ہیں اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ان سے کیا بات کرے۔)

رودابہ : (چائے کی ٹرے کارڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے) ہومائے! تم نے ہم لوگوں کا تعارف کرا دیا —— ؟ —— ینگ مین ——! میں رودابہ اردشیر جنگ والا ہوں۔ یہ میری بڑی بہن مس ہومائے جنگ والا۔ (داراب اور گلچہر مسکرا کر سر خم کرتے ہیں) اور وہ ہمارے والدین —— سر اردشیر کیکاؤس جنگ والا —— لیڈی تہمینہ جنگ والا۔

داراب : (زیر لب) ہاؤ فیسی نیٹنگ ——!

رودابہ : (پیانو پر رکھی خوش شکل نوجوان کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے) یہ ہوشنگ سروش یار مرزا —— ہومائے کا منگیتر ——

(ہومائے ذرا شرما کر سر جھکا لیتی ہے۔ لفظ "منگیتر" پر داراب کاظم زادہ

اور گلچہر اسفندیاری قدرے متحیر نظر آتے ہیں۔ چھت پر کھٹ کھٹ کی آواز۔ دونوں نو وارد گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ رودابہ چائے بناتی ہے۔)

داراب : تھینکس۔ ہاؤ ویری نائس آف یو ——

رودابہ : یہ لوکیک —— آج ہی ہومائے نے بیک کیا ہے اور کاٹج چیزاور اسکونز میں نے بنائے ہیں۔

داراب کاظم زادہ : گڈ لارڈ —— ! کاٹج چیز اور اسکونز —! معلوم ہوتا ہے جیسے میں ابھی انگلستان ہی میں ہوں !!

ہومائے : (ہونٹ پچکا کر) ہاہا —— اس مکان سے باہر نکلو گے تو پتہ چلے گا کہ یہاں کے اسٹینڈرڈ کتنے گر گئے ہیں۔ میں امید کرتی ہوں تم کو مسز پوچ کھانا والا کا بنگلہ مل جائے گا —— اگر اب تک گرا نہ ہو ——

گلچہر اسفندیاری : مسز کلثوم زری والا۔

رودابہ : کارٹر روڈ ——؟

گلچہر : جی نہیں —— پالی مالا روڈ —— ٹیکسی والا ساری پالی ہل پر لئے پھرا۔ ہوٹل میں کسی نے ہمیں بتایا تھا کہ یہ جگہ دلیپ کمار کے بنگلے کے نزدیک ہوگی —— ایک راہگیر بولا راجیش کھنہ کے بنگلے کے آگے دائیں ہاتھ کو جو سڑک جاتی ہے۔ میں نے کیبی سے کہا یہ دونوں بنگلے پالی ہل کے لینڈ مارک معلوم ہوتے ہیں تو وہ فوراً بولا ”میڈم! لینڈ مارک میں تو مرحومہ مینا کماری رہتی تھیں !“ (ہنستی ہے) اور راجیش کھنہ کا بنگلہ ——

ہومائے : (ذرا ناگواری سے) راجیش کھنہ کون ہے؟

رودابہ : ہومائے ڈیر —— راجیش کھنہ ایک انڈین سینما ایکٹر ہے۔ دلیپ کمار بھی ——

گلچہر : (ذرا جوش سے) دلیپ کمار، مینا کماری، وجینتی مالا، ممتاز۔ میں ان سب کی مُووِیز طہران میں دیکھ چکی ہوں۔ اپنے بچپن میں۔ آئی لو انڈین مُوویز ــــ میری ممی نے تو سنگم پانچ مرتبہ دیکھی تھی۔ اور داراب یاد ہے ہمارے بچپن میں وہ انڈین فلم سونگ ہمارے طہران میں کس قدر مقبول تھے "دوست دوست نہ رہا" ــ اور "میری جان شب بخیر!" آپ کو یہ گیت آتے ہیں ــــ؟

(رودابہ نفی میں سر ہلاتی ہے)

داراب : گلچہر! میرا خیال ہے کل صبح دن کی روشنی میں تمہاری سہیلی کی والدہ کا مکان تلاش کریں۔ اب ان مہربان خواتین کا شکریہ ادا کر کے چلتے ہیں۔ بارش کا زور کچھ کم ہو رہا ہے۔ (ٹھٹھک کر) ــ میم ــ آپ کے ہاں چینی نوادر کا بہت عمدہ ذخیرہ موجود ہے!

ہومائے : (چونک کر، خوشی سے) میرے گریٹ گرینڈ فادر نے چائنا سے تجارت شروع کی تھی۔ ان کے اپنے جنک تھے ــــ سمندری جہاز ــــ

داراب : ہاؤ انٹرسٹنگ ــ!

ہومائے : (جواب اپنے متعلق بتانے کے لئے دفعتاً بہت بے چین نظر آتی ہے) ڈپریشن سے قبل اس سڑک کے متعدد بنگلے ہمارے خاندان کی ملکیت تھے۔ کریشن کے بعد سب بک گئے۔ چین سے ٹریڈ بھی ختم ہوگئی۔

داراب : اور آپ کے والدین؟

ہومائے : دونوں مر گئے۔

داراب : بہن بھائی ــ؟

رودابہ : وہ بھی مر گئے ــــ

داراب : دوسرے رشتہ دار ــ؟

رودابہ : وہ بھی مر گئے ــــ

داراب : اوہ — آئی ایم سوری —

ہومائے : ٹھیک ہے۔ اس کے متعلق تم کیا کر سکتے ہو — (اوپر چھت پر کھٹ کھٹ شروع ہو جاتی ہے۔)

گلچہر : (چائے کی پیالی ختم کر کے داراب سے) اب اجازت لیں —؟

رودابہ : نہیں نہیں — ابھی بیٹھو — ڈنر کھا کر جانا —

داراب : میم — شکریہ — لیکن بہت رات ہو جائے گی۔ باہر ٹیکسی منتظر ہے۔

رودابہ : ٹیکسی رخصت کر دو۔ ابھی ہوشنگ آنے والا ہے۔ تم کو تمھارے ہوٹل پہنچا آئے گا۔ سانتا کروز یہاں سے زیادہ دور نہیں۔

ہومائے : (چونک کر) ہمارے پاس ۱۹۳۸ء ماڈل کی پیکارڈ ہے۔ پہلے میں اسے چلایا کرتی تھی فراٹے سے — ویک اینڈ کے لیے پونا — گرمیوں میں مہابلیشور — ماتھیران۔ اب میرے گھٹنوں میں گٹھیا کا اثر ہوتا جا رہا ہے۔ پیکارڈ پندرہ برس سے موٹر خانے میں بند پڑی ہے — ہوشنگ آجائے میں اس سے کہوں گی تم کو اسی میں تمھارے ہوٹل پہنچا دے۔

داراب : (گھبرا کر) جی نہیں — زحمت نہ کیجئے، ہم ٹیکسی پر ہی چلے جائیں گے۔

ہومائے : (یکلخت سکون سے) اچھا۔ جو تمھاری مرضی۔ ہوشنگ بھی میری پیکارڈ چلانے پر راضی نہیں ہوتا، ٹیکسی پر آتا جاتا ہے۔

گلچہر : (اب ذرا اکتا کر) مسٹر ہوشنگ کب آئیں گے؟

(ککو کلاک میں سے پرندہ باہر نکل کر سریلی سیٹی بجاتا ہے۔)

رودابہ : اب آتا ہی ہوگا۔ اسے تاش کی لت ہے۔ روزانہ پابندی سے ولنگڈن کلب جاتا ہے۔ پہلے ٹینس — پھر کارڈز۔ — نو دس بجے تک یہاں آتا ہے — تم لوگ بمبئی میں کب تک ہو —؟ کسی شام ہوشنگ کے ساتھ ولنگڈن کلب ہو آؤ۔

آج بھی نو دولتوں کے اس بدصورت نئے شہر میں اس کلب کا پرانا برٹش ماحول برقرار ہے۔ پرانی نسل کے چند وضع دار جنٹلمین اب بھی دستانے پہن کر چھڑی ہاتھ میں لے کر وہاں برج کھیلنے آتے ہیں۔

داراب : ہاؤ انٹرسٹنگ ــــ!

گلچہر : جیسے نیو انگلینڈ کے پرانے کنٹری کلب ــــ!!

ہومائے : یو آر رائٹ ــــ میں بھی جنگ سے پہلے والدین کے ساتھ امریکہ گئی تھی۔ اس سے بھی کئی سال قبل ماما جب پہلی بار پاپا کے ساتھ امریکہ گئیں ــــ ہالی وڈ میں رڈولف ویلنٹینو نے اپنے ہاتھ سے ان کو اپنی تصویر بھی دی تھی ــــ دکھاؤں ــــ؟ (اٹھتی ہے)

گلچہر : مائی گوڈ ــــ!

رودابہ : اب وہ تصویر کہاں تلاش کروگی۔ چھوڑو ــــ

ہومائے : (پھر بیٹھ جاتی ہے۔ اب داراب کو مخاطب کرکے) ہم دونوں بہنوں نے سوئٹزرلینڈ میں فنشنگ اسکول کیا۔ ہوشنگ نے تمھاری طرح اوکسفورڈ میں پڑھا تھا۔

داراب : میں کیمبرج میں ہوں۔

ہومائے : نیور مائنڈ ــــ اچھا ذرا میں کچن میں ہو آؤں ــــ ایکسکیوز می ــــ (اٹھ کر بائیں دروازے سے باہر چلی جاتی ہے۔ رودابہ اس کے پیچھے پیچھے جاتی ہے۔ دریچے کے باہر طوفان باد و باراں کی گرج ــــ سمندر کا شور بڑھتا جارہا ہے۔ داراب اٹھ کر دریچے سے باہر جھانکتا ہے۔ پھر آہستہ سے) اُفوہ کتنا گھپ اندھیرا ہے۔ میں نے ایسی تاریک رات کبھی نہیں دیکھی۔ انڈین مونسون کی رات ــــ! سمندر۔ بادل اور رات سب گھل مل کر ایک ہوگئے ہیں۔

(گلچہر ذرا خوفزدہ ہوکر داراب کے پاس جا کھڑی ہوتی ہے۔ احساس تحفظ کے

لئے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔)

گلجہر : داریوش ــــ!

داراب : (گھبرا کر) ارے ہماری کیب غائب ہوگئی ــــ؟

گلجہر : (کھڑکی سے باہر جھانک کر) نہیں ــــ نیچے پورٹیکو میں کھڑی تو ہے۔ کیا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے ــــ (ذرا توقف کے بعد) اس طرح کے قدیم شاندار جارجین مکان جنوبی اسٹیٹس میں بھی موجود ہیں۔ کوٹن پلانٹیشنز پر ــــ ہماری میزبان کہاں چلی گئیں؟

داراب : بے چاریاں ہمارے لئے ڈنر کا انتظام کرنے گئی ہیں۔

گلجہر : ڈیلائٹ فل اولڈ لیڈیز ــــ سو کیوٹ ــــ بالکل پھدکتی ہوئی چڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔

داراب : (افسردگی سے) گلجہر! بڑھاپے کا مذاق نہ اڑاؤ ــــ کبھی ہم اور تم بھی بوڑھے ہوں گے۔ ــــ اگر زندہ رہے۔

گلجہر : (ندامت سے) آئی ایم سوری ــــ ہنی ــــ

داراب : (سوچتی ہوئی آواز میں ــــ آہستہ آہستہ) انسانوں کی طرح نسلیں بھی بوڑھی ہو جاتی ہیں ــــ کیمبرج میں ایک مرتبہ میرے ایک انڈین پارسی دوست نے بتلایا تھا کہ اس وقت ساری دنیا میں پارسیوں کی تعداد السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کی سرکولیشن سے ایک تہائی کم ہے۔

گلجہر : گڈ گوڈ!

داراب : آج تیسرے پہر جب ہم لوگ سیر کرتے مالابار ہل کی ڈھلوان پر سے آ رہے تھے۔ راستے میں ٹیکسی ڈرائیور نے ایک گھنے سرسبز جنگل کی طرف اشارہ کر کے بتایا تھا کہ اس میں پارسی لوگ کا دخمہ ہے ــــ یاد ہے ــــ؟

گلجہر : ہاں ــــ

داراب : اس وقت مجھے ایک خیال آیا ___ پسار گارد ___ پرسی پولس ۔ طاقِ کسریٰ ___ اور آخر میں فقط مالابار ہل بمبئی کا دخمہ ___ ! لارڈ ! ___ واٹ این اینٹی کلائمکس !

گلچہر : ہاؤ سیڈ ___

داراب : نہیں ___ رنج نہ کرو ___ ہم تو زندہ ہیں اور ہماری قدیم تہذیب کے خالق یہ غیر معمولی لوگ بھی باقی رہیں گے ۔

(بارش دفعتاً تھم جاتی ہے ۔ دریچے کے باہر مدھم سی دودھیا روشنی آہستہ آہستہ تیز ہوتی ہے ۔)

داراب : گلچہر ___ دیکھو بادل ذرا سے چھٹے اور چاند نکل آیا ___ ماہِ کامل ۔ سامنے والے بنگلے کے پیچھے بادلوں میں سے نمودار ہوتا کتنا فسوں خیز معلوم ہو رہا ہے ۔ بالکل جیسے کانسٹیل کی ایک پینٹنگ ___ کبھی یہ جگہ بے حد خوبصورت رہی ہوگی ۔

گلچہر : ٹیکسی ڈرائیور کہہ رہا تھا صرف دس برس پہلے تک سارے مالابار ہل پر انتہائی پکچرسیک بنگلے موجود تھے ۔ اب سب غائب ہوتے جا رہے ہیں ۔ انھیں گرا کر ان کی جگہ اسکائی اسکریپر بنا دیئے گئے ___ داراب ! میں امریکہ سے ہندوستان اسکائی اسکریپر دیکھنے تو نہیں آئی ۔ کل ہی چلو بمبئی سے ۔

داراب : ڈارلنگ ___ ہم لوگ اصل ہندوستان کی سیر کے لئے پرسوں صبح سویرے یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں ۔ جے پور ۔ آگرہ ۔ دلی ۔ کھجوراہو ___ دی ورکس ! اکتاؤ نہیں ___

(باہر مینھ پھر برسنے لگتا ہے ۔ ہومائے اور رودابہ دو کشتیاں اٹھائے کمرے میں واپس آتی ہیں ۔ کشتیاں جن میں ڈھکے ہوئے ڈونگے چنے ہیں ڈائننگ ٹیبل پر رکھ کر اپنی اپنی جگہ واپس آ بیٹھتی ہیں ۔ داراب اور گلچہر دریچے سے ہٹ کر صوفے کی طرف آتے ہیں ۔ ہومائے اپنے ہاتھوں کو دھیان سے دیکھ رہی ہے ۔)

داراب : مادموزیل ___ آپ دونوں کے ہاتھ کتنے خوبصورت ہیں ۔ ارسٹوکریٹک ___ چھوٹے

چھوٹے ہاتھ جنھوں نے کبھی کام نہیں کیا۔ سوائے پیانو بجانے اور کشیدہ کاری کے ـــ!

(دونوں بہنیں تشکر آمیز نگاہوں سے داراب کاظم زادہ کو دیکھتی ہیں۔)

ہوماۓ : (ذرا بھرّائی ہوئی آواز میں) پیارے نوجوان آدمی تم بہت مہربان ہو ـــ اور بہت مہذب ـــ لیکن ہمارے بٹلر، کک، میڈ، سب کب کے رخصت ہوئے۔ عرصے سے ہم دونوں خود ہی کھانا پکاتے ہیں۔ خود گھر کا سارا کام کرتے ہیں۔

داراب : (خلوص سے) اب ہمارے لئے مزید تکلیف نہ اٹھائیے۔ ہم اپنے ہوٹل واپس جاکر...

ہوماۓ : نہیں نہیں ـــ ہوشنگ آنے والا ہے ـــ ہم سب کے ساتھ ڈنر میں شریک ہو ـــ پلیز ـــ!

داراب : بہت خوب ـــ شکریہ ـــ (کمرے میں ٹہل ٹہل کر سامان آرائش دیکھنے لگتا ہے۔ پھر سرار دشیر اور لیڈی جنک والا کی روغنی اکیڈمی تصاویر کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہے۔)

ہوماۓ : (فخر سے) ہمارے پاپا اور ماما.....! (رومال سے آنکھیں خشک کرتی ہے)

داراب : جی ہاں ـــ آپ نے بتایا تھا۔ (بیٹھ جاتا ہے)

ہوماۓ : دی لیٹر نائنٹین تھرٹی فور میں جب پاپا دیوالیہ ہوئے، اسی کمرے میں بھری برسات کی ایک ایسی ہی اندھیری رات انھوں نے تولیہ سر پر لپیٹ کر اپنی کنپٹی پر پستول چلا دیا تھا۔ (گلچہر خفیف سا لرز کر داراب کو دیکھتی ہے) کچھ عرصے بعد ماما شدتِ غم سے چل بسیں ـــ دستور جمشید جی ہمارے فیملی پریسٹ نے ہمیں سمجھایا ـــ روؤ مت ـــ باؤ دخت نسخ میں لکھا ہے: "خدا اور اس کے پیغمبر[1] کا ارشاد ہے کہ مرنے والے کی موت پر رونا گناہ ہے۔ جب مرنے والا عالم نزع میں ہوتا ہے دیو استاگ واد اس کی روح قبض کرنے آتا ہے۔ بالا روانے کیکاؤس جس نے آسمان پر پرواز کرنے کی کوشش کی تھی۔ دیو استاگ داد کے پنجے سے نہ بچا ـــ نہ افراسیاب شاہِ توران جس نے موت سے بھاگنے کی سعی میں سمندر

---

[1] حضرت زرتشت۔

کی تہہ میں آہنی محل بنوایا تھا ۔۔۔" ماما کی لاش کے لئے زمین پر بستر بچھایا گیا۔ سروش باج کی تلاوت ہوئی ۔۔۔ سگ دید کروائی گئی ۔ کفن پہنایا گیا ۔۔۔ دستور لوگ یشت گاہان کے لئے تیار ہوئے ۔۔۔ دخمے میں میت چڑھا کر دروازہ مقفل کیا گیا ۔۔۔ پسماندگان نے بعد وضو نمازِ دخمہ ادا کی ۔۔۔ تین رات تک ہمارے گھر میں اور دخمے کے نزدیک چراغ جلا۔ جانتے ہو ۔۔۔؟ اگر ان تین راتوں میں اوستا نہ پڑھی جائے تو سروش[1] رواں کی مدد نہیں کرتا ۔۔۔ رواں کے لئے پہلی تین راتیں بہت بھاری ہیں ۔ جو اسے نو ہزار راتیں معلوم ہوتی ہیں ۔۔۔ انبوہ در انبوہ دیو آکر اسے ڈراتے ہیں ۔ لیکن انھی تین راتوں میں سروش پُل[2] پر اس کی رہبری کرتا ہے ۔۔۔ نیک رواں کو ایمتا سپندیل چنوات پر سے گزار لے جاتے ہیں ۔ مقدس ارواح اور فردوس کی حوریں پُل کے سرے پر زرمایہ روغن[3] سے اس کا خیر مقدم کرتی ہیں ۔ وہ تا قیامت مسرور رہتی ہے ۔ چوتھے روز طلوعِ آفتاب سے قبل آفرنگان کی تلاوت کی گئی تاکہ رواں برزخ میں سے نکل جائے ۔ دستور آدھی رات کو آکر گھر کی دہلیز پر کھڑے ہو کے پسماندگان کو اطلاع دیتے ہیں ۔۔۔ اب متوفی کی رواں فلاں مقام پر ہے ۔۔۔ اب فلاں جگہ پہنچ چکی ہے ۔۔۔ بابا اور ماما کے لئے بھی انھوں نے یہی کیا داراب ۔۔۔! مجھے یقین ہے پاپا اور ماما کی روحیں اب فردوس میں موجود ہوں گی ۔۔۔ (رومال سے پلکیں خشک کرتی ہے)

داراب : (چند لمحوں بعد، گہری آواز میں) مجھے بھی یقین ہے مادموزیل ۔

(خاموشی کا مختصر وقفہ ۔۔۔ معاً چھت پر کھٹ کھٹ کھٹ ازسرِ نو شروع ہو جاتی ہے ۔ دونوں ایرانی مہمان گھبرا کر اوپر دیکھتے ہیں ۔)

گلچہر : (کھنکار کر) معاف کیجئے گا ۔۔۔ میم ۔۔۔ کیا بالائی منزل پر کرائے دار رہتے ہیں ؟

(دونوں بہنیں متوحش ہو کر ایک دوسرے پر نظر ڈالتی ہیں ۔)

---

[1] ایک فرشتہ ۔ [2] اوستا : پرتو ۔۔۔ پہلوی : پوہر ۔۔۔ فرانسیسی : پوں ۔ [3] موسم بہار میں تیار کیا ہوا مکھن ۔

ہومائے : (روداب سے) انھیں بتلا دوں ؟

(اسٹیج کے باہر ونگ میں کسی کے زینہ اترنے کی آواز ـــــ کھٹ کھٹ کھٹ ـــــ دائیں دروازے میں ایک بے حد ضعیف پارسن آسیب کے مانند نمودار ہوتی ہے۔ سفید لیس کا بلاؤز، سفید ریشمی ساری جس کی سیاہ مخملیں بیل پر رنگ برنگے پھول بنے ہیں۔ ہیرے کا بروچ۔ گوشوارے ـــــ سچے موتیوں کی مالا ـــــ جالی کے سفید دستانے، ساٹن کے سبک سفید سینڈل، دائیں ہاتھ میں نگین بیراسول ـــــ معلوم ہوتا ہے گویا سیدھی بکنگھم پیلیس کی گارڈن پارٹی سے واپس آرہی ہیں ـــــ عمر تقریباً پچانوے سال۔)

ضعیفہ : (جھرجھری آواز میں) ہومائے ـــــ! روداب! ـــــ سروش کسی کی مدد نہیں کرتا ـــــ نہ بہرامؔ یزد ـــــ نہ خود اہرمزد ـــــ اس دھوکے میں کبھی نہ رہنا ـــــ سمجھیں ـــــ؟ سب عالم برزخ ہی برزخ ہے۔ یا جہنم ـــــ فردوس کہیں نہیں ہے ـــــ سمجھیں ـــــ؟ باقی یہ کہ وہ پُل پر مہر داور کے سامنے پہنچ چکا ہے اور اب اس کا اور میرا مقدمہ مہر یزد کے سامنے پیش ہونے ہی والا ہے ـــــ آدھی رات کو تمھیں یہ اطلاع دینے آئی ہوں ـــــ گڈ نائٹ ـــــ

(ضعیفہ کھٹ کھٹ چلتی اسٹیج پر سے گزر جاتی ہے ـــــ گلچہر سہم کر داراب سے لپٹ گئی ہے ـــــ روداب اور ہومائے بھونچکی بیٹھی ہیں۔ باہر ونگ میں سیڑھیاں چڑھنے کی آواز ـــــ کمرے میں سناٹا)

(سنبھل کر) آئی ایم سوری ـــــ یہ بیچاری ہماری دیوانی آنٹ فیروزہ ہیں ـــــ سابق لیڈی فیروزہ ڈائمنڈ کٹر ـــــ اوپر کی منزل پر رہتی ہیں ـــــ بالکل تنہا ـــــ دماغ چل گیا ہے لیکن پچانوے ۹۵ سال کی عمر میں کیا قابل رشک صحت ہے ـــــ سارے

لہ ایک مددگار رہبر فرشتہ۔

وقت بیرا سول کی نوک سے فرش کھٹکھٹایا کرتی ہیں ـــ یہ چوبی چھت ہے اس وجہ سے آواز صاف آتی ہے ـــ ہمیں تنگ کرنا ان کا اصل مقصد ہے۔ (داراب اور گلچہر ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں۔)

ہوما ئے : میرا خیال ہے ہوشنگ کے آنے سے قبل تم دونوں کو بیچاری کریزی آنٹ فیروزہ کا قصہ سنا ہی دوں۔

رودابہ : (ڈانٹ کر) نہیں ہومائے ـــ خاموش رہو ـــ

ہومائے : ہرگز نہیں۔ ضرور سناؤں گی ـــ (داراب اور گلچہر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور تیزی سے دروازے کی جانب بڑھتے ہیں۔ ہومائے لپک کر داراب کا بازو پکڑ لیتی ہے اور غیر معمولی طاقت سے دونوں نوجوانوں کو ڈھکیلتی دریچے کے پاس لے جاتی ہے) وہ سامنے جلا ہوا کھنڈر دیکھتے ہو ـــ ؟ املتاس کے ادھر ـــ ؟

داراب : (ہکلا کر) جی ـــ جی ہاں ـــ

ہومائے : یہ لیڈی فیروزہ کا مکان تھا۔ (داراب عادتاً "ہاؤ انٹرسٹنگ" کہنا چاہتا ہے مگر سہم کر رک جاتا ہے) آنٹ فیروزہ ہماری والدہ کی دور کی رشتے دار تھیں۔ امیر کبیر ماں باپ کی اکلوتی ـــ دی ایئر نائنٹین ناٹ فائیو میں جب اپنے سوئیس اسکول سے واپس آئیں یوروپ سے ـــ ان کی شادی سر فریدوں جی ڈائمنڈ کٹر سے کر دی گئی۔ سر فریدوں بلجیم سے ہیروں کی تجارت کرتے تھے۔

رودابہ : شادی کے اٹھارہ انیس سال بعد وہ مر گئے ـــ لیڈی فیروزہ ڈائمنڈ کٹر ایک کروڑپتی لاولد بیوہ بن گئیں۔

ہومائے : ہوشنگ سر دشیار مرزا میر الطکین کا دوست تھا۔ مگر اس کے ماں باپ معمولی لوگ تھے۔ باپ ایک بنک میں ہیڈ کلرک ـــ سر اردشیر جنگ والا کی لڑکی سے اس کی شادی ناممکن ـــ وہ ہمارے تعلیمی ٹرسٹ سے وظیفہ حاصل کر کے پڑھنے کے لئے ولایت

چلا گیا تاکہ واپس آکر کچھ بن سکے اور مجھے بیاہ لے جائے۔ اس دوران میں ڈپریشن ہوا ۔۔ بابا ماما مرے ۔۔۔ ہمارا اپنا گھر تباہ ہوگیا۔

دی ایئر نائنٹین تھرٹی ایٹ میں ہوشنگ ولایت سے لوٹا ۔۔۔ مگر قسمت خراب تھی حسب دلخواہ ملازمت نہیں ملی۔ تین سال بے کار رہا ۔۔۔۔

ہومائے : تب ایک شام اسی کھڑکی میں کھڑے ہو کر اس نے مجھ سے کہا ۔۔۔ "ہومائے ۔۔۔ اجازت دو کہ میں لیڈی فیروزہ ڈائمنڈ کٹر سے شادی کرلوں۔ بڑھیا بیمار رہتی ہے۔ چند سال میں لڑھک جائے گی۔ پھر ہم تم اپنا گھر بسالیں گے ۔۔۔ اس وقت تم اور ہم دونوں افلاس کے شکار ہیں۔ اور اپنی مالی پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کا یہ واحد اور سہل ترین نسخہ ہے ۔۔۔" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا اور میں گم سم رہ گئی۔ وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر زینہ اتر کر پورٹیکو سے نکلا اور لیڈی ڈائمنڈ کٹر کے بنگلے کی سمت روانہ ہوگیا۔

روداب : ٹرف کلب میں دعوت ہوئی۔ دستوروں نے مقدس منتر پڑھ کر دونوں کو ایک دوسرے کا کتخدا[1] اور کد بانو[2] بنا دیا اور وہ ہمارا "انکل ہوشنگ" بن گیا ۔۔۔ آنٹ فیروزہ خوشی سے پھولی نہ سمائیں ۔۔۔ اس عمر میں ایسا خوبصورت نوجوان شوہر مل گیا ناقابل یقین خوش نصیبی ۔۔۔

ہومائے : بنام یزد[3] ۔۔! ہوشنگ کتنا شکیل اور طرحدار تھا ۔۔۔! اب ہم سب نے مل کر آنٹ فیروزہ کے انتقال کا انتظار شروع کیا ۔۔۔ شادی کے وقت ان کی عمر ساٹھ سے اوپر تھی ۔۔۔ گلچہرا ۔۔۔ اس وقت میں تمھارے ہی برابر رہی ہوں گی ۔۔۔ اور ہوشنگ بالکل تمھارے داراب جیسا تھا ۔۔۔!

(گلچہرا اور داراب لرز کر ایک دوسرے کا ہاتھ زیادہ مضبوطی سے تھام لیتے ہیں)

---

[1] شوہر [2] بیوی [3] ماشاء اللہ

رودابہ : لیکن آنٹ فیروزہ جیتی ہی چلی گئیں ـــ پینسٹھ سال، ستر سال، اسی سال ـــ اور بے چارہ ہوشنگ وفادار ملازم کی طرح خدمت میں حاضر ـــ آنٹ فیروزہ کا حکم تھا وہ چوری چھپے بھی ہم سے نہ ملے۔ ہمارے اور اس کے پیچھے پرائیویٹ جاسوس لگا رکھے تھے ـــ اور خبردار کر دیا تھا کہ اگر ہوماۓ سے ملتا پایا گیا تو وہ اپنی ساری دولت اس کے بجائے کسی خیراتی ادارے کو دے جائیں گی ـــ

ہوماۓ : تب عاجز آکر بے چارے ہوشنگ نے اپنی قسمت سے انتقام لینا شروع کیا ـــ وہ آنٹ فیروزہ کا روپیہ بے دردی سے اڑانے لگا ـــ ریس کورس ـــ جوا ـــ شراب ـــ سٹہ ـــ وہ اسے بھاری بھاری چیک کاٹ کر دیا کیں تاکہ خوش رہے۔

رودابہ : جب آنٹ فیروزہ اکیاسی کی ہو کر بیاسی میں لگیں ہوشنگ ان کو تقریباً کنگال کر چکا تھا۔ پھر اس نے آنٹ فیروزہ کی اکیاسیویں سالگرہ بڑی دھوم سے منائی۔ سامنے والے بنگلے میں زوردار پارٹی ہوئی ـــ کیک پر ۸۱ کے بجائے ۱۸ موم بتیاں لگائی گئیں۔ شہر کا بہترین ڈانس بینڈ آیا۔ ہم دونوں بہنیں اسی کھڑکی میں سے نظارہ دیکھتے رہے۔

ہوماۓ : اچانک بنگلے میں سے مہیب شعلے بلند ہوئے۔ چاروں طرف شور مچ گیا ـــ آگ ـــ! آگ ـــ!! کسی نے آکر کہا کہ برتھ ڈے کی ایک موم بتی سے اتفاقیہ آگ لگی۔ فائر انجن آتے آتے تین منزلہ بنگلہ جل کر خاک ہو گیا ـــ لیکن آنٹ فیروزہ تب بھی زندہ بچ گئیں ـــ آگ ہوشنگ ہی نے لگائی تھی۔

رودابہ : وہ بھی بچ گیا۔ فوراً رات کے اندھیرے میں بھاگ نکلا ـــ روپوش ہو گیا۔ لیکن ڈرائنگ روم کے ملبے میں بڑی دعوت میں آئے ہوئے کسی GATE CRASHER گمنام اجنبی کی لاش کو آنٹ فیروزہ ہوشنگ سمجھیں۔ اتفاق سے وہ بدقسمت اجنبی ہوشنگ کا ہم شکل تھا ـــ آنٹ فیروزہ نے فوراً ایک آرٹسٹ بلوا کر جلد از جلد اس کا

ڈیتھ ماسک بنوایا ـــ پھر لاش کی آخری رسوم ادا کی گئیں ـــ اخباروں میں چھپا کہ مسٹر ہوشنگ سروشیار مرزا اس خوفناک آتش زدگی میں نہایت ٹریجک طور سے ـــ جب وہ دھڑا دھڑ جلتے عالیشان ایوانِ نشست سے بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے ـــ (اور میزبان خاتون اور سارے مہمان اور ملازم بخیریت باہر نکلنے میں کامیاب رہے تھے) ـــ جلتے ہوئے مخملیں پردوں کے انبار میں پھنس کر جاں بحق تسلیم ـــ

ہومائے : (انگلی اٹھا کر رازدارانہ انداز میں) لیکن مجھے اور رُوڈی کو اصلیت معلوم ہے۔ وہ خبر غلط تھی۔ دنیا کو دھوکا ہوا ـــ آنٹ فیروزہ کو دھوکا ہوا ـــ وہ اسی وہم میں مبتلا ہیں کہ ہوشنگ اس خوفناک رات جل کر بھسم ہو گیا۔

رودابہ : ان کا محل نما بنگلہ راکھ ہو چکا تھا ـــ اور ہم لوگوں کے سوا ان کا کوئی رشتہ دار زندہ نہ تھا ـــ ہوشنگ سے بیاہ کرنے کے بعد وہ پچھلے بیس برس سے ہم سے قطع تعلق کر چکی تھیں ـــ مگر اس نازک وقت میں ہم دونوں اظہارِ افسوس کے لئے یہ سیڑھیاں اتر کر راکھ کے ڈھیر پر پہنچے ـــ وہ املتاس کے نیچے ایک ادھ جلی کرسی پر خاموش بیٹھی تھیں ـــ چاروں طرف ان کا آتش زدہ بیش قیمت ساز و سامان بکھرا پڑا تھا ـــ ڈیتھ ماسک ان کی گود میں رکھا تھا اور اس وقت وہ تقدیر کی خوفناک دیبی معلوم ہو رہی تھیں۔

ہومائے : لیکن آخری قہقہہ ہمارا تھا۔ ہم نے بحیثیت رشتہ داران سے درخواست کی کہ وہ ہمارے یہاں آجائیں۔ آنٹ فیروزہ اپنے تکبر اور نخوت کے لئے مشہور تھیں۔ انھوں نے مغرور شعلہ بار نگاہوں سے ہمیں دیکھا پھر ڈیتھ ماسک کی طرف اشارہ کر کے اپنی شاہانہ جھرجھری آواز میں آہستہ سے بولیں ـــ "ہومائے ـــ رودابہ ـــ یہ بدنصیب مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش میں جس لمحے "ہیپی برتھ ڈے" گاتے

مہمانوں کی بھیڑ کے پیچھے چھپ کر موم بتی کی لو سے پردے کو آگ لگا رہا تھا میں نے اسے دیکھ لیا تھا ــــ مگر اب بھی اسے نجات نہیں ملی۔ اس کی روان نکلتے نکلتے اپنے پیچھے اپنے نقوش چھوڑ گئی ہے ــــ" انھوں نے ڈیتھ ماسک اوپر اٹھایا پھر گود میں رکھ لیا اور خاموش ہو گئیں۔

رودابہ : اس کے بعد وہ مع اس ڈیتھ ماسک اور باقی ماندہ سامان چپ چاپ ہمارے یہاں دوسری منزل پر منتقل ہو گئیں ــــ ہمارے ساتھ تعلقات حسب معمول منقطع ــــ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو کرائے کی رقم کا لفافہ دروازے کی درز میں سے اندر سرکا دیتی ہیں ــــ

ہومائے : کچھ عرصے بعد وہ موت کا چہرہ بھی ان کے بیڈ روم سے چوری ہو گیا ــــ وہ عبادت کے لئے آتش کدہ گئی ہوئی تھیں ــــ واپس آئیں تو چہرہ غائب۔ اس کے بعد سے وہ بالکل باؤلی ہو چکی ہیں۔ (زور سے ہنستی ہے) ــــ داراب! میرا ہوشنگ بہت چالاک ہے۔ وہ بھیس بدل کر کولابہ میں مقیم ہے۔ اپنی شامیں ولنگڈن کلب میں گزارتا ہے ــــ سنیچر کی رات کو چپکے سے آکر ہمارے ساتھ کھانا کھاتا ہے اور پھر کولابہ واپس چلا جاتا ہے۔ آج سنیچر کی رات ہے ــــ (ککو کلاک کی چڑیا سیٹی بجاتی ہے ــــ کوکو۔ کوکو۔ کوکو) لو وہ آگیا۔

(ہومائے فوراً باہر جاتی ہے ــــ رودابہ پیانو کا اسٹول گھما کر تیزی سے "ویڈنگ مارچ" بجانا شروع کر دیتی ہے۔ چند منٹ بعد ہومائے ایک وہیل چیئر ڈھکیلتی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ کرسی پر ایک مومی پتلا سیاہ سوٹ پہنے بیٹھا ہے۔ اس کے سفید مومی ہاتھ دونوں گھٹنوں پر رکھے ہیں جیسے پہلے زمانے میں لوگ تصویر کھنچواتے وقت رکھتے تھے۔ پتلے کی گردن پر خوبرو آنجہانی ہوشنگ سروشیار مرزا کا ڈیتھ ماسک فٹ کر دیا گیا ہے۔

مرحوم کا مرتے وقت کا استہزائیہ تبسم پلاسٹر آف پیرس میں خوفناک انداز میں منجمد ہے۔)

(خانم گلچہر اسفندیاری اور آغائے داراب کاظم زادہ دہشت زدہ ہو کر چیختے ہیں:

—— یا علی!——

(دونوں اٹھ کر بھاگتے ہیں۔ بائیں دروازے سے سرپٹ باہر نکل جاتے ہیں۔ رودابہ پیانو کے پردوں پر سر جھکائے جوش و خروش سے "ویڈنگ مارچ" بجا رہی ہے۔ ہومائے پتلے کے گلے میں نیپکن باندھتی ہے۔ سائیڈ بورڈ پر رکھے شمعدان میں موم بتیاں جلانے کے بعد شمع دان ڈائننگ ٹیبل کے وسط میں لا کر رکھ دیتی ہے اور بجلی کی روشنی کا سوئچ آف کرتی ہے۔)

ہومائے: (صوفے اور پیانو کی طرف سے پشت کئے پتلے کے سامنے گلاس رکھتے ہوئے) —— گلچہر۔ داراب ڈیئر از سروڈ —— مجھے امریکنوں کا یہ رواج بہت پسند ہے۔ موم بتیوں کی روشنی میں طعامِ شب —— اس قدر رومینٹک .....

(رودابہ فوراً پیانو پر FAERY WALTZ بجانا شروع کر دیتی ہے۔ ہومائے پتلے کے سامنے ڈونگے چنتی ہے —— اب رودابہ MOONLIGHT SONATA بجانے میں مصروف ہے۔ چند منٹ بعد وہ اٹھ کر میز کی سمت آتی ہے۔ دونوں بہنیں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھتی ہیں۔ بیچ میں پتلا اپنی وہیل چیئر پر ذرا سا ترچھا ہو گیا ہے۔ تینوں کی پرچھائیاں شمعوں کی روشنی میں دیوار پر پھیل گئی ہیں)

ہومائے اور رودابہ: (سر جھکا کر ایک ساتھ دعائے طعام پڑھتی ہیں) اتا یزما میدے —— اہرمزد —— جس نے گاؤ اناج درختوں اور آب کی تخلیق کی —— ہر لقمے کے ساتھ خورداد[1] اور امرداد[2] کی برکت نازل ہو۔ اور یہ کھانا نوش[3] کی مانند ہو اور عقل اور

---

[1]،[2] فرشتوں کے نام۔ [3] شہد

ذہانت عطا کرے۔ گنہ شکستہ صد ہزار بار ـــــ

ہومائے : (سر اٹھا کر صوفے کی طرف مڑتی ہے) داراب ــ گلچہر ــ آؤ ــ ارے ــ یہ دونوں کہاں چلے گئے۔

روداب : (چونک کر) چلے گئے۔ (رک کر) اب مجھے ان کے متعلق شبہہ ہو رہا ہے۔ آخر یہ دونوں تھے کون ـــــ

ہومائے : نیور مائنڈ ــ کوئی پاگل لوگ تھے۔ کھانے کے لئے اتنا روکا اور اس آندھی اور طوفان میں نکل بھاگے ــ کریزی فارنرز۔

روداب : ہاں ــ آج کل پاگلوں کی دنیا میں کمی نہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے خبط الحواس آجاتے ہیں ہمارا وقت ضایع کرنے۔ (اچانک خوفناک قہقہہ لگا کر) اچانک غائب ــ بھوت تو نہیں تھے ـــــ؟

ہومائے : کریزی فارنرز ــ پاگل ــ خیر ــ ہونٹنگ ڈیر ــ یہ سُوپ لو۔ (چمچے سے سُوپ نکال کر ڈیتھ ماسک کے ہونٹوں تک لے جاتی ہے۔ موت کا چہرہ اپنی لرزہ خیز منجمد مسکراہٹ کے ساتھ بھیانک زاویئے سے پلیٹ پر جھک آتا ہے۔ باہر بارش اور طوفان بڑھتا جا رہا ہے۔ بلیوں کے رونے کی آواز، بجلی کی چمک، سمندر کی گرج۔ دریچے میں سے ہوا کا جھونکا اندر آتا ہے جس کی وجہ سے موم بتیاں جھلملا کر بجھ جاتی ہیں۔ اسٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اس تاریکی میں ہومائے اور روداب باری باری چمچوں سے ڈیتھ ماسک کے منہ پر سُوپ انڈیل رہی ہیں۔

پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

— دریں گرد سوارے باشد

۱۔ جو رہی سو بے خبری رہی

"—— عالم جلیل و فاضل بے عدیل تھے۔ اپنے تمام بھائیوں میں افضل گلاب کے پھول کی طرح حسین ——"

نیم تاریک غلیظ گلیوں میں سے گذرتے ہوئے اچانک کسی ڈیوڑھی کے اندر کھِلے تیز سُرخ گُلاب کی جھلک نظر آجاتی ہے، بہت عجیب لگتا ہے۔

"یہ قدیم دانشکدہ، یہ جزیرہ سخنوراں اتنا گندا —— کیوں؟" سائیکل رکشا پر وسیع جھیل کے کنارے سے نکل کر بھول بھلیاں میڈیول گلیاں طے کرتے ہوئے میں نے اپنے کزن سے پوچھا جو اس مشہور و معروف قصبے کے ہر چھوٹے شخص کی طرح اچھے خاصے شعر کہتا تھا۔

"ان گلیوں کی نالیوں کی نکاس ——" اس نے سائیکل پر ساتھ ساتھ آتے ہوئے جواب دیا۔ "جن کھیتوں میں ہوتی تھی وہاں کارخانے بن گئے۔ پانی رک گیا۔ اب نکاس کا کوئی راستہ نہیں۔"

"راستہ بنایا نہیں جاسکتا ——؟"

"کسی کو پرواہ نہیں۔ اور آبادی بڑھتی جا رہی ہے بے تحاشا۔"

کیا یوروپ کے شہروں میں آلِ موسیٰ کے GHETTO اسی طرح بنے تھے؟

ایک تاریخی پھاٹک کے سامنے ایک خستہ حال بوڑھا میلی چادر پر مونگ پھلیاں اور سستے بسکٹ چُنے سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ موڑ پر پہنچ کر اچانک ماموں میاں کی سفید ڈیوڑھی اس کے اندر سے سروِ شمشاد کی جھلک گویا سمرقند یا طوس یا دسویں صدی عیسوی کے قرطبہ یا اٹھارہویں صدی عیسوی کے مرشد آباد یا دلّی کا جھپیٹا۔ صدر دروازے پر غریب برقعہ پوش عورتیں اور ان کی کچر دھان۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ٹی۔ وی۔ فلم۔" شاعر کزن نے جواب دیا۔

اندر زنانے صحن میں ہینڈ پمپ پر ممانی جگر جگر کرتے جہازی لوٹے میں وضو کے لئے پانی بھر رہی تھیں۔ گلاب کی کیاری کے نزدیک ریٹائرڈ ماہرِ تعلیم ماموں میاں آرام کرسی پر نیم دراز پیچوان کے کش لگانے میں مصروف۔ ان کے ایک پروفیسر شاگرد جوان سے ملنے کسی دوسرے شہر سے آئے تھے ایک مونڈھے پر مودّب بیٹھے تھے۔

"اے بیٹا تم نے اپنے جدِ اعلیٰ زید شہید کی شمشیر کی زیارت اب تک نہ کی؟" ممانی نے دریافت کیا۔

"جناب زید شہید کی شمشیر یہاں کیسے پہنچی؟"

"لوگ اور ان کی چیزیں کہاں کہاں کیسے پہنچ جاتی ہیں۔" ماموں نے کہا۔

"اے بی سروَ بیگم کی بھی کچھ خیر خبر ملتی ہے؟" ایک پڑوسن نے بلبل چشم کے تخت پوش پر بیٹھے ہوئے سوال کیا۔ وہ بھی فلم دیکھنے آئی تھیں۔

"سروَ باجی کا تو بیاہ ہو گیا کراچی میں کب کا۔"

"اے لو — کس سے؟"

"میر حسن لندنی کے پڑپوتے سے۔" میرے بجائے ماموں نے جواب دیا۔
میں نے کان کھڑے کیے۔

"اور نعمت خانِ عالی کا اصل، نام کیا تھا ــــ؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"مرزا محمد ــــ سنبھل کے رہنے والے تھے۔" انھوں نے جواب دیا۔ میں نے فوراً پرس سے نوٹ بک نکالی۔ "ان کے پڑپوتے سے سرو بیگم کی پھوپھی ممتاز بیگم بیاہی تھیں۔" ماموں نے اضافہ کیا۔ بطور فٹ نوٹ۔

"ایک آل انڈیا پڑپوتا ایسوسی ایشن بنایا جاہیئے۔" شاعر کزن نے کہا۔

"مجھے ان دنوں میر قاسم کی بہت ٹوہ ہے۔" میں نے کہا۔

"فخر النساء بیگم ــــ" ماموں پیچوان گڑگڑاتے ہوئے بولے۔ "بنت سعادت علی خاں ــــ غازی الدین حیدر کی سگی بہن ــــ میر قاسم کے بیٹے نواب میر کلو سے بیاہی تھیں۔"

"اے ذرا کلو کو آواز دیجیو ــــ جلتی ہو شمشیر کی زیارت کرنے ؟" ممانی نے نماز کے لئے تخت پر بیٹھتے ہوئے دہرایا ــــ "شبو ــــ کلو سے کہنا رکشا لے آوے کل سویرے ــــ"

"ہسٹری محض فاتح قوم کا پروپگنڈہ ہے ــــ" ماموں نے اچانک کہا۔ "بقول شخصے خود عہد نامہ قدیم میں یہودیوں کا پروپگنڈہ ہے۔ کسی نے آج تک اشوریہ والوں کا پوائنٹ آف ویو معلوم نہ کیا۔"

"مجھے مظفر نامے کی بہت تلاش ہے تاکہ پلاسی اور بکسر کے متعلق اپنا پوائنٹ آف ویو معلوم ہو ــــ یہ کرم علی کون صاحب تھے ؟ مظفر جنگ کے ملازم تھے ؟" میں نے دریافت کیا۔

"سراج الدولہ کے عتاب سے بچنے کے لئے پٹنہ چلا گیا تھا۔ جہاں مظفر جنگ نے اسے ملازم رکھا۔ انگریزوں نے جب مظفر جنگ کو نائب نظامت سے معزول کیا، کرم علی نے اپنے آقا کا غم غلط کرنے کے لئے مظفر نامہ لکھا۔"

"ہم ذرا غم غلط کرنے کے لیے ٹیلی ویژن اون کر آویں۔" شاعر کزن نے کہا اور اٹھ کر

دیوان خانے کی سمت چلے گئے۔

"سید محمد رضا خاں مظفر جنگ مرشد قلی خاں کے زمانے میں دلّی سے بنگال پہنچے تھے!" ماموں نے پھر اچانک بات کی۔ دور دھوبنیں بے سُری آواز میں مسلسل گائے جا رہی تھیں۔ چھت پر کبوتر کابکوں میں واپس آ رہے تھے۔ سرو شمشاد شام کی ہوا میں سرسرائے۔ ہرجائی ہوا جنگل جنگل منڈلاتی پھری۔ چاٹگام کے چکلہ دار محمد رضا خاں۔ سُرما ندی کنارے مدھو کا کھلی ہے۔

"محمد شاہ بادشاہ کا زمانہ تھا۔" دور سے ماموں کی آواز آئی۔

محمد شاہ پیا سدا رنگیلے۔ موسیقی کی پریاں گوڑ ملہار کے بادل بکھیر رہی تھیں۔ ڈوبتے سورج کی کرنوں کی چلمن کے عقب سے وہ بانکے لوگ نکلے مرشد آباد جانے کے لئے چہار اسپہ تیار ہے اور چوڈولہ۔

"اجی میں نے کہار کشا ابھی لے آؤں ——؟" درمیانی ڈیوڑھی میں سے آواز آئی۔ چار خانہ تہمد، چگّی داڑھی، سیاہ مخملیں ٹوپی، پھٹی قمیص ایک بزرگ کانپتے کھانستے دروازے میں نمودار ہوئے۔

"کہیے نواب میر کلّو ——" شاعر کزن نے کہا جو دیوان خانے سے واپس آ چکے تھے "مزاج عالی۔"

"اللہ کا شکر ہے۔ میاں۔"

"شکر ہے تو کھانس کیوں رہے ہو۔ علاج کرواؤ۔"

"علاج ——" وہ ہنسے۔ "میاں کی باتیں! بارہ آدمیوں کا ٹبّر۔ آٹھ بچے۔ چار بیوہ لڑکی کے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ روٹی نہیں ہے تو کیک کھاؤ۔ کیک کھاؤ ——" شاعر کزن نے جمائی لے کر مجھے مخاطب کیا۔ "کلّو خاں مرشد آباد کی باقیات الصالحات میں سے ہیں۔ کیوں حضرت؟ ذرا اپنا مظفر نامہ بٹیا کو سنائیے۔"

"بیٹا ہمارے پرکھے مرشد آباد والوں کے خانہ زاد غلام تھے۔ ہم اب رکشا چلاتے ہیں۔"
"بچپن میں یہاں آگئے تھے۔ لب ولہجہ بھی یہیں کا ہو گیا ہے۔" شاعر کزن نے کہا۔ "اور اپنی ہسٹری بتاؤ ——"
"اجی ہماری کیا ہسٹری۔ وہ تو آپ لوگوں کی ہوتی ہے۔"
"تاریخ خدا کا VISION ہے۔" پروفیسر شاگرد نے غالباً کسی اور خیال میں محو اچانک ایک اسٹیٹمنٹ دیا۔
"چہ خوب!" اگنوسٹک شاعر کزن نے تبسّم کیا۔ کلّو خاں آرام کرسی کے پاس زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے۔
"خدا تاریخ کے ذریعے اپنا پلان WORK OUT کرتا ہے ——" پروفیسر شاگرد نے کہا۔
"اچھا پلان ہے۔" شاعر کزن بولے۔
"یہ مابعد التواریخ ہے۔" پروفیسر شاگرد نے کہا۔
"سبحان اللہ!" لفٹ ونگ شاعر کزن دبی زبان سے بولے۔
میں دوسرے صحن کا چکر لگا کر آئی۔ دیوان خانے میں ٹیلی وژن اسکرین پر ہندوستانی ہیرو ہیروئن ایفل ٹاور کے اوپر کودتے، اچھلنے اور ڈوئیٹ گانے میں مصروف تھے اور آس پاس کے فرانسیسی بھونچکّے سے ان کو تک رہے تھے۔
"جو لاکھوں برس پہلے ڈینوسار تھے اب چھپکلی ہیں۔" ماموں نے کہا۔
"ارتقا اب کیوں جاری نہیں کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے کم از کم خچّر گھوڑا بن جائے۔" میں نے پوچھا۔
"وہ بھی ہو رہا ہے۔" شاعر کزن بولے۔
"اب مظفر جنگ کو لو ——" ماموں نے بات شروع کی۔ "ارتقا کا الٹ —— عروج سے

زوال ـــ"

"جی ہاں۔ مظفر جنگ کو لیجیے ـــ" میں نے کہا۔

ممانی نماز اور وظائف ختم کرکے نماز کے تخت سے اتریں۔

"اب آپ قہوہ جی باشی بن جائیے اور ہمارے لئے کافی بنائیے" ماموں نے فرمائش کی۔ اس وقت وہ استانبول کے جھپیٹے میں تھے۔ پھر گویا ہوئے "پلاسی کے بعد فرنگیوں کو حکومت مل گئی تھی مگر ملک کے انتظام سے ناواقف تھے۔ محمد رضا خاں کے تجربے کو دیکھتے ہوئے میر جعفر کے انتقال کے بعد بنگال کونسل نے ان کو نائب دیوان بنگال، بہار، اڑیسہ مقرر کیا۔ چھتر ہزار روپیہ سالانہ تنخواہ۔ اب وہ کمپنی کی طرف سے نائب دیوان اور نابالغ نواب نجم الدولہ کی طرف سے نائب ناظم تھے۔ مغل شہنشاہ نے ان کو بہار میں علاقہ ترہٹ کے اندر جاگیر دی تھی جو مظفر پور کہلائی۔ نواب مظفر جنگ خطاب ملا تھا۔ اٹھارہ لاکھ روپیہ جو کمپنی نظامت کے اخراجات کے لئے میر جعفر کو دیتی تھی، محمد رضا خاں کو دینے لگی۔ راجہ شتاب رائے ان کے نائب تھے۔

"لیکن جب عین نصف النہار پر گھپ اندھیرا چھا جائے ایسا محمد رضا خاں کے ساتھ ہوا، وارن ہیسٹنگز نے استمراری بندوبست شروع کرکے ایڈمنسٹریشن اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مظفر پور پر قبضہ کیا۔ سید محمد رضا خاں کی پنشن مقرر کر دی۔

"کل بی بی کی صحنک ہے۔ بلاوا دینے آئی تھی" ایک اور محلے والی نے قریب آکر ممانی کے کان میں کان میں کہا۔

ماموں نے سن لیا۔ بولے "نور جہاں بیگم نے اپنی سوت کو طعنہ دیا تھا۔ موتی بن کی پکڑی مارواڑن۔ اسے بھی دن لگے ـــ اس مارواڑن نے بی بی کی صحنک شروع کرکے بدلہ لیا۔"

"انہی امپیریل رویوں کے نتائج ـــ" شاعر کزن نے بات ادھوری چھوڑی اور آسمان

پر سے اُترتے ہوئے کبوتروں کو دیکھنے لگے۔

"منظفر جنگ کی چیت پور والی چار ہزار بیگھہ زمین کی وجہ سے فورٹ ولیم کالج کے کاغذات میں ان کو محض "نواب چیت پور" لکھا گیا۔ بعد میں اس کے حصے پر کسی مارواڑی نے جوٹ مل بنائی۔" ماموں نے کہا۔

"موئے بن کے پکڑے مارواڑی نے —" شاعر کزن نے اضافہ کیا۔

"منظفر جنگ کو انگریز نے معزول کیا اور ان کی زمین پر مارواڑی نے قبضہ کر کے جوٹ مل بنائی — یہ واقعہ بذاتِ خود ایک اہم علامت ہے۔" میں نے کہا۔ "انڈین سول سروس کے جان بیم نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ جنگ پلاسی محض ایک ہندوستانی صوبے پر ایک یوروپین تاجر کمپنی کی فتح نہیں تھی بلکہ ایک FOREIGN MOHAMMEDAN POWER پر ہندو نیٹو تاجر اور برٹش فنانشل طبقات کی مشترکہ فتح تھی۔ محمڈن حکومت کے زوال کا باعث اس کا اندرونی نفاق تھا۔ اور انگریز، ہندو مرچنٹ کلاس سے گہرا رابطہ رکھتے تھے۔ کارل مارکس نے یہی بات اس طرح کہی کہ فیوڈل نظام پر نئی مرچنٹ سرمایہ داری کی فتح ہوئی۔"

"لیکن انگریز جو اپنی کتابوں میں مسلمانوں کو FOREIGN POWER لکھ گیا اس بے ایمانی اور شرارت کا نتیجہ ہم آج تک یہاں بھگت رہے ہیں —" شاعر کزن بولے۔

مرزا ابوطالب اصفہانی — مجھے یاد آیا — منظفر جنگ کے وارڈ تھے۔ اسی خاندان کی ایک لڑکی سے ان کی شادی ہو گئی تھی۔ ۱۷۹۹ء میں مرزا صاحب لندن پہنچے وہاں ایک انگریز کے گھر میں انھوں نے نواب شیر جنگ کے لٹے ہوئے نوادرات اور کتب خانہ دیکھا — ۱۷۹۹ء — اسی سال کاویری کے کنارے ٹیپو گرا تھا۔ وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم لندن میں ٹیپو کا خود رکھا ہے۔ اس پر فارسی میں کندہ ہے۔ "یہ خود آب زمزم سے دھویا گیا ہے۔ اس پر دشمن کا کوئی ہتھیار اثر نہ کرے گا۔"

ٹیلی ویژن پر فلم میں ہندوستانی ہیرو ہیروئن اب ہائیڈ پارک لندن کے اندر دوڑتے

بھاگتے ڈڈ سیٹ گا رہے تھے۔

"مرشد آباد پہنچ کر سراج الدولہ نے التجا کی تھی۔ مجھے گذارہ دے دو اور تھوڑی سی زمین پناہ کے لئے۔ اس کی لاش کو ہاتھی پر رکھ کر گشت کردیا گیا۔" میں نے باواز بلند کہا: "جب ہاتھی اس کے محل کے سامنے سے گذرا اس کی والدہ روتی ہوئی محل سے نکلیں اور ہاتھی کے پاؤں سے لپٹ گئیں ——"

"سراج الدولہ کی بڑی خالہ بڑی سیاست داں عورت تھیں۔ گھسیٹی بیگم —— اپنے لڑکے شوکت جنگ کی جانشینی کے لیے کیا کیا جوڑ توڑ کئے ——" ماموں نے اظہارِ خیال کیا۔

"جوڑ توڑ، سازشیں، تشدد۔" شاعر کزن بولے۔ "بڑا تشدد تھا اس زمانے میں۔"

"آج نہیں ہے ——؟" ماموں نے دریافت کیا۔

"نیچے کروڑوں کیڑے مکوڑے اور اوپر چند ہزار گدھ ——" شاعر کزن نے آسمان پر نظر ڈالی۔

"لیکن محمد رضا خاں سے ہمدردی کیوں؟ نہ ان کے پاس جدید سائنس تھا نہ ٹیکنولوجی نہ عقلیت پسندی جس سے کلائیو اور وارن ہیسٹنگز لیس ہو کر آئے تھے۔ جب مظفر جنگ کلائیو اور وارن ہیسٹنگز سے مصافحہ کرتے ہوں گے لگتا ہوگا عہدِ وسطیٰ نئے سائنسی دور کو سلام کر رہا ہے ——" میں نے کہا اور ان جدید مغربیوں کا بسایا ہوا کلکتہ جسے دیکھ کر مرزا غالب ششدر رہ گئے تھے۔"

"سارے مفتوحین کلکتہ میں بسائے گئے ——" ماموں نے کہا۔

"قید بابل ——" میں نے کہا۔

"مظفر جنگ کی اولاد —— ٹیپو کی اولاد —— مرشد آباد والے میر جعفر کی اولاد۔ اور ان سب کے بعد جان عالم —— اور سب وہاں عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ آپس میں یہ مفتوحین ایک دوسرے سے رشتے ناتے کرتے اور اسی میں خوش رہتے۔" ماموں نے کہا۔ "ٹیپو کے پوتے

پرنس غلام محمد کی لڑکی سے مظفر جنگ کے پوتے دلدار جنگ نے اپنے لڑکے کا بیاہ کیا۔"

"وہ مرحومہ ہمارے ابا کی تائی تھیں۔ سید اصغر علی دلیر جنگ کی بیوی۔" ممانی بولیں۔

کلو خاں سر آگے کو بڑھائے غور سے سن رہے تھے — اچانک بولے۔ "ہمارے پردادا مرشد آباد والوں کے ہاں سے آکر دلیر منزل میں ملازم ہو گئے تھے اور ان کے بڑے بھائی رابرٹ صاحب کے ہاں خدمت گار تھے۔ رابرٹ صاحب اس وقت کپتان تھے۔"

"کمپنی کے متعلق عوام ایک گیت گاتے تھے — کمپنی نشان — بی بی گیا دمدمہ — اڑائے ہے نشان — بڑا صاحب، چھوٹا صاحب۔ بانکا کپتان۔ دیکھ میری جان۔ لیا ہے نشان۔ کسی بانکے کپتان کے دستے نے شاید سراج الدولہ ہی کے کسی نشانچی سے اس کا پھریرا چھینا ہوگا جب یہ گیت بنا۔ جس کے بعد انھوں نے دمدمہ جاکر بڑا کھانا اڑایا ہوگا۔" ماموں نے کہا۔

"دمدمہ انھوں نے ڈم ڈم بنایا۔ محرم میں حسینؑ یا حسینؑ کی صدائیں ان کو HOBSON JOBSON سنائی دیتی تھیں۔ ٹیپو کا لباس اور پگڑی فتح کی نشانی کے طور پر انھوں نے اپنے چپراسیوں کو پہنائی۔ آزاد برصغیر کی حکومتوں کے چپراسی آج تک یہی لباس پہن رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ع رہے گا کوئی تو تیغ ستم کی یادگاروں میں۔" شاعر کزن گنگنائے۔

"کلکتہ شہر میں کتنے گاڑیاں چل رہی تھیں۔ صبح کو صاحب لوگ میدان میں شہسواری کرتے۔ شام کو لیڈی لوگ گاڑیوں میں ہواخوری۔ امریکہ سے برف امپورٹ کی جاتی تھی۔ بنگال کلب۔ ریس کورس۔ کرکٹ۔ STEEPLE CHASE۔ پولو فاتح انگریزوں کے مشاغل تھے۔ مسلم مفتوحین کی اولاد کے پاس سوائے تفریح کے کوئی کام نہ تھا۔ سب کو وافر پنشنیں ملتی تھیں۔ بڑی بڑی کوٹھیاں بنوائی تھیں۔ ٹیپو کے پوتے اور مرشد آباد کے عالی جاہ سوشل سرگرمیوں میں نمایاں تھے۔ جے۔ پی۔ بنا دیئے گئے تھے۔ مظفر جنگ کے پڑپوتے اصغر علی دلیر جنگ لندن سے

بیرسٹری پڑھ آئے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی سید احمد علی بحد صاحب آدمی تھے۔ شاید ہندوستان کے پہلے براؤن صاحب۔ لوئر سرکلر روڈ پر اپنی کوٹھی بمبو ولا میں بالکل انگریزوں کی طرح رہتے تھے۔ فریڈرک رابرٹ سے بہت دوستی تھی۔ اکٹھے پولو کھیلتے تھے۔ فتح کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور انگریز مسلم مفتوحین کی اولاد سے برابری سے ملتا تھا۔ غدر سن ستاون میں لکھنؤ کی خورشید منزل بعد لا رمائینئر گرلز اسکول بن گئی اس پر فتح کا پرچم کیپٹن فریڈرک رابرٹ نے نصب کیا تھا۔

"رابرٹ صاحب کی ایک بہت حسین بہن تھی مارگریٹ۔ سید احمد علی خوبصورت لکھ پتی نوجوان تھے۔ سید محمد رضا مظفر جنگ کے نوادرات اور ہیرے جواہرات کے وارث۔ اس سے زیادہ افسانوی "انڈین پرنس چارمنگ" اس وقت طامس مور کی "لالہ رخ" ہی میں مل سکتا تھا۔ مارگریٹ اور سید احمد علی کی شادی ہو گئی۔ اسلامی نام اشرف النساء بیگم رکھا گیا۔ تین بچے پیدا ہوئے۔ سید یوسف علی، فاطمہ بیگم، احمدی بیگم۔ چودہ برس تک یہ خاندان ریجنٹ اسٹریٹ لندن میں مقیم رہا جہاں نواب احمد علی نے ایک عالی شان مکان کرائے پر لے رکھا تھا اور لندن کی اعلیٰ ترین سوسائٹی میں شامل تھے۔ اسی سوسائٹی میں بے چارہ مہاراجہ دلیپ سنگھ بھی مصنوعی انگریز بن کر وکٹوریہ کے "بیٹے" کی حیثیت سے زیست کر رہا تھا۔" ماموں نے بات ختم کی۔

"ہماری دادی کی دادا جان سے ناچاقی رہنے لگی۔ کلکتہ واپس آ کر کچھ عرصے بعد لندن واپس چلی گئیں۔ پھوپھی احمدی کو ساتھ لیتی گئیں۔ پھوپھی احمدی سایہ پہنتی تھیں پردے کا کیا سوال۔ وہیں لندن میں ایک مصری پاشا سے بیاہ کر لیا۔" ممانی نے کافی بناتے ہوئے کہا۔

"مارگریٹ اشرف النساء کے بھائی نے بہت ترقی کی۔ فیلڈ مارشل بنے۔ لارڈ کا خطاب اور آرل کا رینک حاصل کیا۔ تیسری اینگلو افغان وار میں مشہور عالم مارچ ٹو قندھار کی جنرل رابرٹ نے قیادت کی تھی۔" ماموں کافی پیتے ہوئے بولے۔ "لارڈ ڈفرن وائسرائے کے عہد میں جنرل رابرٹ انڈین آرمی کے کمانڈر ان چیف تھے۔ انھوں نے صوبہ سرحد اور افغانستان

کے درّوں کی قلعہ بندیاں مستحکم کیں اور رؤسائے ہند کو فوج میں بہتر عہدے دیئے۔ ان کے بھانجے بھانجی یوسف علی اور فاطمہ کی پرورش ان بچوں کی لاولد تائی بیگم دلیر جنگ نے کی ——— وہی جو ٹیپو سلطان کی پڑپوتی تھیں ——"

"اصغر علی دلیر جنگ کی دوسری بیوی سے دو لڑکے تھے۔ نادر جنگ اور بابر جنگ۔ دو لڑکیاں روشن آرا۔ اور گیتی آرا۔ روشن آرا پھوپھی کا لڑکا کلکتے میں کس مپرسی کے عالم میں زندہ ہے۔ ایک سنیما گھر میں ٹکٹ بیچتا ہے ——— کیوں کہ تعلیم کا شوق اس نسل کے بعد سے اٹھ گیا تھا۔

ممانی نے کہا" دادی مارگریٹ کے لندن واپس جانے کے بعد ہمارے دادا جان نے ایک سجادہ نشین کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ وہ ہماری پھوپھی فاطمہ بیگم سے ملنے بمبو دلا آیا کرتی تھیں۔ دھرم تلہ میں مولا علی کی درگاہ تھی۔ شیخ گلاب اس کے تکیہ دار فقیر تھے۔ نفیسن ان کی بیٹی تھیں۔ خانم صاحب کہلاتی تھیں۔ سونے کی کنجیوں کا گچھا ڈھکئی ململ کی ساری کے آنچل میں باندھے رہتی تھیں۔ ناک نقشے کی اچھی تھیں۔ ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ محمد حسین۔ سیّد احمد علی نے اُس کا بیاہ واجد علی شاہ کی پوتی سلطنت آرا منی بیگم سے کیا۔ [illegible] رخ مرزا کی لڑکی سے۔

" سیّد یوسف علی ہمارے ابا کی شادی کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ ان کے والد سیّد احمد علی نے ان کا بیاہ واجد علی شاہ کی ایک بیٹی سطوت آرا حلیمہ بیگم سے کیا۔ وہ گل اندام محل کے بطن سے تھیں۔"

"یہ اختر جو ہے خاکپائے جہاں
یہ شاہِ اودھ تھا کبھی اے جواں"

شاعر کزن گنگنائے۔

"سیّد یوسف علی بھی دس مہینے کے تھے جب ماں باپ کے ساتھ لندن گئے تھے۔ پورے

چودہ برس بعد واپس آئے۔ شکلاً اور مزاجاً بالکل انگریز۔ شاید مٹیا برج میں شادی بھی نہ کرنا چاہتے تھے۔ نکاح کے دوسرے روز ہی رنگون چلے گئے جہاں ان کی پھوپھی زاد بہن رہتی تھیں جن کے میاں وہاں تاجر تھے۔ چند روز بعد یوسف علی نے برما میں کہیں پر یاقوت کی کان پر پہریدار کی نوکری کر لی — برما پولس میں بھرتی ہو گئے۔"

"یہ مہم جُو دکٹورین امپریلسٹ انگریز جنرل لارڈ رابرٹ کے خون کے ورثے کا اثر تھا ورنہ اس وقت کے ہندوستانی مسلمان کی مہم جوئی مشاعروں اور مجروں تک محدود تھی۔" پروفیسر شناگرد نے اظہار خیال کیا۔

"ایک چور نے بندوق چلا دی۔ گولی کان کے پاس سے گذر گئی۔ اخبار میں چھپا۔ باپ نے گھبرا کر کلکتہ واپس بلالیا۔ رخصتی کے لئے بارات لے کر مٹیا برج گئے۔ واجد علی شاہ کے سارے بیٹے تقریب میں جمع تھے۔ پرنس بابر مرزا وغیرہ۔ انھوں نے دولھا سے تین سو روپے ماہوار پاندان کا خرچ باندھنے کے لئے کہا۔ انھوں نے جواب دیا میں اس پر قادر نہیں ہوں۔ باپ کا دست نگر ہوں۔ باپ کو بہت غصہ آیا۔ بہر حال دلہن رخصت ہو کر بمبو ولا آئیں۔ غالباً میاں کی بے التفاتی سے دق میں مبتلا ہو کر تین سال بعد مر گئیں۔

"نواب احمد علی خود بیحد انگریز تھے۔ پانچ بجے شام کو سگار پیتے ہوئے بمبو ولا کے برآمدے میں ٹہلتے تو لوگ اس وقت گھڑیاں ملاتے۔ نواب صاحب سگار پی رہے ہیں، پانچ بج گئے۔ دو کڑی برساتی میں سیڑھیوں سے لگتی۔ ایک پاؤں سیڑھی پر، دوسرا پائیدان پر تیسرا گاڑی کے اندر۔ نواب یوسف بہت خودسر تھے۔ ان کا کہا نہیں مانتے تھے۔ ایک دن انھوں نے گاڑی میں سگار پیا۔ باپ نے دوسرے دن کہا — سید نواب میری گاڑی میں سگار نہیں پیا جاتا — یوسف علی کلکتہ سے چلے آئے۔ لکھنؤ آ کر ریلوے میں نوکری کر لی۔ ۱۹۰۲ء میں نواب احمد علی بیمار پڑے۔ لکھنؤ تار دیا۔ جب تک یوسف علی بمبو ولا کلکتہ پہنچیں باپ کا انتقال ہو چکا تھا — ابا نے دوسری شادی لکھنؤ کی ایک رئیس زادی سے کی۔ میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔

۳۲ئہ میں مٹیا برج گئی تھی ۔ اس وقت تک سلطان خانے کے حوض میں ایک مچھلی سونے کی نتھ پہنے میں نے بھی دیکھی تھی ۔۔۔" ممانی خاموش ہو گئیں ۔ کچھ دیر بعد بولیں ۔۔۔" ابا کے تایا دلیر جنگ سات زبانیں جانتے تھے ۔ گوہر جان مجرے کے لئے دلیر منزل آیا کرتی تھیں اور اس کی ماں ملکہ جان گانا سنانے بمبو ولا بلائی جاتی تھیں ۔ ٹیپو سلطان کے ایک پڑپوتے نے ملکہ جان کے لئے قصیدہ لکھا تھا ۔۔۔"

"یہ ہے اصل بات ٹیپو کا پڑپوتا ملکہ جان کے لئے قصیدہ لکھتا ہے ۔ طاؤس ورباب آخر ۔۔۔" شاعر کزن نے اظہار خیال کیا ۔

"میں نے کتاب میں اس طرح پایا ہے کہ لوگ صورت مثال کو اصل سمجھ بیٹھے ۔۔۔" ماموں اپنی دُھن میں کچھ کہے جا رہے تھے ۔

دفعتاً میں نے کہا ۔" ماموں میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کے روز یوم پنجشنبہ صبح سویرے بطور صدقہ ایک بورہ سیاہ تل ، ایک سیاہ بیل ، تانبے کے ننانوے پیسے ٹیپو کے لئے خیرات کئے گئے تھے ۔ درمیان عصر و مغرب شہید ہوا ۔"

خاموشی چھا گئی ۔

"وہ کس لئے ہارا کیوں کہ ہم لوگ مچھلیوں کو سونے کے نتھ پہنا رہے تھے ۔" ماموں نے چند لمحوں بعد کہا ۔

فرانس کے انقلابیوں نے ٹیپو کا نام اپنے کلب کے رجسٹر میں یوں درج کیا تھا ۔۔۔۔ CITIZEN TIPU, MEMBER, REPUBLICAN CLUB ۔۔۔ میں نے یاد کیا ۔

"اجی کس کس بات کا غم کرد ۔" شاعر کزن نے موضوع تبدیل کیا ۔" پچھلے سال ہمارے ہاں کا شاندار محرم دیکھنے دلّی سے کئی روسی اور امریکن آئے تھے ۔"

"کچھ روپے سے اگر آپ ان گلیوں کی صفائی ۔۔۔" میں نے کہنا شروع کیا ۔ شاعر کزن اٹھ کر دیوانخانے کی طرف چلے گئے جہاں ٹی ۔ وی ۔ پہ ہندوستانی ہیرو ہیروئن اب سوئٹزرلینڈ میں ڈوئیٹ

گا رہے تھے۔

"مٹیا برج ایک غلیظ SLUM ہے جس میں واجد علی شاہ کے نام لیوا بستے ہیں۔ سولہ سولہ آدمی کے کنبے میں پاؤ بھر دال پکتی ہے۔ وہی حال ہے جو لکھنؤ کے وثیقے داروں کا ہے۔ اسی غربت میں پیسہ پیسہ جوڑ کر ہر سال دھوم کا محرم کرتے ہیں۔ بہت سی شہزادیوں کی شادیاں نہیں ہوئیں۔ بڑھیا ہوگئیں مگر مطالبہ دس لاکھ روپیہ مہر باندھنے کا قائم ہے۔ اب بتاؤ اتنا بڑا مہر کون باندھے گا۔ پچاس روپیہ مہینہ وثیقہ۔ صبح کو چار اور رات کی باسی روٹی سے ناشتہ کرتی ہیں۔ عبرت۔" پروفیسر شاگرد نے ایک آہ سرد بھر کر کہا۔ ان کی بیوی بھی مٹیا برج سے تعلق رکھتی تھیں۔

"حضرت زید شہید کی شمشیر میں یہ کرامت ہے کہ جب کوئی بھاری مصیبت آنے والی ہو اس کی سطح پر ایک دھبہ سا پڑ جاتا ہے۔ غدر سے پہلے بھی سنا ہے پڑا تھا اور اس کے بعد بھی کئی مرتبہ۔" کلو خاں بولے۔ "پرچھائیں سی پڑ جاتی ہے۔"

"تو اب تک اس کی سطح پر پرچھائیاں ہی پرچھائیاں ہوں گی۔" میں نے کہا۔

○

دوسری صبح جب میں اور ممانی کلو خاں کی رکشا پر سوار ہو کر گلی میں سے نکلے اور مزید پیچدار گلیوں میں سے گزرے دونوں طرف گندے سیاہ پانی کی نہریں بہ رہی تھیں۔ اچانک مجھے شدت کا ردعمل ہوا۔ پرانی تاریخ اور مسی ہوئی قصبوں اور تاریخی ہستیوں اور افسانوی کھنڈروں کے لئے میرا فیسی نیشن بالکل غلط، بیکار، احمقانہ اور لایعنی ہے۔ یہ بالکل ٹھہرا ہوا پانی ہے۔ سیاہ، کائی آلود، منجمد، غلیظ تو کیا اس تہذیب یا اس کے آثار کو اب محض لائبریری اور میوزیم میں بند کر دینا چاہیے؟ شاعر کزن جو سائیکل پر ساتھ ساتھ آرہے تھے انھوں نے غالباً میرے خیالات پڑھ لئے بولے۔ "یہیں کے پلے بڑھے ہمارے عزیز کراچی سے چند روز کے لئے آکر اس اچنبھے اور احساس برتری سے ہم کو دیکھتے ہیں جیسے پہلے زمانے میں بد دماغ انگریز نیٹوز کو دیکھتا تھا۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے قصبوں کا موازنہ کراچی سے کرتے ہیں۔ تینتیس[۳۳]، چونتیس[۳۴] سال اور چل لی یہ تہذیب۔ اب

اسے ہم اپنے ہاتھوں سے ختم کر رہے ہیں۔"

"کیوں کہ آپ کی ترجیحات PRIORITIES بالکل غلط ہیں۔ جب انگریزی پریس آپ کو بحیثیت "بیک ورڈ کلاس" شیڈولڈ کاسٹس کے ساتھ بریکٹ کرتا ہے تو آپ خوش ہوتے ہیں کہ آپ کو بھی مراعات ملنی چاہئیں۔" میں نے پوچھا "سینما، مشاعرے، قوالی اور محرم۔ اس کے علاوہ امتِ مرحوم کی دلچسپیاں کیا ہیں؟ سارے ہندوستان کے سینما گھروں میں فلمیں آپ کی سرپرستی کی وجہ سے جوبلی مناتی ہیں —"

"بٹیا —" کلو خاں نے رکشا چلاتے چلاتے اشارہ کیا — "ادھر نکٹی نوُرن کا امام باڑہ ہے۔ لال قلعہ دلّی سے یہاں آئی تھیں۔"

"ایک امپیریل ماضی کسی قوم کے لئے بڑا نقصان دہ اور جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے شاعر کزن سے کہا۔ سید محمد رضا خاں مظفر جنگ کی اس POST-MUGHAL دنیا میں آخری وارث ممانی جان برقعے میں لپٹی رکشا میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھیں۔

"بٹیا" کیا کہیے — کلو خاں کو کیا یاد آیا — برطانوی امپیریل کلکتے کے سہانے دن — اچانک بولے —" گوہر جان نے دلیر منزل میں بھیم پلاسی میں ایک چیز سنائی تھی — ہم دس بارہ سال کے تھے۔ خوب یاد ہے خدا بخشے ہمارے باپ بھی نادر جنگ کے خواص تھے۔ شاگرد پیشے سے آکر ہم برآمدے میں بیٹھ جاتے تھے اور سنا کریں تھے۔ یہ نرگس کی ماں جدن بائی بھی آیا کرے تھی اور گوہر جان نے اس روز گایا تھا — سماں بندھ گیا تھا — بھیم پلاسی میں گایا تھا۔ جاؤ سدھارو میری جان تم پہ خدا کی ہو اماں —"

وہ خاموش ہو کر رکشا چلاتے رہے۔

شمشیر بکف ٹیپو خود پہن کر ۴ مئی کی دوپہر میدان جنگ میں جانے کے لئے گھر سے نکل رہا ہے —

ایک اور خیال: جعفر علی خاں مرشد آباد سے آن کر کلکتے میں جہاں رہے تھے اور اپنے

لواحقین کے لئے کوٹھیاں بنوائی تھیں وہ جگہ علی پور کہلاتی ہے کہ جعفر علی خاں نے اسے بسایا تھا۔ اور وہاں پتیوں کا ٹرا سناٹا ہے اور ڈول لڑنے والے زنگیوں کی آہٹ جو درختوں کے سائے میں چل رہے ہیں اور سراج کی پسپائی کی آوازیں۔ نیچے نگاہ کی۔ کلّو خاں کے شکستہ، گرد آلود چپلوں میں اٹکے پاؤں یکسانیت سے رکشا کے پیڈل چلاتے جا رہے تھے۔

ایک گلی کے سرے پر ایک شکستہ پھاٹک نظر آیا جس کی اینٹوں میں گھاس اور پیپل کے پودے اگ آئے تھے۔ پھاٹک سے چند قدم کے فاصلے پر ایک اور ڈیوڑھی تھی جس کی سیڑھیوں کے نیچے سیاہ پانی کا نالہ بہہ رہا تھا۔ ایک مہترانی گھونگھٹ کاڑھے جھاڑو ٹوکرا لئے سامنے سے گزری۔ ہم لوگ رکشا سے اتر کر ڈیوڑھی کے اندر گئے۔ عین سامنے صحن کی لپی پتی دیوار کے کنارے گلاب کا ایک پھول کھلا ہوا تھا۔ ہرے ڈنٹھل پر ہری پتیوں سے گھرا تیز سُرخ گلاب کا صرف ایک پھول جیسا پہلے زمانے میں اٹراف روز یزہ کی شیشی پر بنا ہوتا تھا۔

اندر دالان میں ایک لڑکی مشین پر سلائی کر رہی تھی۔ طاق میں رکھا ریڈیو وودھ بھارتی کے فلمی گانے سنا رہا تھا۔ میں اور حمانی جا کر لڑکی کے پاس دوسرے کھرّے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ لڑکی نے سلام کیا۔ ریڈیو بند کر کے پان بنانے لگی۔ انگنائی کی دیوار کے ادھر سے ایک ضعیفہ اونچی آواز میں کسی سے مخاطب تھیں ــــ "تیرہ تیزی، بارہ وفات، میراجی، شاہ مدار، خواجہ جی، مریم روزہ ــــ اے لو پورا سال گذرا جاتا ہے پر بٹّو نہ آئیں پاکستان سے۔ کیا میرا چالیسواں کرنے آئیں گی؟"

ایک اور ضعیفہ دہری کمر، کمانی جیسی ٹانگیں کمرے سے برآمد ہوئیں۔ ہاتھ میں بڑا سا کنجیوں کا گچھا۔ دعا سلام کے بعد ان کے ہمراہ ہم لوگ انگنائی پار کر کے ڈیوڑھی میں پہنچے۔ گلی میں اترے۔ کیچڑ سے بچتے اس قدیم پھاٹک میں داخل ہوئے جو گلی کے سرے پر استادہ تھا۔ اندر اینٹوں کے وسیع صحن میں زرد خود رو پھول اُگے ہوئے تھے۔ چاروں طرف ایک عالی شان حویلی کے کھنڈر سامنے ایک اجاڑ برآمدے میں دیوار کے نزدیک ایک طویل چوبی صندوق رکھا تھا۔

فرش پر چٹائی ۔ ایک کونے میں کسی کتاب کے بوسیدہ پیلے اوراق کسی نے چٹائی کے نیچے سرکا کر اوپر اینٹ رکھ دی تھی ۔ زرد کاغذوں پر چھپی دھندلی عبارات چٹائی کے ایک بڑے سوراخ میں سے جھانک رہی تھیں ـــــ جب حلیمہ بگی آغا ولایت شیروان سے تشریف لے گئیں ـــــ قول آنجناب اکثر چنیں بود کہ وقتیکہ درگوش من آواز دوں دوں از نقارہ بر می آید خیال میکنم کہ اگر نادرشاہ

ان کی مادر گرامی کا نام لوراد تھا۔ مختار بن ابوعبیدہ ثقفی نے چھ سو دینار میں خرید کر مع چھ سو اشرفی خدمت میں امام عالی مقام کے گزرانا تھا۔ کنیت ابوالحسین اور بسبب کثرت تلاوت کلام اللہ حلیف القرآن بھی مشہور تھے ۔ عالم جلیل و فاضل بے عدیل تھے ۔ اپنے تمام بھائیوں میں افضل ـــ گلاب کے پھول کی طرح حسین

"اے باجی بیگم میں بھی آجاؤں زیارت کرنے ؟" دیوار کے ادھر سے آواز آئی ۔

"جم جم آؤ بہار آرا بیگم ۔" ہماری میزبان ضعیفہ نے جواب دیا۔

چند لمحوں بعد ایک اور بڑی بی جھکی جھکی دوسرے صحن سے دالان میں داخل ہوئیں بوڑھی پھونس ـــــ دھندلی آنکھیں ـــــ لیکن کراری آواز ـــــ شاید کچھ دیر قبل یہی پاکستان سے بچّو کے نہ آنے کا شکوہ کر رہی تھیں ۔ اور ان خزاں رسیدہ بی بی کا نام بہار آرا بیگم تھا۔ وہ بھی آن کر چٹائی پر اکڑوں بیٹھ گئیں ۔ میری نظر پھر اس سوراخ سے جھانکتی عبارت پر پڑی۔

"جب حلیمہ بگی آغا ولایت شیروان سے تشریف لے گئیں ۔"

ایک خاتون کا نام حلیمہ بگی آغا بھی کیا بانکا ترک تازی والا نام تھا۔

بہار آرا بیگم بڑھیا انگلش کارڈیگن پہنے ہل ہل کر دعائیں پڑھ رہی تھیں ۔ یہ کارڈیگن یقیناً ان کے کسی پوتے نواسے نے گلف سے یا انگلستان سے بھیجا ہوگا۔ محلّے محلّے قصبے قصبے غریب مسلمانوں کے گھروں سے افلاس کے آثار مٹتے جا رہے تھے ۔ کماؤ بیٹوں کے سمندر پار سے بھیجے روپئے اور خود اپنے دیس میں نئے کاروبار اور گھریلو صنعتوں کی بیرونی دنیا میں

بڑھتی ہوئی مانگ نے ان لاکھوں کاریگر مسلمانوں کے دن پھیر دیئے جن کے بے مثال آبائی ہنر یہ گھریلو صنعتیں تھیں۔ قالین بافی کے مرکز ایک چھوٹے سے قصبے میں مغرب کے تمام بنکوں کی شاخیں کھل چکی تھیں۔ ہر طرف نئے مکان بن رہے تھے۔ دینی مدرسے، مساجد۔

"سارے ملک کے ہر فرقے میں مذہب کا غلبہ شدّت سے بڑھتا جا رہا ہے۔" کل شاعر کزن نے کہا تھا اور اس کے بعد خود فخریہ اپنے ہاں کے محرّم کی تصاویر دکھائی تھیں۔

میزبان ضعیفہ نے کنجیوں کا گچھا چھنکا کر طویل صندوق کا قفل کھولا۔

رات ماموں میاں نے تفصیل سے سمجھایا تھا۔ اکبری منصبدار سید ابوالحسن یہاں آتے ہوئے گڑھ مکتیشر میں کنار دریا سرائے میں ٹکے۔ وہاں ان کی ملاقات ان کے مُرشد میاں اللہ بخش گنج بخش سے ہوئی جنھوں نے یہ مقدس تلوار اور نیزہ انھیں عطا کیا۔ ان کو ان کے مرشد شیخ مبارک بالادست جھنجھانوی نے اور ان کو ان کے مرشد میر علی عاشقاں شطاری جونپوری سرائے میر والے عارف باللہ نے کہ زید شہید کی اولاد میں سے تھے۔

"تم کو معلوم ہے —" ماموں میاں نے پیچوان کی نے رکھ کر اچانک پوچھا تھا۔ "پہلے زمانے میں صوفی لوگ — فقراء اور درویش ایک دوسرے کو سلام کس طرح کرتے تھے؟ ایک کہتا یا علیؑ — دوسرا جواب دیتا مولا علیؑ — گویا وعلیکم السلام — اچھا تو میاں اللہ بخش درویش نے یہ شمشیر اور نیزہ سید ابوالحسن منصبدار کو عطا فرمایا اور بولے یاد رکھو کرامت اس شمشیر کی یہ ہے کہ جب کوئی بڑی مصیبت نازل ہونے والی ہو اس پر داغ پڑ جائیں گے —

"سابق میں یہ تبرکات جن صاحب کے پاس تھیں ان کے ورثا میں سے ایک کی زوجہ ثانی ہمشیر حکیم غلام حسین خان کی تھیں۔ حکیم صاحب نے یہ تبرکات نواب یوسف علی خاں والئ رام پور کو دے دیں۔ نواب کے ایک اہلکار کو ان کی حقیقت معلوم نہ تھی۔ اس نے تلوار اور نیزہ اسلحہ خانے میں جمع کر دیا۔ اسلحہ خانے میں آگ لگ گئی۔ ایک بزرگ نے خواب میں آکر نواب سے کہا کہ تبرّکات فوراً واپس کر دو۔ چنانچہ نواب نے ہاتھی پر طلائی ہودہ کسوا، اس میں تبرّکات رکھ

بصد عزت وتکریم انھیں واپس کیا۔ یہاں لاکر زیارت کے لئے نکالا گیا تو شمشیر پر چھینٹے نظر آئے بعد چند روز کے غدر پڑا۔ انگریز سرکار نے رعایا کو نہتا کیا۔ یہ مقدس تلوار بھی کلکٹر ضلع نے اپنے قبضے میں کر لی۔ بعد کچھ عرصے کے اسے واپس کیا۔"

جو رہی سو بے خبری رہی۔

فرنگی کلکٹر بھی بے خبر تھا۔

ممانی جان واقف ہیں۔ صندوق کے سرہانے بیٹھی دعائیں پڑھ رہی ہیں۔ ان کی انگریز دادی کے بڑے بھائی فیلڈ مارشل ارل رابرٹ نے اپنی ولایتی تلوار سے افغانستان میں اہلِ ایمان کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے تھے۔ وہ بے خبر تھا ـــ لیکن ہم جو واقف ہیں ـــ

"سن سینتالیس میں بھی اس شمشیر پر دھبّے پڑ گئے تھے۔" ضعیفہ نے کہا۔

"اس مکان میں کوئی نہیں رہتا؟" میں نے دریافت کیا۔

"سن سینتالیس میں یہاں شرنارتھی آباد کر دیئے گئے تھے۔ وہ چند روز بعد کہیں اور چلے گئے۔"

"ان تبرکات کو کسی کمرے میں مقفل کیوں نہیں رکھتیں؟" میں نے پوچھا۔

"بابی۔ جب بھی اس صندوق کو کمرے میں رکھ کر تالا لگاؤ تالا آپ سے آپ کھل جاتا ہے۔ حکم نہیں ہے۔"

انھوں نے صندوق کا پٹ کھولا۔ احتیاط سے پہلے حضرت شرف الدین شاہ ولایتؒ کے تبرکات نکالے۔ تراشیدہ کہربا کی ایک انگشتری، ایک بڑا کڑا جس پر آیات قرآنی کے اعداد نقش تھے۔ ایک عصا۔ ان کو واپس رکھنے کے بعد قدیم بوسیدہ کپڑے میں لپٹی ایک تلوار نکالی۔ کپڑے کی پٹیاں کھولیں۔ تلوار نیام سے برآمد کی۔ تلوار کا دستہ چوبی تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ سطح پر جگہ جگہ چتیاں سی پڑی تھیں۔ تلوار کی قدامت جن کی سائنٹفک توجیہہ ہو سکتی تھی۔ بھالا بھی کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ دو منٹ بعد ضعیفہ نے دونوں چیزیں صندوق

میں واپس رکھیں ۔ جدّ اعلیٰ حضرت زید شہید ابن امام زین العابدینؑ کی تلوار اور نیزہ ـــــ کمال ہے۔

صحن میں بڑا سناٹا تھا۔ ممانی دعائیں پڑھنے میں منہمک تھیں۔ تیز دھوپ میں خود رو زرد پھول لہلہا رہے تھے۔ چند کوے فرش پر ٹہلتے پھر رہے تھے۔

شرما ندی کنارے مدھو کا کھلی ہے۔ ہرجاتی ہوا جنگل جنگل ـــــ

میزبان ضعیفہ اور بہار آرا بیگم کو خدا حافظ کہہ کر ہم لوگ باہر آئے۔ کلو خاں رکشہ کے پاس اس طرح مستعد کھڑے تھے گویا سید محمد رضا خاں مظفر جنگ کے چوبدار مغرق ہاتھی یا چوڈولے کی نگہبانی کرتے ہوں۔

اسی وقت مہترانی ٹوکرا اٹھائے گلی کی سیاہ کیچڑ میں پچ پچ کرتی دوبارہ پاس سے گذری۔ کیچڑ کی چند چھینٹیں اڑیں۔ کلو خاں توبہ تلا کرتے اُچک کر ایک طرف کو ہو گئے۔ "لاحول ولاقوۃ ضبو ضبو ـــــ نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ لے کے کمبخت نے نجس کر دیئے ـــــ ہمارے پاس اتنے کپڑے بھی تو ناں ہیں کہ بار بار بدلتے پھریں ۔ توبہ توبہ۔" اپنے شکستہ لباس پر نظر ڈال کر انھوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ اور ہم لوگوں کو سوار کرا کے گلی سے نکلے۔

۲۔ قائم کی بیریاں

شہر ہماری طرف بڑھتے رہے اور ہم میں شامل رہے اور ہمارے پاس سے اور ہمارے اندر سے ہو کر نکل گئے۔ ہم نے بہتے دریا کے کنارے خیمہ کیا تھا۔

۱۸۵۲ء میں وہ کوٹھی خان بہادر میر قائم علی سی۔ آئی۔ ای۔ نے لکھنؤ سے آکر پنجاب جانے سے قبل بنوائی تھی۔ پوری URBAN ESTATE تھی۔ وسیع احاطہ متصل فیض گنج۔ ایک طرف دوکانوں کی قطار۔ احاطے کا پھاٹک اور اونچی دیوار اب بھی باقی ہے۔ احاطہ، میر قایم علی

کی ایک پڑپوتی ثروت آرا بیگم کو ورثے میں ملا تھا۔ کوٹھی ثروت آرا کی بہن نذر سجاد حیدر کو۔ دو کانیں ایک پڑپوتے میجر حسنین کو ملی تھیں۔ سڑک کے پار عین مقابل میں قلعے کی سفید مسجد آم کے گھنے درختوں میں پوشیدہ۔ کچھ فاصلے پر قلعے کی شکستہ فصیل۔ اس کے احاطے میں گورنمنٹ کالج۔ کوٹھی کے عین سامنے چوراہے کے ادھر میر قایم علی کے ایک بڑے جاگیر دار کزن کا شہری مکان۔ اس مکان کے بالاخانے کے رنگ برنگے شیشوں والے دروازوں میں گرمیوں کی بھری دوپہروں میں سامنے کا پر فضا منظر بیحد سہانا معلوم ہوتا تھا کبھی اودا، کبھی نیلا، کبھی ہرا، کبھی نارنجی۔ نیلا منظر سب سے زیادہ بھلا معلوم ہوتا تھا۔ میر قایم علی کہیں پر بیریوں کے درخت بھی لگائے گئے تھے وہ محلہ اب تک قائم کی بیریاں کہلاتا ہے۔ صاف ستھری گلیاں، صاف ستھرے محلے۔ اس شہر آئینہ کے اس رنگ برنگے شیشوں والے مکان میں صبح شام بھشتی زینے کے دروازے پر آواز لگاتا — پردہ کر لیجئے۔ کبھی تیسرے پہر کو بہو نہ آتی اس کا آدمی یہی ہانک لگاتا — اس وقت آنگن میں نیم تلے بھائی مہدی اپنی انٹلیکچوئیل گفتگو کا رخ اس کی طرف موڑ دیتے۔ یہ نظام کس طرح بدلے گا۔ وہ جوش سے کہتے۔ تین ہزار سال سے ایک پوری آبادی کو NIGHT SOIL اٹھانے کے کام پر لگا رکھا ہے۔ اور خود کو مہذب کہتے ہیں۔ خر مارے تہذیب کے بھائی علی مہدی ہمیشہ NIGHT SOIL ہی کہتے تھے۔ آزادی کے فوراً بعد بھائی علی مہدی خود تو امریکہ جا بسے وہ آبادی اسی طرح NIGHT SOIL اٹھایا کی۔

آزادی کے پندرہ بیس سال بعد تک قائم کی بیریوں پر خاصی بے رونقی اور اداسی چھائی رہی تھی۔ پچھلے چند سال سے اس پورے شہر پر ایکدم زوروں کی بہار آگئی تھی۔ تین سال ادھر میں وہاں گئی تو ایک نواب زادہ کزن مونچھوں پر تاؤ دے کر بولے۔ اجی اب تو میں بھی سماوار ایکسپورٹ کر رہا ہوں۔ منجھلے بھیا کراچی سے آکر بتا جایا کریں تھے کہ ان کے ہر لڑکے لڑکی کے پاس الگ الگ TOYOTA موٹریں ہیں۔ ہم دم بخود سر جھکائے سنا کریں تھے۔ تو بھنتو ہم بھی اس کاروبار میں لگ گئے۔ پرانی نکال کر نئی ایمبیسڈر خریدلی۔ اب انشاء اللہ

سامنے والی اپنی زمین جو خالی پڑی ہے اس پر شو روم بنواؤں گا اور جو باہر سے ___ اجی مڈل ایسٹ، یورپ، امریکہ سے برتنوں کے خریدار آئیں گے ان کے ٹھہرنے کے لئے گیسٹ ہاؤس..."

مصر قدیم میں موت کا تصور یوں تھا کہ موت کا ملّاح نیل کی موجوں پر اپنی کشتی کھیتا شمال کی طرف رواں ہے اور جنوب کی سمت منہ کئے رہتا ہے۔ روحوں سے لدی کشتی الٹی سمت کو بہتی رہتی ہے۔ سامنے جو دریا بہہ رہا ہے اس پر ایسی کشتیوں کی ایک قطار گزرتی جا رہی ہے۔ جب کشتیاں آگے جا کر موت کے دھندلکے میں کھو جاتی ہیں ایک اور قطار نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ مُردے آدھی رات کو قبروں سے اٹھ کر SYNOGOGUE میں جا کر عبادت کرتے ہیں۔ کوئی بتا رہا تھا کہ برسوں جلے ہوئے کارخانوں میں رات بھر کھٹ کھٹ ہوا کی۔ بڑی گہما گہمی تھی۔ جیسے جلد از جلد سارا مال تیار کر کے نقش و نگار سے مکمل پیک کر کے دریا پر پہنچا دیا جائے جہاں خالی بجرے منتظر تھے اور ان کے ملّاح خاموشی سے جُنوب کی طرف دیکھ رہے تھے۔

کوٹھی میر قائم علی کی جگہ اب دو منزلہ عمارت کھڑی ہے جس میں متعدد ڈاکٹر رہتے ہیں۔ "اجی ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ دو مریض عورتیں اندر گئیں زندہ واپس نہ آسکیں"۔ سامنے قلعے کی سفید مسجد آم کے گھنے درخت، ثروت خالہ مرحومہ کے احاطے کا پھاٹک۔ سامنے رنگ برنگے شیشوں والا مکان، دور قلعے کی فصیل، بہتا دریا، سب چیزیں اسی طرح موجود تھیں۔ شاعر کزن جو قصبہ دانشمنداں سے آئے ہوئے تھے حسبِ عادت آسماں کو دیکھ کر بولے اجی کس کس بات کا غم کرو۔

ہم لوگ کالج کے احاطے میں داخل ہو کر فصیل کی سمت چلے۔ شاعر کزن بولے ___ "HOLOCAUST کے فوراً بعد کلکتے کے اس بے حد اہم مشہور انگریزی اخبار کا مسلمان اڈیٹر یہاں آیا تھا۔ مجھ سے پوچھا کیا آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں گے؟ میں نے جواب دیا اندلس سے جب لوگ نکلے مراقش پہنچ کر اپنے اندلسی مکانوں کی کنجیاں دیواروں پر ٹانگ دی تھیں کہ ایک روز واپس

جائیں گے، کبھی نہ جا سکے۔"

"یہ اندلس والی سچویشن ہرگز نہیں ہے۔" ایک رپورٹر بولا۔ میں نے کہا حضت سب سچویشن جہاں تک جان و مال کی تباہی، ہلاکت اور خونریزی کا تعلق ہے یکساں ہیں۔ مشرقی پاکستان کی سچویشن کیا تھی؟ جو لوگ وہاں سے جان بچا کر کٹھمنڈو اور کلکتہ پہنچے تھے کیا وہ اندلس سے نکلے تھے؟ ان کو ان کے ہم مذہبوں نے مارا اور نکالا تھا ___ اس نے پوچھا اب کیا ہوگا۔ میں نے کہا میں تری کال درشنی نہیں ہوں کہ بھوت، ورتمان، بھوش کا حال ایک ساتھ بتا دوں۔ کچھ نہیں ہوگا۔ دھوپ چھاؤں۔ اسی طرح گاڑی چلتی رہے گی جب تک سارا معاشی نظام نہیں بدلتا ___"

ہم لوگ کالج کے احاطے میں سے ٹہلتے ہوئے فصیل تک پہنچے۔ گذشتہ سال ایک شام کو میں یہاں شاعر کزن اور نواب زادہ کزن کے ساتھ چہل قدمی کے لئے آئی تھی۔ ایک دلچسپ منظر دیکھا تھا۔ فصیل کی اندرونی دیوار میں ایک طاقچے میں چراغ روشن تھا، پھول رکھے تھے، اگر بتی سلگ رہی تھی۔ یہ کسی پیر کا چلّہ تھا۔ اس کے نیچے ایک دوسرے سے دور کچھ فاصلے پر دو غریب مسکین صورت آدمی چپ چاپ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ایک دھوتی پوش۔ ایک چُگّی داڑھی والا۔ یہ دونوں کالج کے چپراسی ہیں۔ شام کو دونوں یہاں بیٹھتے ہیں۔ آپس میں معاہدہ ہے۔ اس چلّے کے مجاور بن گئے ہیں۔ ہندو مسلمان جو چڑھاوا چراغی کا نذرانہ لاتے ہیں اُسے آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔" نواب زادہ کزن نے محظوظ ہو کر بتایا تھا۔

میں کچھ دیر کھڑی دیکھا کی۔ دونوں صبر سے ان چند پیسوں کی آس لگائے بیٹھے تھے جو کوئی عقیدت مند اس طاقچے پر چڑھا جائے۔

"تمھیں جان، بیم کی بات یاد ہے جس کا میں نے پچھلے سال نواب منظفر جنگ کی زمین اور مارواڑی کی جوڑ تل کے سلسلے میں تذکرہ کیا تھا پچھلے سال ماموں میاں کے ہاں؟" اس وقت قلعے کی شکستہ فصیل کے نیچے میں نے شاعر کزن سے پوچھا۔

"نئے کاروباری طبقات کے مفاد ___؟" اس نے کہا۔

"ہاں - لیکن کم از کم اس شہر کے لوگ ان دونوں مفلس چپراسیوں سے عقل سیکھ لیتے کہ نئی خوشحالی میں جو نفع ہوا سے مل بانٹ کر کھاؤ ـــــ وہ دونوں ہیں کہاں ؟"

"کون ـــــ؟"

"وہی دونوں خود ساختہ مجاور جو گذشتہ برس یہاں دھونی رمائے بیٹھے تھے"

"شاید زندہ ہوں - انسان بڑا سخت جان ہے"

"اور شاید پھر یہاں چراغ جلا کر بیٹھ جائیں"

"جی ہاں - انسان بڑا سخت جان ہے - چلئے قائم کی بیریوں میں چھبن آپا کے ہاں - ان کا بڑا لڑکا کویت سے آیا ہوا ہے - اس کی منگنی کی دعوت ہے" شاعر کزن نے گھڑی دیکھ کر یاد دلایا۔

○

قائم کی بیریوں کے اس مکان میں بڑی چہل پہل تھی - انگنائی زرق برق کپڑوں میں ملبوس مہمان بیبیوں سے بھری ہوئی تھی - جس وقت ہم لوگ وہاں پہنچے اسی وقت چھبن آپا کا چھوٹا لڑکا ڈنمارک واپس جانے کے لئے اسٹیشن روانہ ہو رہا تھا - سب ڈیوڑھی کی طرف لپکے۔

"سدھارو - امام ضامن کی ضامنی اور بی بی سیدہ کی چادر میں دیا ـــــ" لڑکے کی دادی کی جھر جھری آواز بلند ہوئی۔

اتنے میں پچھلے دروازے کی کنڈی کھڑکی ـــ اور ایک کرارا نعرہ ـــ "اجی میں نے کہا پردہ کر لو ـــ"

"توبہ ہے - نگوڑے کو عین اسی وقت آنا رہ گیا تھا - مجن بیٹے دس منٹ رک جاؤ ـــ" دادی نے جھنجھلا کر کہا "دور پار - چھائیں پھوئیں"

ڈھاٹا باندھے، ٹوکرا اور جھاڑو اٹھائے ذرا لنگڑاتا ہوا مہتر آنگن میں داخل ہوا۔

"اے کلوا تم صبح نہ آئے ـــــ" ایک اصیل نے شکایت کی۔

"کیا کرتا۔ تلوے میں شیشہ چبھ گیا۔ زمین پاؤں تلے سے نکل گئی۔ اتنی تکلیف تھی۔ دو گھنٹے دواخانے کی لین میں کھڑا رہا۔ اور صاحب کان کھول کر سُن لو۔ میرا نام کلوا نہیں کلو خاں ہے"۔

کلو خاں ــــ میں چونکی۔ انھوں نے جھاڑو ٹوکر زمین پر رکھا۔ بغل سے نکال کر دستانے پہنے۔ پھر جھاڑو ٹوکرا اٹھایا اور بیت الخلا کی طرف سر جھکائے اس طرح چلے جیسے ان کے بزرگ سراج الدولہ کے ساتھ پلاسی سے لوٹے تھے۔

"کلو خاں ــــ" میں نے بھونچکی آواز میں دہرایا۔

میری للکار پر وہ ٹھٹھکے۔ پلٹ کر دیکھا۔ ڈھاٹا منہ ناک پر سے اس طرح سرکایا گویا میدانِ جنگ میں ڈٹے ہوں اور چہرے پر سے خود اٹھاتے ہوں۔

"بات گے ہے بٹیا ــــ" انھوں نے کھنکار کر کہا۔ "اس قیامت کے بعد سے اس شہر کے خاکروبوں کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ جھگڑا تو انہی کا شروع ہوا تھا۔ کیا کرتے۔ ہم بیس تیس آدمی اس کام میں لگ گئے۔ میں بھی ٹھہر آگیا۔ اس میں پیسہ بہت مل جاتا ہے۔ رکشہ کھینچنے، ٹھیلہ چلانے سے کہیں زیادہ بڑھاپا ہے۔ پھیپھڑے ناکارہ ہو گئے۔ رکشا نہ چلائی جاتی۔ بارہ جنوں کا ٹبر، کمانے والا اکیلا میں۔ دوسری بات گے ــــ یہ جتنے باہرے کے ملک ہیں اسلامی اور کرسچین، ان میں بھی تو یہ کام لوگ باگ خود ہی کریں ہیں"۔

میرا کوئی جواب نہ پاکر چند سکنڈ کھڑے رہے۔ پھر بولے ــــ" اور آپ اپنے ماموں ممانی سے ملنے نہ گئیں؟ مل آئیے۔ چراغ سحری ہیں دونوں ــــ"

"انھوں نے آپ کو کیسے آنے دیا ــــ؟"

"ان کو بتایا ہی کاں ــــ؟ چپکے سے سٹک لیا۔ آپ بھی نہ بتلائیے گا ــــ اچھا اللہ بیلی"۔

ڈھاٹا منہ ناک پر واپس کھسکا کر وہ لنگڑاتے ہوئے غسل خانوں کی سمت چلے گئے۔

کبھی عبرانیوں نے قاصیوں کو پانی بھرنے اور لکڑی چیرنے والے بنایا تھا کبھی قاصیوں نے نے عبرانیوں کو۔

نوشیرواں عادل کے محل میں آگ روشن ہے۔

اس نے بھیم پلاسی کے سُر اتنے اونچے کئے کہ شیشہ ٹوٹ گیا۔

الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے۔

اس شہر آئینہ سے جواب شہر کا بوس ہے۔ بیس میل دور اس قدیم قصبہ دانش منداں میں اپنے مغلیہ مکان کے اندر سرو کے نیچے آرام کرسی بچھائے والدہ مرحومہ کے کزن اور کوکلتاش جواب بھی لال قلعے کی زبان کے جھیپٹے میں ہیں، افسردگی سے کہیں گے ــــ عبرت۔ بے چارہ کلّو بھی آخر چی بن گیا۔

اور اسی قصبے کی ایک اجاڑ حویلی کے دالان میں ایک داغ داغ شمشیر کے صندوق کے سامنے وہ بوڑھی عورتیں شاید سرنگوں بیٹھی ہوں۔ بہار آرا بیگم اور ان کی پڑوسن۔

یا صاحب العصر والزماںؑ ۔ الاماں۔ الاماں۔ الاماں۔

○

۲۲ر جنوری ۱۹۸۱ء کا لکھا ہوا جھبتن آپا کی لڑکی کا خط۔

باجی جان تسلیم۔ یہاں کے حالات معمول پر آرہے ہیں۔ کاروبار زور شور سے شروع ہوگئے ہیں۔ پہلے جیسا ماحول نظر آتا ہے لیکن ابھی تلاشیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ انشاء اللہ اب حالات صحیح رہیں گے کیوں کہ لوگ کاروبار میں مصروف ہیں۔ انھیں افواہیں سننے کی بھی فرصت نہیں۔ چند روز قبل ایک افواہ سارے شہر میں گشت کر رہی تھی کہ محلّہ لال باغ کے فساد میں شہید ہونے والے ببّن خاں کی روح رات کو آکر اپنے دشمنوں سے بدلہ لیتی ہے لیکن چند روز بعد اس افواہ نے دم توڑ دیا۔ پڑھے لکھے لوگ بھی یقین کرنے لگے تھے۔ اب سوچ کر ہنستے ہیں۔

کلوا حلال خور بھی خیریت سے ہے۔ سلام لکھواتا ہے۔

جن بولو تارا تارا

دلارے چچا جیسے لوگ اقدار کے بحران اور افراطِ زر کی پیدا کردہ اخلاقی پستی کے موجودہ دور میں کمیاب ہیں، پہلے بالخصوص قصبات اور دیہات میں اکثر پائے جاتے تھے۔ نیک سرشت، بے ضرر، رونق محفل، کم نصیب اور ناکارہ۔ دلارے چچا کا تعلق روہیلکھنڈ کمایوں ریلوے سے ہرگز نہ تھا لیکن ہمیشہ "چھوٹی لائن" والے کہلائے کہ اترپردیش کے قصباتی فیوڈل کنبوں میں اگر کوئی منچلے رئیس زادے کسی مغنیہ، ڈومنی، گھریلو ملازمہ، قحط زدہ کسان لڑکی یا کسی "بنج ذات" عورت سے نکاح کر لیتے تھے یا اسے "گھر ڈال" لیتے تھے اس کی اولاد "چھوٹی لائن" کہلاتی تھی اور کبھی اپنے باپ کے خاندان سے ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکتی تھی۔ (ہندو گھرانوں میں ایسی سنتان کو داسی پتر کہا جاتا تھا) یہ بے چارے اس خاندان کے حاشیہ برداروں کی حیثیت سے زیست کرتے تھے۔ احساس کمتری اور افلاس میں مبتلا ان لڑکوں لڑکیوں کی شادیاں بھی خاندان میں نہ ہو سکتی تھیں۔

دلارے چچا ہمارے ایک قرابت دار گھرانے کی "چھوٹی لائن" تھے لیکن اس لحاظ سے خوش قسمت کہ ان کی ماں (جو ایک پردہ نشین شریف میراثن تھیں) ان کے والد کی واحد اور منکوحہ بیوی تھیں۔ دلارے چچا اکلوتے لڑکے اور باپ کی املاک کے تنہا وارث۔ انھوں نے بڑی شائستگی اور سلامت روی سے زندگی گذاری۔ برادری اور قصبے میں مقبول۔ فن گفتگو

کے ماہر۔ جگت چچا۔ ساری بستی کے دکھ درد میں کام آنا ان کا مشغلہ تھا۔ شادی، غمی ہر موقعے کے انتظامات انہی کے سپرد کیے جاتے۔ لڑکیوں کی شادیوں کے سارے بکھیڑے وہ بالخصوص اپنے ذمے لیتے اور لڑکی کے باپ کا ہاتھ بٹانا ایک مقدس فریضہ سمجھتے۔ (ان کی اپنی شادی الگ قصہ ہے جو آگے آئے گا۔) لاولد تھے اور بچوں کے شیدائی۔ ان کا اپنا مکان بستی کے کنارے پر واقع تھا جس کے بعد سرسبز و شاداب کھیت اور باغات انبہ حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ جب کبھی ہم لوگ وطن جاتے گرمیوں میں دلارے چچا اپنے آم کے باغ میں (جہاں وہ سیزن میں ایک مرتبہ ساری برادری کی دعوت کرتے تھے) یا سردیوں میں چبوترے پر حوالی موالیوں کے ساتھ بیٹھے گپیں ٹھونکتے پائے جاتے۔ دعوتیں کرنے کے علاوہ ان کے دو شوق اور تھے۔ شکار اور سینما (جسے وہ سینمہ بروزن نسیمہ کہتے تھے)۔ ہر نئی انگریزی اور ہندوستانی فلم باضابطہ اپنی فورڈ پر شہر یا دہلی جاکر دیکھتے۔ خاموش فلموں کی باتیں کرتے جو بالکل STONE AGE کا تذکرہ معلوم ہوتا۔ مثلاً یہ کہ "صاحب ٹیلیفون گرل ہم نے تین بار دیکھی اور سنہ ۲۶ء میں شیراز ہمانسو رائے نے بنائی تھی جرمن تعاون کے ساتھ۔ صاحب جرمنوں کا کیا مقابلہ۔ جنگ ہار گئے مگر سائنس میں سب سے آگے۔ اور ہمانسو رائے "لائٹ آف ایشیا" میں مہاتما بدھ خود بنے تھے۔ اس میں رینی اسمتھ ایک اینگلو انڈین لڑکی ہیروئن تھی اس کا نام سیتا دیوی رکھا تھا۔ سارے یورپ میں یہ فلم دکھلائی گئی تھی۔ اور لندن میں چار مہینے چلی تھی۔ بادشاہ سلامت نے اور پوری رائل فیملی نے اسے دیکھا تھا۔ جی ہاں۔" دلارے چچا فوراً نیسلز چاکلیٹ البم اٹھا کر لاتے۔ اس میں امریکن اور انگریزی فلم اسٹارز کی تصویریں لگی تھیں جو نیسلز چاکلیٹ میں سے نکلتی تھیں۔ ان میں سیتا دیوی اور اندرا دیوی کی تصویریں بھی شامل تھیں۔ دلارے چچا بڑے فخر سے کہتے تھے دیکھئے جناب اس میں بھی دو انڈین فلم اسٹارز کی تصویریں شامل ہیں۔ اور کرما کا کیا بتائیں آپ کو — لندن میں بنی تھی۔ دیویکا رانی نے بالکل انگریزی طریقے سے گایا تھا — "کرما! کرما!"

یہ سیتادیوی، اندرادیوی، وایلٹ کوپر، ارملین، سبیتادیوی، آزوری، زیب النسار، نجمن، زبیدہ، سلطانہ، نادیا، انوری، مادھوری، سلوچنا، بڑی ناقابل یقین سی ہستیاں معلوم ہوتیں۔ بالوں کے گپھے سے بنائے، طویل بندے، گلو بند اور عجیب و غریب ساریاں جن پر نیتوں کے boo لگے ہوتے تھے۔ عجیب و غریب بلاؤز پہنے بیحد حسین خواتین کے پس منظر ان سے زیادہ پراسرار تھے۔ کلکتہ اور بمبئی کے اینگلو انڈین اور یہودی محلے، تھیٹر کمپنیاں، لاہور کا شاہی محلہ ___ متعدد مراٹھی اور بنگالی مڈل کلاس تعلیم یافتہ لڑکیاں بھی فلم انڈسٹری میں شامل تھیں مگر جو رومان اور اسرار "ارملین" اور "عشرت سلطانہ بنّو" میں مضمر تھا وہ "شانتا آپٹے"، "لیلا چٹنس بی۔ اے۔" اور "سادھنا بوس" میں ہرگز نہ تھا۔

بہرکیف ان خواتین یا ان کی فلموں کا چرچا کرنے والے ہمارے ہاں فرد واحد دلارے چا تھے۔ لیکن دلارے چا کی یہ گفتگو اتفاقیہ ہی ہمارے کانوں میں پڑتی کیوں کہ سینما ایک قطعی مخرب الاخلاق شے سمجھی جاتی تھی اور اس کا ذکر بچوں کے سامنے نہیں کیا جاتا تھا۔ ذاتی طور پر دلارے چا کا سینما سے ایک مخصوص رابطہ ان کی ایک دکھتی رگ تھی اور ان کا یہ رابطہ کافی عرصے تک ایک ممنوں موضوع گفتگو رہ چکا تھا۔ علاوہ ازیں خود ہمارے ہاں نوجوانوں کو سینما سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ دراصل اس وقت تک نہ فلم انڈسٹری کی اتنی ترقی ہوئی تھی نہ ماس میڈیا کی جس کے ذریعے سینما قوم کی سائیکی پر حاوی ہو سکے، جیسا آج ہے۔ مختصر یہ کہ فلم، فلم اسٹاروں کا تذکرہ، فلمی پریس اور فلمی موسیقی ابھی لوگوں کا اوڑھنا بچھونا نہ بنے تھے۔ اس زمانے میں دلارے چا کی سینما سے اتنی شدید دلچسپی بہت انوکھی اور افسوس ناک تصور کی جاتی تھی۔ ہمارے ایک نوعمر کزن نے دلارے چا کی رہبری میں اشوک کمار کی دستخط شدہ تصویر منگوائی۔ اسے بڑے اہتمام سے ایک کمرے کے دروازے بند کر کے ہمیں دکھایا اس شرط پر کہ "امی جان سے ہرگز مت کہنا۔" لڑکیوں کو تو ہندوستانی سینما دیکھنے کی اجازت ہی نہ تھی۔ انگریزی پکچر دیکھنا البتہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی نشانی سمجھا جاتا تھا مثلاً یہ کہ

"کل میں نے A TALE OF CITIES دیکھی۔ میں تو خیر یہ ناول بھی پڑھ چکی ہوں اس لئے آسانی سے سمجھ میں آگئی" چھوٹی پود کو لارل اینڈ ہارڈی اور والٹ ڈزنی کے فلم دیکھنے کی اجازت تھی۔ ایک مرتبہ میری والدہ کی ایک پنجابی سہیلی کا کپورتھلہ سے خط آیا تھا جس میں انھوں نے اپنے شوہر کے متعلق اطلاع دی تھی "نجم فلم میں کام کرتا ہے"۔ تو والدہ کو بہت رنج ہوا تھا "کرنل اصغر علی کا داماد ایکٹر بن گیا۔ افسوس"۔ بمبئی ٹاکیز کے ہیرو نجم الحسن کو اس مختصر جملے کے ساتھ اماں نے تو DISMISS کر دیا مگر دلارے چاچا پوری جانکاری رکھتے تھے: "ارے صاحب نجم الحسن کی کیا بات تھی۔ بس دو خوبصورت ہیرو آئے تھے۔ ایک گل حمید مرحوم اور ایک یہ نجم الحسن۔ وہ گانا کیا خوب تھا — اناتھ آشرم ان کی فلم کا — سرکار یہ غلام روٹی کھانے جاتا ہے — بازار سے یہ حلوہ پوری لانے جاتا ہے —"

دلارے چا کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔

اماں کبھی کبھی اپنے ایک عزیز کے بارے میں تاسف سے کہتیں "امتیاز بھی فلمیں بنا رہا ہے"۔ ایک بار والدہ نے دلارے چچا کے سامنے بطور نصیحت امتیاز بھائی کی اس فلم سہاگ کا دان کا تذکرہ کیا جو انھوں نے لاہور میں بنائی تھی اور نقصان اٹھایا تھا۔ لیکن دلارے چا نے نہایت بشاشت سے فرمایا۔ "جی ہاں۔ کیا مکالمے لکھے ہیں۔ جب منتری کہتا ہے "مہارانی تمھارے سہاگ پر مرتیو کی چھایا کانپ رہی ہے —"

اماں نے ذرا سختی سے ان کی بات کاٹی — "دلارے اگر تم نے اسی عقیدت کے ساتھ کالج کی پڑھائی کر لی ہوتی —"

بے چارے دلارے چا سر جھکا کر خاموش ہو گئے۔

امتیاز علی تاج دراصل آج کے اعلیٰ تعلیم یافتہ انٹیلکچوئل ڈائرکٹرز کے پیش رو تھے۔ اسی زمانے میں لاہور اور کلکتہ کے دانشوروں نے سب سے پہلے سینما کے میڈیم میں دلچسپی لینی شروع کی۔ مگر اسی دلچسپی کی وجہ سے ہمارے قصبے میں بے چارے دلارے کو تجربہ

روزگار سمجھا جاتا تھا۔

سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۲۹ء حال ہی میں میں نے دیکھا جس میں پطرس بخاری کا کا باتصویر مضمون — "انگلستان کا جدید ترین تھیٹر" اور دیوان آتما نند شرر ملتانی کا مضمون چارلی چپلن پر شامل ہے۔ (دیوان شرر نے دو تین سال بعد ہندوستان کی پہلی انگریزی فلم کرما میں بھی کام کیا)۔ اسی سالنامے میں ایک اشتہار موجود ہے — "شبستان — اردو زبان میں پہلا باتصویر رسالہ۔ سینما کے ایکٹروں ایکٹرسوں کے اندرونی حالات، فلموں کے متعلق تازہ ترین معلومات۔ مشہور ایکٹروں اور مشہور مناظر کی تصویریں غرض جو کچھ آپ رات کو سنیما کے پردے پر دیکھتے ہیں یہاں آپ کو روز روشن میں بے پردہ نظر آئے گا۔ پنجاب کے نامور شاعر، ڈرامائسٹ اور فلم آرٹسٹ دیوان آتم آنند شرر بی۔ اے۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) اس کے ایڈیٹر ہوں گے۔ اس رسالے کا نوروز نمبر (پہلا پرچہ) کرسمس کے دن ۲۵ دسمبر کو شایع ہو جائے گا۔ دارالاشاعت: پنجاب۔ لاہور"

یہ رسالہ بھی غالباً سید امتیاز علی تاج ہی شایع کر رہے تھے کیوں کہ دارالاشاعت لاہور ان کے والد شمس العلما سید ممتاز علی کا مشہور و معروف اشاعتی ادارہ تھا۔

پھر نیرنگ خیال کے مزید سالناموں میں جہاں آرا کجن، نلنی ترکھڈ، زیب النساء، سلطانہ، سردار اختر، مختار بیگم وغیرہ کی تصاویر۔ مختار بیگم انگلیوں میں سگریٹ تھامے۔ عورتوں کی سگریٹ نوشی ہمارے ہاں آج تک بے حد معیوب سمجھی جاتی ہے غالباً اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ سگریٹ صرف ارباب نشاط پیتی تھیں۔ (مغرب میں بھی پہلی جنگ عظیم کے دوران ہی عورتوں کی سگریٹ نوشی ان کی سماجی آزادی اور مردوں سے ہمسری کی علامت قرار پائی۔)

نیرنگ خیال میں ایک اور تصویر ایک شوخ و شنگ پنجابی ایکٹرس ایک انتہائی خوبرو ایکٹر۔ ایکٹرس کا نام غالباً زہرہ بائی فلم کا نام غالباً ہیر رانجھا۔ لاہور میں بھی

فلمیں بنتی تھیں جو بڑی رومینٹک بات معلوم ہوتی تھی۔

ایک اور پرانا رسالہ آرٹ پیپر پر نیو تھیٹرز کا ماہنامہ عکاس۔ اڈیٹر آرزو لکھنوی۔ نیو تھیٹرز نے فلموں کو اچانک بہت باعزت بنا دیا تھا۔

قصبے کے اندر اپنی بیٹھک کے اندر پیچوان کے کش لگاتے دلارے چا نیو تھیٹرز، پربھات اور بمبئی ٹاکیز اور منروا کے کارناموں پر روشنی ڈالا کرتے۔ سینما کی پبلسٹی کا طریقہ سرکس والوں جیسا تھا۔ ایک ٹھیلے پر فلم کا بڑا سا اشتہار ساتھ ساتھ ایک دو بینڈ بجانے والے۔ ایک چھوکرا باتصویر پمفلٹ بانٹتا جاتا۔ یہ پمفلٹ دلارے چا اوّلین بولتی فلموں کے وقت سے جمع کر رہے تھے۔ زمین کا چاند۔ طوفانی ٹولی۔ بھولا شکار۔ لیڈر فیس۔ غلام ڈاکو۔ بمبئی کی بلی۔ پورن بھگت۔ اندرا ایم۔ اے۔ رنگیلا راجہ۔ لعلِ یمن۔ طوفان میل۔ امرجیوتی۔ دہاں۔ نرملا۔ طلاق۔ خان بہادر۔ جیلر۔ پکار۔

نسیم بانو اب ان کی پسندیدہ ایکٹرس تھیں۔ ان کی بیٹھک کی وسطی میز پر ایک انگریزی رسالہ رکھا رہتا تھا۔ اورینٹ۔ کلکتہ۔ اس کے سرورق پر نسیم بانو کی تصویر۔ کانوں میں بجلیاں۔ کلائیوں میں بے شمار چوڑیاں۔ بغیر آستین کا بلاؤز۔ گلاب کا پھول ملاحظہ کر رہی ہیں۔

اس دن جب میں کھیلتی کودتی ان کے ہاں پہنچی دُلارے چا کو کہتے سُنا —— "دتی کے کوئن میری اسکول میں پڑھتی تھی۔ فراک پہن کر اسکول آتی تھی۔" اس قسم کی معلومات آپ کو صرف دلارے چچا سے حاصل ہو سکتی تھیں۔

ان کے ایک مصاحب نے کہنا شروع کیا "صاحب وہ خان بہادر سلیمان ہیں نا۔"

"ہاں ہاں۔ وہی خان بہادر سلیمان جنھوں نے نئی دتی بنائی ہے۔" دلارے چا نے فرمایا۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ خان بہادر سلیمان نے نئی دلی کس طرح بنائی ہے۔ پوچھنے

ہی والی تھی کہ دلارے چا کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ فوراً بولے۔

"بی بی۔ جائیے۔ کوٹھی پر واپس جائیے۔ بھابی صاحب سے عرض کیجئے۔ دلارے شام کو قدم بوسی کے لئے حاضر ہو گا۔"

دلارے چا مجھے وہاں سے بھگانا چاہ رہے تھے مگر ایک روز قبل وہ اس چیتے کا قصہ چھیڑ چکے تھے جو انھوں نے گذشتہ ہفتہ لال ڈانگ کے جنگل میں مارا تھا۔ جو میں پورا سننا چاہتی تھی۔ جب میں گھر واپس پہنچی (ہم لوگ کرسمس کی چھٹیوں میں قصبے آئے ہوئے تھے) والدہ نے پوچھا "کہاں ماری ماری پھر رہی ہو اوائی تواتی ـــ"

"دلارے چا ـــ" میں نے مختصراً جواب دیا۔

"دلارے نگوڑا پھر بیٹھ گیا ہو گا ایکٹرسوں کے شجرے سنانے ـــ" ایک پھوپھی نے کہا۔ اچانک سب خاموش ہو گئے۔

سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ دلارے چا جیسے پیارے انسان کا تذکرہ ہمارے بزرگوں کو کیوں اداس کر دیتا تھا۔

دوسرے روز جب میں دلارے چا کے گھر ان کے خرگوش اور ہرن کے بچے دیکھنے گئی جو انھوں نے اپنے باغ میں پال رکھے تھے وہ آرام کرسی پر بیٹھے بڑے انہماک سے لاہور کے ایک فلمی رسالے چترا ویکلی میں "سوال و جواب" کا مطالعہ کر رہے تھے ـــ

سوال: نسیم بانو کی لڑکی کا کیا نام ہے؟ جواب: افسوس کہ نسیم بانو نے اپنی لڑکی کے نام کرن سنسکار پر ہمیں نہیں بلایا تھا۔

مجھے آرام کرسی کے پیچھے سے جھانکتے دیکھ کر بولے ـــ "جائیے باغ میں جا کر کھیلئے۔ یہ رسالہ آپ کے پڑھنے کا نہیں ہے۔"

دلارے چا کے بارہ دروازوں والے طویل دالان کی دیوار پر ایکٹرسوں کی تصاویر ایک قطار میں آویزاں تھیں۔ ارملین۔ پیشنس کوپر۔ وائلیٹ کوپر۔ زبیدہ۔ سلطانہ۔

مہتاب۔ گوہر۔ دیویکا رانی۔ رتن بائی۔ ببّو۔ پدما دیوی۔ مس روز۔ سلوچنا۔ مادھوری۔ رمولا۔ ان کی ساریوں پر ابرق لگی تھی اور شام کو جب دالان کے جھاڑ فانوس روشن کیئے جاتے تو وہ تصویر جگمگا اٹھتیں۔

اس قطار میں ایک جگہ خالی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس جگہ پر لگی تصویر کو اتار دیا گیا ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا وہ جگہ خالی دیکھی۔ مگر بزرگوں نے ہم سب بچّوں کو سمجھا رکھا تھا کہ دلارے چاسے کبھی اس خالی جگہ کے متعلق دریافت نہ کریں کہ وہاں کس کا فوٹوگراف آویزاں تھا۔

دلارے چا کی زندگی کا وہ ایک ایسا المناک گوشہ تھا جس کی پردہ داری مارے وضعداری کے سب مل کر کرتے تھے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا نجیب الطرفین نہ ہونے کے کارن ان کا بیاہ خاندان یا برادری میں نہ ہو سکتا تھا۔ جوانی میں وہ خاصے طرحدار رہے ہوں گے مگر عیاش یا آوارہ بالکل نہیں تھے۔ سینما کا بے حد معصوم سا شوق رکھتے تھے۔ ایک بار دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے بھوپال کی طرف گئے۔ وہاں سے بمبئی پہنچے۔ وہاں ریس کورس پر ایک ایکٹرس ملی۔ وہ ان پر ریجھ گئی۔ وہ اچھی خاصی مشہور اور بیحد حسین اداکارہ تھی اور غالباً شاہی محلہ لاہور سے تعلق رکھتی تھی۔ اور کسی شریف آدمی سے نکاح کر کے شریفانہ زندگی گذارنے کی ازحد متمنّی تھی۔ دلارے چا کی نیک دلی اور بھولپن پہلی ملاقات ہی میں لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تھا۔ وہ ایکٹرس سنا ہے ان پر عاشق ہو گئی۔ دلارے چا "بڑی لائن" کے چشم و چراغ ہوتے تو ایک ایکٹرس سے بیاہ کرنے کی ہمّت نہ کر سکتے۔ بے چارے پہلے ہی سے راندہ درگاہ تھے۔ محض اس وجہ سے کہ ان کی ماں میراثن تھیں ان کو "ٹاٹ باہر" سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے خاموشی سے اسی اداکارہ سے عقد کر لیا اور برقعہ اڑھا کر اسے وطن لے آئے۔ حسب توقع ان کے خاندان اور برادری کی بیگمات نے ان کی بیوی سے پردہ

دلارے چا اسے ہے کر گرمیاں گزارنے مسوری گئے۔ واپسی پر ہمارے ہاں دہرہ دون آئے۔

راقم الحروف کی والدہ کے متعلق غالباً انھوں نے سوچا ہو گا کہ اتنی روشن خیال مصلح قوم خاتون ان کی منکوحہ کو ضرور شرف باریابی بخشیں گی۔ میں اس سہ پہر پھاٹک کے قریب لگے سلور اوک کے تنے پر گلہریوں کی آمد و رفت ملاحظہ کر رہی تھی کہ ایک تانگہ وارد ہوا۔ دلارے چا سیٹ پر ایک ٹانگ رکھے رئیسانہ انداز سے براجمان۔ برابر سنہرے ریشمی برقعے میں ملفوف ایک خاتون۔ تانگہ برساتی میں پہنچا۔ میں پیچھے دوڑی۔ دلارے چا نے کہا "بی بی جا کر بھابی صاحب سے عرض کیجیے۔ دلارے آیا ہے۔ دلارے اور اس کی اہلیہ قدمبوسی کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔" میں نے تیر کی طرح اندر جا کر اماں سے کہا۔ وہ اپنے دور کی مشہور ناول نگار اور سوشل ریفارمر خاتون تھیں۔ ستار بجاتی تھیں اور کار چلاتی تھیں لیکن ایکٹرسوں سے ملنے کی وہ کبھی روادار نہ تھیں۔ انھوں نے بیزاری کے ساتھ جواب دیا "کہہ دو میری طبیعت خراب ہے۔ بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے ملنے جلنے کو منع کر دیا ہے۔"

میں نے باہر جا کر پیغام دہرایا۔ دلارے چا تانگے سے اتر کر برآمدے کے نیچے ٹہل رہے تھے۔ میری بات سن کر ان کا چہرہ اتر گیا۔ یقیناً ان کو میری والدہ سے اس رویے کی توقع نہ تھی۔ انتہائی مایوس آواز میں بولے "بہت خوب۔ ہم دونوں کی تسلیم عرض کر دینا۔" واپس جا کر سیٹ پر بیٹھ گئے۔ برقعہ پوش خاتون نے اب تک نقاب نہ الٹی تھی۔ اسی طرح نقاب ڈالے ہوئے وہ تانگے سے اتریں۔ برقعے میں سے ہاتھ نکال کر ولایتی گڑیا کا ایک بڑا سا ڈبہ برآمدے کے فرش پر سرکا دیا۔ شاید سوچا ہو کہ ان کے "ناپاک" ہاتھوں سے گڑیا بھی نہ لوں گی۔ وہ تانگے میں سوار ہوئیں۔ تانگہ برساتی سے باہر نکل گیا۔

اس زمانے میں فلمی پریس، گوسپ کالم، فلمی رپورٹر یہ سب کچھ نہیں تھا۔ اداکاروں کے اسکینڈل، معاشقے، طلاقیں، شادیاں آج کی طرح قومی اہمیت کے مسائل نہ بنی تھیں۔ فلم اسٹارز کی معاشرے میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ لہٰذا اس بے چاری کی دلارے چا

سے شادی کا بالکل چرچا نہ ہوا۔ حالانکہ وہ گل بکاؤلی اور حاتم طائی قسم کی پکچروں کی خاصی مقبول ہیروئن تھی۔

مسوری سے واپس جاکر دلارے چا اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ اس کو اپنے قصبے والی حویلی میں نہیں اتارا۔ سیدھے اپنے علاقے پر لے گئے جہاں ان کا دیہاتی مکان خالی پڑا تھا۔ اس کے بعد دلارے چا ہفتے میں دو تین دن کے لئے قصبے والے مکان پر آتے پھر گاؤں چلے جاتے جہاں ان کی بیوی ان کی خدمت گذاری، نماز روزے اور خانہ داری میں مصروف سات پردوں میں مستور رہیں اور صرف دو سال بعد بعارضہ یرقان راہی ملک عدم ہوئیں۔ سنا ہے مرتے وقت بہت خوش اور احسان مند تھیں کہ ایک باعزت گرہستن کی حیثیت سے دنیا سے جارہی تھیں۔ سنا ہے ان کی یہ بات سُن کر دلارے چا پھوٹ پھوٹ کر رو دئے۔

ان کے چہلم کے بعد اداس اور دل شکستہ دلارے چا قصبے واپس آکر رفتہ رفتہ پھر اپنے مشاغل میں لگ گئے۔ ان کے دیوان خانے کی اس پکچر گیلری میں بملا کماری، رتن بائی، مایا بنرجی وغیرہ کی قطار میں اس اداکارہ کی تصویر بھی موجود تھی جو اسے بیاہ لانے کے بعد دلارے چا نے تلف کر دی تھی۔ تب سے اس رنگین فوٹوگراف کی جگہ خالی پڑی تھی، اور اب تو وہ حسینہ دنیا ہی میں اپنی جگہ خالی کر گئی تھی۔

دلارے چا کی اس ذاتی ٹریجیڈی کا تذکرہ بالکل نہیں کیا جاتا تھا کیوں کہ سب کو معلوم تھا کہ وہ مرحومہ دلارے چا کی بہت ہی نیک اور اچھی بیوی ثابت ہوئی تھیں اور وہ اس سے بہت محبت کرنے لگے تھے۔

سماجی رویوں میں بھی تبدیلی آتی جارہی تھی۔ علی گڑھ گرلز کالج کے بانی شیخ محمد عبداللہ کی صاحبزادی خورشید آپا رینو کا دیوی بن کر اچانک تہلکہ مچا چکی تھیں۔ جب ان کی بھاوج "پُراسرار نینا" کے روپ میں پردہ سیمیں پر آئیں لوگوں کو اتنا ذہنی دھکا نہ لگا۔ اور اس کے کچھ عرصے بعد علی گڑھ کی زبیدہ حق عرف پیارے بیگم پارہ میں تبدیل ہوئیں۔ اس وقت

تک دوسری جنگ عظیم ہندوستان میں خاصے سماجی انقلاب لا چکی تھی۔

دلارے چا اب اپنی بیٹھک کی آرام کرسی یا اپنے آم کے باغ میں بیٹھے بھروسہ کے چندر موہن، جمنا کی زندگی، نسیم بانو کی میں ہاری، کاردار کے پاگل، محبوب کی عورت اور بمبئی ٹاکیز کی فلموں پر روشنی ڈالا کرتے — ”میں ہاری میں جب وہ کہتا ہے یہ جوتم کو بکوں کو دھونا چاہتی ہو — اور وہ گانا — پنگھٹ پہ اک چھبیلی پانی بھرن کو آئی — کیا فلم تھی صاحب !“

اسی زمانے میں ایک نئی ایکٹرس کی دھوم مچی۔ احباب نے تفصیلات کے لئے فوراً دلارے چا سے رجوع کیا۔ فرمایا۔ ”ارے میاں! وہ اپنے منجھلے میاں ہیں نا، ان کے تایا ابا، تم جانو ماہر فن گانے بجانے والوں کے بڑے قدردان تھے اور بڑے دریا دل۔ ان کے دو مصاحب بہترین ستاریے تھے اور دونوں سید زادے۔ اس لڑکی کی ماں بھی بڑی مشہور گائیکہ ہیں۔ تو وہ منجھلے میاں کے ہاں مجرے کے لئے بلائی گئی تھیں۔ ان کی اپنی فلم کمپنی بھی تھی۔ تو وہ ان دونوں استادوں کو اپنے ساتھ کلکتہ لے گئیں۔ دونوں مشہور میوزک ڈائریکٹر بنے“!

دلارے چا کی انسائیکلوپیڈیائی معلومات پر سامعین عش عش کرتے۔

لیکن مینا کماری کے دور تک پہنچتے پہنچتے دلارے چا کی دلچسپی سینما میں مدھم پڑگئی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ زمینداری کے خاتمے کے بعد دلارے چا شدید مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔ ساری زندگی بے فکری اور خوش حالی میں گزاری تھی۔ بیشتر مسلمان زمینداروں کے مانند کھانے کھلانے میں روپیہ اڑایا تھا۔ ان کے دستر خوان پر صبح شام دس دس احباب اور مصاحبین ان کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ اب اچانک ان کو افلاس اور تنہائی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے ”بڑی لائن“ والے سارے رشتے دار کراچی سدھارے۔ قصبے کا نقشہ بدل گیا۔ ایک وقت تھا کہ دلارے چا کی بیٹھک میں بھانت بھانت کے دلچسپ لوگوں کا جمگھٹا رہتا۔ محلے کے ایک بزرگ ہر لحاظ سے صحیح الدماغ تھے۔ محض ایک خبط لاحق تھا کہ شہزادی ایلزبتھ سے

بیاہ کریں گے۔ شہزادی کی تصویریں ساتھ لئے گھومتے۔ نہایت سنجیدگی سے کہتے بکھنگم پیلیس میں بادشاہ سلامت نے میرے لئے کمرے ٹھیک کروادیئے ہیں مگر میں تو اسے رخصت کرا کے یہیں لاؤں گا اور پردے میں رکھوں گا۔ دلارے چاچے حد متانت کے ساتھ ان بزرگ سے شہزادی ایلزبتھ کے متعلق گفتگو کرتے۔

ایک خستہ حال مغل شہزادے جو قصبے میں حکمت کرتے تھے شام کے وقت اپنا مطب بند کر کے جھکے جھکے عصا ٹیکتے آکر دلارے چا کے پاس بیٹھ جاتے اور ان کو اپنے وہ کرم خوردہ قانونی کاغذات دکھایا کرتے جن کے ذریعے وہ دلارے چا کی مدد سے گورنمنٹ آف انڈیا پر قلعہ آگرہ کی ملکیت کا دعویٰ دائر کرنا چاہتے تھے۔ دلارے چا بڑی دردمندی سے ان کی گفتگو سنا کرتے۔ ایک اور صاحب کا ارشاد تھا کہ عالم برزخ میں ریڈیو اسٹیشن کھُل گیا ہے۔ آدھی رات کے بعد وہ اپنے ریڈیو سیٹ پر مختلف آنجہانی مشاہیر عالم کی تقاریر اور دوسرے پروگرام سنا کرتے ہیں۔ مثلاً کل رات جانکی بائی نے غضب کی کجری گائی یا یہ کہ بسمارک کل اپنی تقریر میں کہہ رہا تھا.... وغیرہ۔

بعد میں دلارے چا کہتے "میاں یہ بیچارے ان تصورات میں مگن ہیں۔ اختلاف رائے کر کے ان کا دل کیوں توڑو"۔ طرفہ تماشا یہ کہ اہلِ دنیا نے خود دلارے چا کا دل بہت جلایا تھا مگر وہ ہمیشہ مسکرایا کئے۔

حال میں مدت مدید کے بعد دلارے چا سے ملاقات ہوئی۔ اپنی اجاڑ بیٹھک میں آرام کرسی پر لیٹے پیچوان کے کش لگا رہے تھے۔ عمر پچھتر برس کے قریب ہو چکی تھی۔ بوڑھے کمزور اور تنہا۔ میں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ چھت خالی پڑی تھی۔ جھاڑ فانوس بک چکے۔ فرش پر سے قالین غائب۔ دیوار پر پرانی ایکٹرسوں کی تصاویر البتہ موجود تھیں اور بالکل زمانہ قبل از مسیح کی یادگار معلوم ہو رہی تھیں۔ بملا کماری، لیلا ڈیسائی اور سلطانہ کی تصاویر کے پیچھے چڑیوں نے گھونسلے بنا لئے تھے۔ ویرانی اور اداسی در و دیوار سے ٹپک رہی تھی۔

میں نے سوچا دلارے چا کو ان کے محبوب تذکروں سے ذرا چیراب کرنا چاہیے۔" دلارے چا —" میں نے سلطانہ کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا "واقعی بڑی خوبصورت خاتون ہے۔ میں نے کراچی میں جب دیکھا اس وقت تک بیحد حسین تھی۔"

"ہاں بی بی —" دلارے چا سنبھل کر بیٹھ گئے۔" کئیوں نے اس کے عشق میں مبتلا ہو کر خودکشی کر لی تھی۔"

"اس سے ایک انڈسٹریلسٹ رزاق باؤلا نے شادی کر لی۔ اس کی لڑکی جمیلہ سے پاکستان کے ایک مشہور کرکٹ کھلاڑی نے بیاہ کر لیا ہے۔"

دلارے چا فارم میں آگئے۔ بولے —" رزاق باؤلا کے بڑے بھائی کو ایک مہاراجہ نے قتل کروا دیا تھا ممتاز بیگم کے چکر میں۔ پھر وہ ہالی وڈ چلی گئی۔"

"اس زمانے میں بھی لوگ یہاں سے ہالی وڈ چلے جاتے تھے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ کیا صرف تمھارا زمانہ ہی سب کچھ ہے۔ پچھلا زمانہ کچھ نہیں تھا —؟"

وہ ذرا رنجیدہ ہو کر پھر بیچوان کی طرف متوجہ ہوئے۔

میں نے تصاویر کی نچلی قطار پر نظر دوڑائی۔ گل حمید۔ راجہ سینڈو۔ ای بلی موریہ۔ ماسٹر وٹھل۔ موتی لال۔ ماسٹر نثار۔

میں نے کہا " دلارے چا چند سال ہوئے سیلا والے ڈاکٹر حمید کے لڑکے کی شادی میں ایک قوال پارٹی گا رہی تھی۔ قوالوں کی پچھلی صف میں بیٹھا ایک منحنی اور خستہ حال آدمی نحیف سی آواز میں ساتھ دے رہا تھا — کسی نے بتایا کہ وہ ماسٹر نثار تھے۔"

"افسوس۔" دلارے چا نے کہا۔" وہ شخص جب ہم بمبئی گئے تھے اپنی رولز رائس رکھتا تھا۔"

"جی — اور کوئی ایکٹرس لکھنؤ کی دلو چنا تھی؟"

"ہاں ۔ ہاں ۔ تھی ۔۔۔ کہو ۔۔۔"

"وہ اب بال سُرخ رنگے ایک ڈرائیونگ اسکول میں عورتوں کو موٹر چلانا سکھاتی ہے۔"

دلارے چا نے ایک آہ بھری ۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ بجائے چیراپ کرنے کے دلارے چا کو اور اداس کر رہی ہوں ۔ لہٰذا میں نے بشاش لہجے میں بات شروع کی ۔" دلارے چا معلوم ہے ان دنوں بولتے فلموں کی گولڈن جوبلی منائی جا رہی ہے ؟"

" اچھا " انھوں نے چونک کر پوچھا ۔۔۔" کل کی تو بات ہے ہم عالم آرا دیکھنے گئے تھے دلّی ۔۔۔" دلارے چا مزید دل گرفتہ نظر آئے ۔ میں ان کے لئے انگریزی اور اردو کے تازہ فلمی رسالے ساتھ لیتی گئی تھی ، پیش کئے ۔

"بی بی ! موتیا بند کی وجہ سے صاف سجھائی نہیں دیتا ۔ یہاں اس قصبے میں بڑے بڑے سینما ہال کھل گئے ۔ گھر گھر ٹیلی ویژن لگ گیا ۔ اور تو اور ایک خان صاحب ہیں گے ۔ نیپال کے راستے غیر قانونی کاروبار کرتے ہیں ۔ ان کے نودولتیے لڑکوں نے اپنے نئے مکان میں ایک ڈسکو روم بنایا ہے ۔ پڑوس میں ۔ رات بھر شور مچتا ہے ۔ نیند نہیں آتی ۔"

" دلارے چا " میں نے ایک انگریزی فلمی رسالہ ان کے سامنے رکھا اور پھر ان کو بشاش کرنے کی سعی کی ۔۔۔" یہ دیکھئے یہ ایک اور پاکستانی لڑکی لندن سے بمبئی آئی ہے فلموں میں کام کرنے ۔ لکھا ہے اس کی ماں نے شاہجہاں فلم میں کام کیا تھا ۔ ذرا پہچانیے تو سہی ۔۔۔"

دلارے چا نے تصویر کو غور سے دیکھا ۔ آنکھوں میں پرانی چمک واپس سی آگئی ۔ اپنے پرانے جانکاری والے انداز سے سر ہلا کر بولے " سمجھ گیا ۔ ایک انوری بائی آف امرتسر ہوا کرتی تھی ۔ ریڈیو والے جُگل کشور مہرہ نے اسلام قبول کر کے اس سے عقد کر لیا تھا اور شیخ احمد سلمان اپنا نام رکھا تھا ۔ پاکستان چلے گئے تھے ۔ انوری بائی کی لڑکی تھی نسرین شاہجہاں فلم کی ہیروئن ۔"

چند لمحوں کے لئے پرانے دلارے چا واپس آگئے تھے ۔

مجھے یاد آیا شیخ احمد سلمان ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل تھے اور سید امتیاز علی تاج اور ان کے بڑے بھائی سید حمید علی مرحوم کے گہرے دوست۔ لاہور سے کراچی آکر حمید بھائی ان کے ہاں ٹھہرتے تھے۔ ایک مرتبہ نسرین نے میری والدہ کو فون کرکے پوچھا تھا کہ حمید علی صاحب کب تک آرہے ہیں اور اپنا تعارف کرایا تھا کہ وہ شیخ احمد سلمان کی بیٹی ہیں (اس طرح کی قطعی غیر ضروری باتیں میرے دماغ میں خوب محفوظ رہتی ہیں) میں نے کہا۔ "جی ہاں دلارے چا شاید یہ—"

لیکن دلارے چا پر غنودگی طاری ہو چکی تھی۔ میں اٹھ کر طویل ڈھنڈار دالان میں ٹہلنے لگی۔ سارا فرنیچر فروخت کیا جا چکا تھا۔ ایک گوشے میں دقیانوسی گراموفون اور ریکارڈ ابھی موجود تھے۔ میں نے وہ قدیم ریکارڈ الٹے پلٹے۔ ایک ریکارڈ مختار بیگم کا نکلا۔ جن بولو تارا تارا— تب مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ لکھنؤ میں ایک صاحب تھے جن کے چھوٹے بھائی فلم ڈائریکٹر بن گئے تھے۔ ایک فلم کاروان حسن" ڈائریکٹ کی تھی اور اس کی ہیروئن سے شادی کرلی تھی۔ بچپن میں جب میں ان صاحب کی سالی کے ساتھ کھیلنے ان کے ہاں جاتی تو سابق ہیروئن تارا ماتھے تک دوپٹے سے سر ڈھانپے تخت پر بیٹھی نماز پڑھتی نظر آتی تھیں۔ پیاری سی شکل تھی۔ میری ہمجولی نے یہ بھی بتایا تھا کہ مختار بیگم کا مشہور گیت "جن بولو تارا تارا" انہی کے لئے کمپوز کیا گیا تھا۔ میں نے پلٹ کر دریافت کیا— "یہ فریدہ خانم مختار بیگم کی بہن ہے یا بیٹی—؟"

لیکن دلارے چا بڑھاپے کی پریشان نیند میں ڈوب چکے تھے۔ ایک پرندہ رتن بائی کی تصویر کے پیچھے سے پھڑپھڑاتا نکلا۔ میں نے اس کے برابر والی خالی جگہ کو دیکھا۔ آج تک دلارے چا سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی کہ ان کی گمنام اور نادیدہ پردہ نشین اہلیہ کون تھیں جن کی تصویر دلارے چا نے اس دیوار پر سے اس امید میں اتار دی تھی کہ شاید معاشرے میں ان کو جگہ مل جائے۔ لیکن وہ جگہ ان کو نہ ملی تھی۔

میں نے مختار بیگم کا ریکارڈ لگایا۔ گھِسی ہوئی آواز نکلی — جِن بولو تارا تارا جِن بولو تارا تارا جِن بولو تارا —

دلارے چچا مضمحل سے خراٹے لے رہے تھے۔ میں بیٹھک سے باہر آگئی۔

پس نوشت: چند روز قبل دلارے چچا اس جہان سے گزر گئے۔ گاؤں میں اپنی گمنام اہلیہ کے نزدیک سپردِ خاک کئے گئے۔ دوسری طرف ان کی والدہ کی قبر ہے۔ ان کو بھی معاشرے نے قبول نہیں کیا تھا۔

قصبے میں دلارے چچا کا مکان ان کی "بڑی لائن" کے ایک رشتے دار کو مل گیا۔ بیٹھک کی تمام تصاویر نکال کر پھینک دی گئیں۔ اس میں ایک سیاسی پارٹی کا دفتر کھُل گیا ہے۔

کہرے کے پیچھے

خچّروں، گھوڑوں، رکشاؤں اور ڈانڈیوں پر سوار انگریز صاحب اور میم اور بابا لوگ بازار کے اس پُل پر سے دن بھر گذرا کرتے ہیں شام کو ہندوستانی اُمنڈ آتے ہیں۔ تیز تیز چلتے، ڈھلان اترتے یا چڑھتے ہانپتے کانپتے انسانوں کا ریلا جوار بھاٹا معلوم ہوتا ہے۔ سینما گھروں میں ایستھر ولیمز، جون فونٹین اور نور جہاں اور خورشید کی پکچریں چل رہی ہیں۔ رنک میں اسکیٹنگ جاری ہے۔ ابھی سوائے کے ہال روم میں اینگلو انڈین گروڈنر اور اس کے ساتھی

ENJOY YOURSELF IT'S

LATER THAN YOU THINK

گانا شروع کریں گے۔ ڈرم پر چوٹ پڑے گی۔ مہاراجہ اور مہارانی لوگ اور نواب لوگ اور بڑا صاحب اور بڑا میم لوگ ڈینس بنائے گا۔

اس وقت جب سارا مسوری تفریح میں مصروف ہوتا ہے ایک غریب آدمی بازار کے اس پُل پر چپ سادھے کھڑا نظر آتا ہے — کبرا کھڑا بازار میں مانگے سب کی خیر۔

شکستہ خاکی کوٹ اور کنٹوپ پہنے یہ آدمی حُلیے سے بے روزگار مہتر معلوم ہوتا ہے۔ ایک انگریز بچّی گود میں اُٹھائے بازار میں آنکلتا ہے۔ جھٹ پٹے کے وقت تک چُپ چاپ کھڑا

رہتا ہے یا پُل کی منڈیر پر بیٹھ جاتا ہے۔

یہ فضل مسیح جمعدار کسی "صاحب" کی بچّی کھلاتا ہے تو اتنا مسکین اور پھٹے حال کیوں؟

تعجب!

یہ فضل مسیح فاتر العقل بھی معلوم ہوتا ہے۔ زار شاہی روس میں اس قسم کے لوگوں کو HOLY FOOL کہتے تھے۔ ہمارے ہاں مجذوب۔ پتہ نہیں یہ بیچارہ مجذوب ہے یا محض پیدائشی احمق۔ بہر حال۔ زیادہ تر وہ بالکل خاموش رہتا ہے۔ سنہرے گھنگھریالے بالوں والی بچّی اتنی خوبصورت ہے کہ اکثر راہ گیر ٹھٹھک کر اسے دیکھنے لگتے ہیں۔ بعض اوقات بابو لوگ کھیسیں نکال کر "گڈ ایوننگ مسّی بابا" بھی عرض کرتے ہیں۔ مسوری میں نووارد انگریز بھی اسے مسکرا کر دیکھتے ہیں لیکن مقامی انگریز اسے نظر انداز کرتے ہوئے پاس سے گذر جاتے ہیں۔ ڈیڑھ سالہ بچّی فضل مسیح کی گود میں یا کندھے پر بیٹھی ہنستی یا روتی یا اپنے ٹیڈی بیئر یا لولی پوپ میں مشغول رہتی ہے۔ فضل مسیح سامنے ہمالیہ کو تکا کرتا ہے جس کے اُدھر اَن دیکھی "پھولوں کی وادی" ہے۔

اندھیرا پڑے وہ بچّی کو کندھے پر بٹھال کر سر جھکائے ونسنٹ ہل کی طرف چل پڑتا ہے۔ محض ایک مرتبہ ایک لکھنؤی راہ گیر نے ٹھٹھک کر پوچھا تھا "اماں یہ کس کی بچّی ہے؟" تو اس نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا "میری بھانجی ہے صاحب"۔

"میاں ہندوستان کا اینگلو انڈین طبقہ کیا آسمان سے گرا تھا؟ اسی طرح وجود میں آیا ہے۔" دوسرے راہگیر نے قہقہہ لگا کر کہا تھا۔

شاید وہ قہقہہ بھی فضل مسیح کے کانوں میں گونجا کرتا ہے۔ مگر وہ کچھ بولتا نہیں۔ سر جھکائے لڑکی کو کندھے پر بٹھائے ونسنٹ ہل کی چڑھائی چڑھنے لگتا ہے۔

ونسنٹ ہل کی مقامی آبادی کو معلوم ہے کہ کوئی آیا اس حسین سفید فام بچّی کی ماں ہے اور فوجی بینڈ میں ڈرم بجانے والا ایک گورا اس کا باپ تھا۔ اور بچّی کو رجمنٹ ڈز گیسٹ ہاؤس

کی انگریز مالکن مس سیلیا ریمنڈ پال رہی ہے۔ کٹو آیا مس صاحب کی آیا ہے۔ ضلع گورکھپور کی رہنے والی سانولی سلونی طرحدار مہترانی۔ اس کے ماں باپ کو مس سیلیا کے مشنری باپ نے عیسائی کر لیا تھا۔ اس کا اصلی نام مارتھا ہے۔ مگر وہ گلہری کی سی پھرتی کے ساتھ پہاڑیاں چڑھتی اترتی ہے اس لئے کٹو کہلاتی ہے۔ مس ریمنڈ نے یہ گیسٹ ہاؤس اپنے چچا سے ترکے میں حاصل کیا ہے۔ سارا ریمنڈ خاندان یہیں مسوری کے انگریزی قبرستان میں دفن ہے۔ مس ریمنڈ کی زندگی یہ مہمان سرائے چلاتے گذر گئی۔ حالات نے ان کو غصیلا بنا دیا ہے۔ وہ ٹیڑی کی طرح چلاتی ہیں اس لئے ونسنٹ ہل کے نوکر چاکر اور قلی ان کو چُنچُنیا میم کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ریمنڈز دوسرے درجے کا "یوروپینز اونلی" گیسٹ ہاؤس ہے جس میں معمولی حیثیت کے انگریز، غریب سفید فام مشنری یا گوری رنگت کے یوریشین آکر ٹھہرتے ہیں۔ مس ریمنڈ اپنی عقابی نظر سے بھانپ لیتی ہیں کہ کس میں کتنے فیصد ولایتی خون ہے۔ ذرا بھی سانولے اینگلوانڈین کو کٹو آیا کے ذریعے کہلوا دیتی ہیں کہ جگہ خالی نہیں۔

○

یہ دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں کی بات ہے۔ ریمنڈز گیسٹ ہاؤس میں ایک نوجوان گوراٹامی آکر ٹکا۔ وہ بیمار رہ چکا تھا اور دو ماہ کی چھٹی پہ آرام کی غرض سے مسوری آیا تھا۔ (دوران جنگ میں محب الوطن مس سیلیا ریمنڈ نے اپنی مہمان سرائے انگریز سپاہیوں کے لئے حکومت کو پیش کر رکھی تھی۔) گوراٹامی کارپورل آرتھر بولٹن جنگ سے قبل لندن کے ایک معمولی ریسٹوران کے آرکسٹرا میں ڈرم بجاتا تھا۔ چاہتا وہ بھی یہی تھا کہ دنیا کے مشہور سازندوں میں اس کا شمار ہو مگر بہت سے فن کاروں کی طرح بہتر مواقع کے فقدان نے اسے بھی گمنام اور مفلس رکھا تھا۔ جنگ چھڑنے پر وہ فوج میں ڈرمر (DRUMMER) بھرتی ہو کر انڈیا آگیا تھا۔ انڈین آرمی کے دوسرے انگریز سپاہیوں کے مانند اسے بھی رومن اردو سکھائی گئی تھی۔ لیکن وہ ہندوستانی موسیقی بھی بڑے شوق سے سنتا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ

آرتھر بولٹن عام گوروں سے مختلف ایک غیر معمولی قسم کا گورا تھا۔

لیکن چونکہ وہ ایک اہم صاحب بہادر نہیں تھا کہ سوائے ہوٹل میں آکر ٹھہرے وہ محض بے چاری چُنچُنیا میم کا مہمان تھا۔ دن بھر وہ پہاڑیوں پر گھومتا یا پوئٹری لکھتا۔ کٹّو آیا سے اس کی سُریلی آواز میں کجریاں سنتا اور تال دیتا جاتا۔ کبھی کٹّو آیا اپنا گھیر دار سفید لہنگا گھماتی، کنجیوں کا گچھا جھنکا کر ٹھُمکی لگاتی "مرجاپور میں اور ن ٹھور ن کاشی ہمار و گھاٹ" تو آرتھر بچوں کی طرح خوش ہو کر تالی بجاتا اور اس کے ساتھ ناچنے لگتا۔ اسے کٹّو آیا بہت اچھی لگتی تھی اور اس کے باؤلے بھائی فضل مسیح سے بھی اس کی گہری چھنتی۔ وہ دونوں صبح صبح باہر نکل جاتے اور وادیوں میں پھرتے اور پہاڑوں پر تیرتے کہرے کو گھورا کرتے۔ اس دھند لکے کے پیچھے کیا ہے؟

(۲)

میرٹھ چھاؤنی واپس جاتے وقت آرتھر بولٹن نے کہا تھا "میں سچ بولنے کا عادی ہوں اس وجہ سے ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہوں۔ ہماری رجمنٹ شاید جرمنی جانے والی ہے۔ اور وہاں گھمسان کا رن پڑ رہا ہے۔ اس لئے میں شاید تم لوگوں کو خط نہ لکھ سکوں یا اگر ایک بار لکھوں بھی تو اس کے بعد نہ لکھوں۔ میں خط وکتابت کے معاملے میں بہت کاہل ہوں اور خطوں میں لکھا ہی کیا جا سکتا ہے؟" لیکن ضابطے کے مطابق میرٹھ چھاؤنی واپس جا کر اس نے مس رچمنڈ کو شکریے کا نوٹ بھیجا تھا جس میں کٹّو اور فضل مسیح کو سلام لکھا تھا اور یہ بھی کہ وہ چند روز بعد یورپ کے محاذ پر جا رہا ہے۔

جب بیچاری کٹّو کے ہاں آرتھر بولٹن کی ہم شکل سو فیصدی گوری بچی پیدا ہوئی تو خلاف توقع مس رچمنڈ نے کٹّو سے کوئی باز پرس نہیں کی۔ انھیں معلوم تھا کہ کٹّو آوارہ نہیں۔ یوں بھی وہ ان کی وفادار خانہ زاد ملازمہ تھی۔ لڑکی کی پیدائش سے مس رچمنڈ کو اپنی ویران زندگی کچھ بھری بھری سی دکھلائی دینے لگی۔ اکثر وہ سوچا کرتی تھیں کہ وہ اس گیسٹ ہاؤس کے لئے

کیوں جان کھپاتی ہیں، کس کے لیے پیسہ جوڑتی ہیں۔ اب یہ پیاری بچی خدا نے ان کے لئے بھیج دی تھی۔

مس ریمنڈ کو خیالی پلاؤ پکانے اور تھیٹر رچانے کا شوق بھی تھا۔ یوں بھی وہ عام مڈل کلاس انگریز عورتوں کی طرح بڑی زبردست اسنوب (SNOB) تھیں۔ انھوں نے گیسٹ ہاؤس میں آنے والے مہمانوں کو سنانے کے لئے اس بچی کے متعلق ایک افسانہ تراشا۔" اس کے باپ کرنل آرتھر بولٹن برلن کے محاذ پر لاپتہ ہوگئے۔ بے چارہ آرتھر"۔ وہ آہ بھر کر کہتیں اور مہمان کو بریکفاسٹ کھلاتی جاتیں۔ آرتھر بے چارہ میرا فرسٹ کزن تھا۔ انڈیا آنے سے قبل اس نے ایک آئرش لارڈ کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ دونوں پشاور چھاؤنی میں تھے۔ ادھر آرتھر فرنٹ پر گیا اور بے چاری برجٹ بچی کو جنم دیتے ہوئے ملٹری ہسپتال میں ختم ہوگئی۔ آرتھر نے اپنے NEXT OF KIN کی حیثیت سے میرا پتہ دے رکھا تھا۔ ریڈ کراس والوں نے بچی کو میرے پاس بھیج دیا۔"

مسوری کے ایک انگریزی گرجاگھر میں بپتسمہ دلاتے وقت مس ریمنڈ نے رجسٹر میں بھی بچی کے باپ کا نام کرنل آرتھر بولٹن لکھوا دیا تھا اور دونوں انگلیوں کا کراس بنا کر دل میں کہا تھا — "SO HELP ME GOD" —

ہندوستان آزاد ہوا اور مسوری انگریزوں سے اچانک خالی۔ سو مس ریمنڈ کے جو بڑھاپے میں برطانیہ جا کر برتن دھونے اور جھاڑو دینے کو تیار نہ ہوئیں۔ خلافِ امید ان کا ہوٹل (جس پر سے انھوں نے "یوروپینز اونلی" کا بورڈ اتار دیا تھا) اب زیادہ چلنے لگا کیوں کہ آزاد ہندوستانی ایک "انگلش گیسٹ ہاؤس" میں ٹھیرنا بہت فخر کی بات سمجھتے تھے۔ پہلے یہاں معمولی حیثیت کے انگریز ٹکتے تھے۔ اب اونچے طبقے کے متمول ہندوستانی قیام کرنے لگے۔

کیتھرین بولٹن عرف کیٹی جو اپنی چرچلاہٹ کی وجہ سے "چھوٹی کٹو" کہلانے لگی تھی، ایک کانونٹ اسکول جاتی تھی۔ آزادی کے بعد سے جس میں ہندی اور سنسکرت بھی پڑھائی جانے

لگی تھی ۔ ان مضامین کے استاد ایک بے حد چلتے پرزے قسم کے مقامی نوجوان تھے۔ کیٹی ان سے ہندی پڑھتی تھی اور آزاد ہندوستان کے آزاد بچے ابھی اس کی گوری چمڑی کی وجہ سے مرعوب رہتے تھے ۔

مسوری کے وہ انگریز پادری صاحب جنھوں نے کیتھرین کو بپتسمہ دیا تھا آسٹریلیا جا بسے تھے لیکن مس رچمنڈ سے خط وکتابت کا سلسلہ رکھتے تھے۔ کیٹی کی پندرہویں سالگرہ پر انھوں نے مس رچمنڈ کو لکھا۔ میں کیتھرین کے متعلق فکر مند ہوں ۔ ہندوستان میں اس کا مستقبل کیا ہے ؟ کیا تم چاہوگی کہ وہ کسی ہندو HEATHEN سے شادی کرلے ؟ بہتر ہوگا کہ تم اسے یہاں لے آؤ ۔

مس رچمنڈ نے اس معاملے پر غور کیا۔ ہندوستان میں اس حسین اینگلو انڈین لڑکی کا مستقبل کیا ہے ؟ ٹیلی فون آپریٹر ۔۔ آفس سکریٹری یا خدانخواستہ کال گرل۔ یا کیبرے ڈانسر۔ ابھی سے مسوری میں کیٹی بولٹن کی تیزی طراری کا چرچا ہونے لگا تھا اور جس روز اسکول کے چلتے پرزے ہندی ٹیچر نے اس کے ساتھ چھیڑ خانی کی کوشش کی اور اس کی مدافعت پر اسے "نخرے والی دوغلی چھوکری" پکارا ، وہ آگ بگولہ ہوکر گھر لوٹی اور مس رچمنڈ کو قصہ سنایا ۔ اس سرِ شام مس رچمنڈ نے اچانک فیصلہ کرلیا۔ وہ رات انھوں نے جاگ کر گذاری ۔ وطن چھوڑنا آسان نہ تھا اور اس اجنبی سرزمین میں ان کا کیا حشر ہوگا مگر کیتھرین کا مستقبل مقدم تھا۔ صبح کو انھوں نے کٹو اور فضل مسیح کو بلایا۔ وہ دونوں آکر دروازے میں کھڑے ہوگئے۔ مس سیلیا صوفے پر آتشدان کے پاس بیٹھی نٹنگ کر رہی تھیں ۔ کیٹی ریڈیو گرام کے پاس موجود تھی ۔ مس سیلیا رچمنڈ نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"کٹو ہم آسٹریلیا جارہا ہے۔ کیٹی بابا ہمارے ساتھ جائے گا۔ ہمارا پیکنگ شروع کردو"

کٹو اور فضل مسیح بھونچکے رہ گئے ۔ اچانک یہ دونوں گوری عورتیں ان کو اجنبی دیونیاں سی نظر آئیں ۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ چند لمحوں بعد کٹو نے ناک سڑکتے

ہوئے مضبوطی سے جواب دیا۔ میم صاحب کیٹی ہمارا پیٹ کا اولاد ہے۔ ہم اسے نہیں جانے دے گا۔ ہمارا بھائی بھی اس کی صورت دیکھ کر جیتا ہے مس صاحب۔ ہم نے اس کے مارے شادی نہیں کیا کہ سوتیلا باپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔"

"خاموش —" بڑھیا نے چلا کر کہا "تم اپنا اوکات بھول رہا ہے کٹو۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ کیٹی تمہارا اولاد ہے۔ تمہارا یہ مجال کہ تم اتنا بڑا بات بولو —؟"

کٹو گم صم رہ گئی۔ مس صاحب سے اسے یہ امید نہ تھی۔ مس صاحب نے اس سے ایسی تلخ اور بے رحم بات کبھی نہیں کی تھی۔ وہ دھم سے فرش پر بیٹھ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔

کیٹی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بھی آسٹریلیا جانے کے لئے بیقرار تھی۔ عاقبت اندیش مس رچمنڈ اسے چند روز قبل بتلا چکی تھیں کہ کرنل بولٹن فرضی ہستی ہیں۔ کارپورل بولٹن اس کا باپ اور کٹو اس کی ماں ہے مگر اس اصلیت کو پوشیدہ رکھنے ہی میں تمہاری خیریت ہے۔ کیٹی نے جو جہد للبقا کے اصولوں کو جبلی طور پر پہچانتی تھی اس نصیحت کو گرہ میں باندھ لیا تھا۔

اب مس رچمنڈ نے ذرا سمجھانے کے انداز میں کہا "کٹو تم ایک دم پاگل ہائے۔ تم سوچنا مانگتا۔ ٹھنڈے دل سے۔ ادھر ہمارا ڈیتھ کے بعد کیٹی کا فیوچر کیا ہوگا؟ مسوری میں تھوڑا بہت نیٹو لوگ اب بھی جانتا کہ وہ تمہارا چھوکری ہے۔ اگر یہ بات سب کو معلوم ہو گیا تو؟ انڈیا میں کاسٹ سسٹم کا اتنا زور ہے۔ اس سے شادی کون بنائے گا؟ پھر ادھر اینگلو چھوکری کا کیا عزت ہے؟ لوگ ایک طوائف کے مافک سمجھتا۔ کیا تم مانگے گا کہ تمہارا بیٹی ہوٹلوں میں ایک ایک کپڑا اتارنے والا ناچ کرے؟ یا تم میونسپلٹی کے جمعدار سے اس کی شادی کرے گا؟ سوچنا مانگتا۔ بولو —؟"

کٹو لاجواب رہ گئی۔

مس ریمنڈ نے گیسٹ ہاؤس ایک سندھی کے ہاتھ بیچا جس نے فوراً لاؤنج میں سے جینز س اور میری کو اتار کر گرونانک، شنکر پاروتی اور "ریمنڈز" کی جگہ باہر "دی نیو ہمالیہ ویجی ٹیرین ہوٹل" کا بورڈ لگا دیا لیکن پرانا اسٹاف مع کٹوآیا برقرار رکھا۔ کٹو اور فضل مسیح روتے دھوتے مس ریمنڈ اور کیتھرین کو خدا حافظ کہنے دہرہ دون ریلوے اسٹیشن تک آئے۔ ٹرین چل دی۔ فضل مسیح کنٹوپ اور بھورا دگلہ پہنے خالی پلیٹ فارم پر کھڑا حسب عادت خلا کو تکتا رہا۔

(۳)

سڈنی ایرپورٹ پر اتر کر مس ریمنڈ نے چاروں طرف دیکھا اور مسکرائیں۔ وہ بالآخر ایک سفید ملک میں موجود تھیں۔ (گو وہ نجیب الطرفین انگریزنی تھیں مگر پیدا گورکھپور میں ہوئی تھیں اور ایک بار صرف چند ماہ کے لئے انگلستان گئی تھیں) اب وہ اور کیٹی منتظر رہیں کہ قلی آکر ان کا اسباب اٹھائیں گے مگر کسی نے ان کا نوٹس نہ لیا۔ آخر دوسروں کی دیکھا دیکھی کیتھرین نے ایک ٹھیلے پر سامان لادا۔ جب مس ریمنڈ نے ٹھیلا دھکیلنا شروع کیا اچانک ان کا دل اندر سے ٹوٹ سا گیا۔

ریورنڈ سگمور باہر برآمدے میں منتظر تھے۔ اپنے گھر لے گئے۔ مس ریمنڈ کو اپنے گرجا کے متصل بازار میں سبزی ترکاری کی ایک مختصر سی دوکان اور فلیٹ خریدوا دیا۔ دوسرے ہفتے سے ہی مس ریمنڈ دوکان پر ترازو کے پاس بیٹھنے لگیں۔ وہ سڈنی کی ورکنگ کلاس میں شامل ہو چکی تھیں۔

کیتھرین اسکول میں داخل کر دی گئی۔ بہت جلد اس نے پر پرزے نکالے۔ "ڈیٹ" کرنے لگی۔ رات کو دیر سے گھر لوٹتی۔ وکٹورین اور ہندوستانی اخلاقیات کی پروردہ مس سیلیا ریمنڈ اس کو ڈانٹتیں پھٹکارتیں، دونوں میں خوب جھائیں جھائیں ہوتی۔ دونوں کی زندگی

ایجرن ہوگئی۔ ایک پینسٹھ سالہ اپنی جگہ سے اکھڑی ہوئی مجرد انگریز عورت اور ایک سولہ سالہ دوغلی نسل کی لڑکی جس کا کوئی بھی واضح پس منظر نہ تھا۔ نقلی پھوپھی بھتیجی کا یہ بڑا غمناک جوڑا تھا۔

مس رچمنڈ ہڈنی کی جلاوطنی اور تنہائی زیادہ نہ جھیل پائیں۔ کیتھرین اٹھارہویں سال میں تھی جب وہ چل بسیں۔ ریورنڈ سگ مور کیتھرین کے گارجین تھے۔ انھوں نے اسے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں ڈال دیا۔ چند ماہ بعد وہ وہاں سے بھاگ گئی۔ وہ اپنی ماں اور ماموں کو بھولے سے بھی خط نہیں لکھتی تھی۔ کچھ عرصے بعد پادری صاحب بھی مرگئے۔ اس کے بوائے فرینڈز کو معلوم تھا کہ خاصی پیسے والی لڑکی ہے۔ جوں ہی وہ قانونی طور پر بالغ ہوئی، انھوں نے اس کا روپیہ اڑانا شروع کیا۔ وہ بےحد حسین تھی اور ایکٹریس بننا چاہتی تھی مگر آسٹریلیا میں نہ باقاعدہ اسٹیج تھی نہ سنیما انڈسٹری۔ ایک لفنگے نے صلاح دی کہ ہالی ووڈ پہنچنے یا لندن کی شو بزنس میں شامل ہونے کی پہلی سیڑھی نائٹ کلب ہیں۔ چنانچہ کیتھرین نے کیبرے ناچنا سیکھا۔ اس دوران میں وہ اپنی دوکان بھی فروخت کرچکی تھی اور اپنے ترکے کا سارا روپیہ تمام کرچکی تھی۔ پیسہ اس کے ہاتھ میں ٹکتا ہی نہ تھا۔

اسی طرح آوارہ گردی کرتی وہ ہانگ کانگ، سنگاپور، کوالالمپور نائٹ کلب سرکٹ میں پہنچ گئی۔ کہیں وہ کیبرے ناچی، کہیں وہ نائٹ کلب ہوسٹس بنی لیکن یہاں ترچھی آنکھوں والی اینگلو چائینیز طوائفوں کا کمپی ٹیشن بہت سخت تھا اور وہ بہرحال پیشہ ورگشتی نہیں تھی۔ "کرنل آرتھر بولٹن" کی بیٹی تھی۔ اس فرضی کرنل نے اسے قدم قدم پر وقار سے چلتے رہنا سکھایا۔ کبھی کبھار اسے اپنی سخت گیر نقلی پھوپھی سیلیا رچمنڈ یاد آجاتیں، کبھی ماں اور ماموں اس کے سامنے آن کھڑے ہوتے۔ وہ آنسو پونچھ کر دوسرا سگریٹ سلگا لیتی اور اپنی زندگی کے انقلابات پر متحیر رہتی۔ ساؤتھ ایشیا کے نائٹ کلب سرکٹ نے اسے بہت سمجھ دار اور افسردہ دل بنا دیا تھا۔ کرپٹ سیاستدانوں اور ان کے عیاش بیٹوں کی دی ہوئی STAG

پارٹیوں میں وہ ناچ چکی تھی اور جہانِ سوئم کے اس حصے کے سیاسی اور اخلاقی حالات سے بخوبی واقف تھی اور ہر ملک اور ہر شہر کے ہوٹلوں کے کمروں میں سرہانے ایک ہی بائبل رکھی ملتی اور اس مقدس صحیفے کا کوئی فائدہ اسے نظر نہ آیا تھا۔ چینی ریسٹورانوں کے عقبی کمروں میں بیٹھی اگربتیوں کے مرغولوں میں گھری چھوٹے چھوٹے پیروں والی پُر اسرار چینی بُڑھیاں جو قسمت کا حال بتاتی تھیں، کوئی گتھی اس کے لئے نہ سُلجھا پائیں۔

جکارتا کے ایک چینی ریسٹوران میں اسے ایک دلکش سا ڈچ آدمی ملا۔ وہ چالیس کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ وِگ لگاتا تھا اور اس نے سوٹ پر ایک چوغہ سا پہن رکھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ ایک ڈچ صوفی ہے اور پیرس والے مرشد عنایت خاں کا مرید۔

"میں انڈونیزین صوفی ازم کے اسرار سیکھنے کے لئے ایمسٹرڈم سے یہاں آیا ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھیں DUTCH SENSITIVES کہا جاتا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کی چھٹی حس بہت زیادہ بیدار ہوتی ہے۔"

چوپ سوئی کھاتے کھاتے اچانک اس نے کہا تھا "تمھارا باپ زندہ ہے۔"

وہ چونک پڑی۔

"وہ ایک روز ضرور تم کو ملے گا۔ وہ بہت بڑا آدمی ہے۔"

"واقعی ـــ؟ بڑا آدمی کس طرح ـــ؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا مگر وہ بہت عظیم آدمی ہے۔"

اس کا مطلب ہے وہ واقعی کرنل تھا اور اب شاید برٹش آرمی میں جنرل ہو۔ یہ سوچ کر وہ بیحد مسرور ہوئی۔ اس کے آدھے دکھ دور ہو گئے۔ اس نے خود کو بہت محفوظ محسوس کیا۔

اس ڈچ صوفی کی موجودگی نے بھی اسے بہت سکون بخشا۔ اسی صوفی ازم اور E.S.P. اور احساس تحفظ کے چکر میں وہ اس پُر اسرار آدمی کے ساتھ جکارتا کی ایک مسجد میں پہنچ گئی۔ ایک پتلی چگی داڑھی اور چندھی آنکھوں والے انڈونیزین "شیخ" نے اسے کلمہ پڑھایا۔ اس کا

نام حلیمہ وتی رکھا اور اس کا نکاح اس ولندیزی مسلمان محمد معین کوٹ سے ہوگیا۔ اس نے رجسٹر پر اپنا نام لکھا دیکھا اور بڑی طمانیت محسوس کی ۔ "کیتھرین حلیمہ وتی بنت کرنل آرتھر بولٹن ۔"

وہ ڈچ نومسلم بڑا پکا مومن تھا۔ اس نے حلیمہ وتی کو حکم دیا کہ ناچ گانا موقوف کرے لیکن جکارتا کے جس ہوٹل میں وہ کیبرے کرتی تھی، اگر آپ وہاں ناچیے نہیں تو کمرے کا کرایہ اور سارے بل ادا کیجیے۔ چونکہ محمد معین کوٹ کے منی آرڈر ایمسٹرڈیم سے آنے میں ذرا تاخیر تھی لہذا کیتھرین کوٹ نے ایک بار پھر اپنا جمع جتھا خرچنا شروع کیا۔

جکارتا کے اس ہوٹل میں رہتے کوئی پندرہ روز ہوئے تھے جب صبح اس کی آنکھ کھلی تھی تو وہ ڈچ صوفی غائب تھا۔ کیتھرین کی ہیرے کی انگوٹھیاں اور سچے موتیوں کی مالا اور بُندے جو سیلیا رچمنڈ اس کے لئے چھوڑ گئی تھیں وہ بھی غائب تھے اور باقی ماندہ نقدی بھی۔ سرہانے میز پر موٹی بائیبل البتہ اسی طرح رکھی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر پلاسٹک کا ایک خالی کپ۔ گذشتہ شب ہی اس ادب نواز اور روحانی ولندیزی نے باتوں باتوں میں ایک امریکن افسانہ نگار کا ایک جملہ دہرایا تھا کہ تم ساری دنیا گھوم لو۔ آخر میں تمھیں پتہ چلے گا کہ ساری دنیا "HOLIDAY INNS" اور پلاسٹک کے پیالوں سے بھری ہوئی ہے اور گھر واپس جانا ضروری ہے۔

چنانچہ کیتھرین کوٹ دھکے کھاتی جکارتا سے اپنے گھر سڈنی واپس پہنچی۔ اس کی عمر ڈھل رہی تھی اور حُسن زائل ہونے والا تھا۔ یہاں اب اسے بس کنڈکٹر کی ملازمت ہی مل سکی۔

جہد للبقا کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ انسان کبھی ہار نہیں مانتا۔ چنانچہ بس کے ٹکٹ کاٹتے کاٹتے وہ اب بھی دن کے خواب دیکھا کرتی۔ اگلے اسٹاپ پر شاید کوئی سپنوں کا شہزادہ کیوں کہ کیا پتہ اس کہرے کے پیچھے کیا ہے۔

(۴)

راجہ سر زیندر ناتھ کے جد امجد ایک غریب قنوجی برہمن جیوتشی تھے جن کی کسی پیش گوئی سے خوش ہو کر شہنشاہ جہانگیر نے کالی ندی کے کنارے جاگیر بخش دی تھی۔ موجودہ راجہ صاحب کٹر مذہبی اور سادھو سنتوں کے معتقد آدمی تھے۔ ریاست کے خاتمے کے بعد نئی دہلی میں اپنی عالی شان کوٹھی میں رہتے تھے۔ ایک بڑا کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ اسی کاروبار کے سلسلے میں ان کے فرزند اکبر (جو پہلے یووراج شیلندر ناتھ جی کہلاتے تھے اب محض مسٹر ایس۔ این۔ باجپئی تھے) جاپان، سنگاپور، آسٹریلیا کے دورے پر نکلے تھے۔ یووراج ذرا بھولے سے نوجوان تھے۔ پہلی بار ملک سے باہر آنے کا اتفاق ہوا تھا لہٰذا آسٹریلیا میں مبہوت تھے۔

کرسمس سیزن کی وجہ سے سڈنی میں بہت چہل پہل تھی۔ اس روز ایسا ہوا کہ اوپیرا ہاؤس کی طرف سے چلے تو یاد آیا دوپہر کو آسٹریلیا انڈیا ٹسٹ میچ ہے۔ ایک راہگیر سے راستہ پوچھ کر کرکٹ اسٹیڈیم کی طرف جانے والی بس پر چڑھ گئے۔ کھڑکی کے پاس جا بیٹھے۔ بس میں بھانت بھانت کی صورتیں سب ایک سے ایک حسین، لبنانی لڑکیاں، اطالوی مہاجر، گول چہروں والے آسٹریلین۔ بس کنڈکٹر نے نازک گورا سا ہاتھ بڑھایا۔ انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو آنکھیں چکاچوند۔ ایسا حسین جگمگاتا چہرہ واقعی رخ روشن، چودھویں کا چاند، اتنا حُسن بھی ممکن ہے۔ وہ پری جمال بھی ایک ہندوستانی کو دیکھ کر ذرا یگانگت سے مسکرائی۔

راجکمار نے سُن رکھا تھا گوری میم ہنسی تو پھنسی۔ اب ذرا بے خوفی سے اس سے آنکھیں چار کیں ہزار جان سے عاشق ہوئے۔

جو بندے پہلی بار گوروں کے دیس جاتے ہیں اگر وہ پہلے چھ ماہ کے اندر اندر کسی میم سے بیاہ نہ کریں تو سمجھو بچ گئے۔ ورنہ نہیں۔ راجکمار شیلندر کو تو آسٹریلیا آئے محض

دس دن ہوئے تھے۔

بس کنڈکٹر ٹکٹ دے کر اسی طرح مسکراتی ہوئی آگے چلی گئی۔ پھر اس نے ان کا نوٹس نہ لیا مگر راجکمار مستقل مزاج آدمی تھے۔ دوسرے روز پھر اسی وقت اسی بس پر چڑھے۔ چار روز کے تعاقب کے بعد کامیاب رہے۔ تعارف کرایا پرنس شیلندر ناتھ جی آف انڈیا۔

لفظ "پرنس" سے وہ حور ارضی متاثر نظر آئی کہ بچپن سے مسوری میں راجکماروں اور نواب زادوں کو دیکھتی آئی تھی اور اگر سڈنی کی ایک بس میں ایک شخص خود کو راجکمار کی حیثیت سے متعارف کرے تو وہ جہاں دیدہ کیبرے ڈانسر پہچان سکتی تھی کہ وہ بندہ نقلی راجکمار نہیں۔

پری شیشے میں اترنے لگی۔ شام کے لئے اپوائنٹمنٹ، رات کو شمعوں کی روشنی میں ڈنر، رقص، ساحل پر چہل قدمی، خریداری، اعلیٰ خاندان، برطانوی لڑکی، کرنل کی بیٹی، لارڈ کی نواسی، کیا مضائقہ ہے۔

ہمارے نواب راجہ لوگوں کا قاعدہ تھا کہ کم از کم ایک جونیر بیگم یا جونیر رانی یوروپین رکھتے تھے۔ عموماً وہ لندن کی بار میڈ ہی ہوتی تھیں۔ لیکن اب سوتنتر بھارت کے مکھیہ سماچار یہ تھے کہ رجواڑے سماپت۔ حرم گیت اور ہندو جاتی پر کیول ایک دواہ کا قانون لاگو۔ اس کے باوجود آزاد ہندوستان میں بھی انگریز یا امریکن عورت سے شادی کرنے میں جو اسنوب ویلیو (SNOB VALUE) مضمر تھی شیلندر ناتھ جی اس سے واقف تھے۔ پہلی پورانی خود راجکماری تھیں۔ بے چاری بیاہ کے دوسرے سال ہی سرگباش ہوئیں۔

جب انہوں نے کیتھرین کوٹ کو پرپوز کیا اس کے دوسرے روز ہی کیتھرین نے خود کو سڈنی کے ایک آشرم میں موجود پایا۔ جکارتا کی مسجد میں اس کا نکاح پڑھایا گیا تھا۔ یہاں پنڈت نے ویدک منتر پڑھے۔ شیلجا دیوی اس کا نام رکھا گیا۔ شیلندر کی مناسبت سے بنگالی

پنڈت نے مسکرا کر سمجھایا۔

"اکھنڈ سوبھاگیہ وتی۔ یوورانی راجیہ لکشمی شیلجا دیوی جی بدھائی ہو"۔ اس کے کند ذہن سے نئے شوہر نے جو عمر میں اس سے کافی چھوٹا بھی تھا باچھیں کھلا کر اس سے مصافحہ کیا۔ شادی کے رجسٹر پر اس کے باپ کا نام لکھا گیا ___ کرنل آرتھر بولٹن آف لندن اینڈ پشاور کنٹونمنٹ۔

(۵)

کارپورل آرتھر بولٹن میرٹھ چھاؤنی سے سیدھا برلن گیا تھا۔ چند روز بعد ہی جنگ ختم ہوئی اور وہ اپنے فوجی بینڈ کے ساتھ انگلستان میں جگہ جگہ فتح کے شادیانے بجاتا پھرا۔ پھر اسے اس عارضی فوجی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔

آرتھر بولٹن کا باپ جو بکیڈلی سرکس میں جوتوں پر پالش کرتا تھا بیماری میں مر چکا تھا۔ ماں بھی مر چکی تھی۔ آرتھر کو ایسٹ اینڈ کے ایک ڈانس بینڈ میں کام مل گیا۔ شادی نہیں کی۔ کون یہ بکھیڑا پالتا۔ برس گذرتے گئے۔ لقوے نے ایک ہاتھ معذور کر دیا تو ڈرم بجانا القط۔ ہسپتال سے نکل کر چوکیداری کرنے لگا۔ اسی طرح بوڑھا ہو گیا۔ اب بھی پوئیٹری لکھتا جو کہیں نہ چھپ سکی۔ پابندی سے چرچ جاتا۔ جو گوردوارے بننے سے بچ رہے تھے۔ وہ بھی عموماً اسے خالی ڈھنڈار ملتے۔ اردو داں ہونے کی وجہ سے پاکستانی ہندوستانی مزدوروں سے اس کی خوب بنتی تھی۔ ایک سکھ چوکیدار ہی نے اسے ایک پنجابی ملک التجار مسٹر کھوسلہ کی ایک دوکان میں دربان کا کام دلوا دیا۔ عالیشان شو روم نائٹس برج میں تھا۔ وہاں سب لوگ اس نرم مزاج پیارے خبطی سے بوڑھے سے بہت خوش تھے۔

اس روز صبح شو روم پہنچ کر اس نے ہال کی جھاڑ پونچھ کی۔ گاہکوں کے لئے میز پر پڑے رسالوں کو ترتیب سے رکھا۔ اس وقت بمبئی سے نکلنے والے ایک زنانہ میگزین کے سرورق

پر اس کی نظر پڑی۔ COVER GIRL کی صورت نے اسے متوجہ کیا۔ رسالے کے اندر اس حسینہ کی کوٹھی کی آرائش کے بارے میں باتصویر مضمون بسلسلہ انٹیریر ڈیکوریشن۔

آرتھر بولٹن صوفے پر بیٹھ گیا اور جیب سے عینک نکال کر مضمون پڑھنے لگا ——

"یوورانی شیلجا دیوی جی نسلاً انگریز ہیں اور برطانوی ارسٹوکریسی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے والد کرنل آرتھر بولٹن پچھلی جنگِ عظیم میں لاپتہ ہو گئے۔ ان کے نانا ایک آئرش لارڈ تھے۔ راجکماری جی کا بچپن مسوری میں گذرا۔ پھر وہ اپنی پھوپھی لیڈی رچمنڈ کے پاس آسٹریلیا چلی گئیں جہاں انھوں نے بیلے اور پیانو اور انٹیریر ڈیکوریشن کی مہارت حاصل کی ——"

بڈھے آرتھر نے آنکھیں بند کر لیں اور دیر تک ششدر، ساکت و صامت بیٹھا رہا۔

پھر ایک کونے میں جا کر گھٹنوں کے بل جھکا اور دعا میں منہمک ہو گیا۔

نہ جانے کیوں اسے یقین سا تھا کہ کٹو اب بھی مسوری میں موجود ہے اور اسی پرانے پتے پر اگر وہ اسے خط لکھے گا تو اس کا جواب بھی دے گی۔

ایسا ہی ہوا۔ کٹو کا خط آنے پر آرتھر بولٹن نے دوکان کے منیجر سے ایک ماہ کی چھٹی مانگی جو منظور ہوئی۔ اس نے انڈیا ہاؤس جا کر ویزا بنوایا، بنک سے ساری عمر کی جمع پونجی نکال کر ہوائی جہاز کا رٹرن ٹکٹ لیا اور باقی ماندہ رقم سے کٹو اور کیتھرین کے لئے تحفے خریدتا پھرا۔ تحائف کے تھیلے اپنے سالم ہاتھ میں اٹھائے اٹھائے پیدل چلتے چلتے تھک جاتا تو کسی دروازے میں بیٹھ کر دم لیتا اور پھر چلنا شروع کر دیتا۔ ٹرانسپورٹ کے جو پیسے بچائے ان سے داماد کے لئے ایک عدد ٹائی بھی خرید ڈالی۔

○

ٹھیک ایک ہفتے بعد وہ "دی نیو ہمالیہ ویجی ٹیرین ہوٹل" کے شاگرد پیشے کے سامنے کھڑا تھا۔

کٹّو آیا نے اسے سمجھایا "صاحب ہمارا چھوکری ہم کو ایک لیٹر نہیں ڈالا اور بیاہ کر لیا۔ اس کا کیا مطبل ہے؟ یہ مطبل کہ وہ ہم سے مل کر اپنی لائف میں کوئی گڑبڑی نہیں ڈالنا مانگتا۔"

وہ شاگرد پیشے کے آگے ایک پتھر پر بیٹھی اپنے سر میں سرسوں کا تیل ڈال رہی تھی۔ فضل مسیح نزدیک ایک پائن کے نیچے اسی طرح خاموش بیٹھا ہمالیہ کو تک رہا تھا۔ سامنے وادیاں اودے کہرے سے بھر گئی تھیں۔

بڈھے آرتھر نے اپنے سالم ہاتھ سے پائپ سلگایا اور متعجب ہوا کہ یہ جاہل غریب اور دکھی عورت کس قدر شانت تھی۔

"کٹّو! تم کو ذرا غصہ نہیں ــ؟" اس نے متحیر آواز میں دہرایا۔

"گُسّہ کس بات کا صاحب؟ جو کچھ ہمارے ساتھ بیتا ہم نے چھٹی ماں کا لکھا پورا کیا۔"

"چھٹی ماں ــ؟ وہ کون لیڈی ہے؟"

"بمبئی کا ایک بوہری میم صاحب ادھر آیا تھا۔ ہمارا کِسّہ سُن کر بولا "کٹّو بائی! جب بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے چھٹے روز چھٹی ماں آدھی رات کو آ کر اس کا مکدّر اس کے ماتھے پر لکھ جاتی ہے۔ ادھر ہم لوگ اس کو مکدّر کا کھیل بولتے ہیں۔ کرم کے لچھّن۔"

آرتھر غور سے سنتا رہا۔ ابرو اٹھا کر اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور ہنس پڑا۔ کٹّو بولی "اسی سرونٹ کوارٹر کی اس سامنے والی کوٹھری میں چھٹی ماں رات کو آ کر ہمارا کٹّی بابا کے ماتھے پر لکھ گئی تھی کہ وہ رانی بنے گی۔ ہماری بات مان لو صاحب۔ اس سے ملنے مت جاؤ۔"

"کیوں؟"

"بس۔ ہم جو تم کو بولتا ہے۔"

"نائیں کٹّو۔ چھٹی ماں نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ہم اور تم اس سے ملنے دلّی جائے گا۔

دیکھو ہم اس کے لئے ولایت سے کتنے پریزنٹ لایا ہے۔" قریب پتھر پر بیٹھ کر آرتھر نے بڑے شوق اور چاؤ سے وہ شاپنگ بیگ کھولے۔

(۶)

پیلیس کے سامنے مختصر سالان تھا اور پھاٹک کے عین مقابل میں چند قدم کے فاصلے پر اس بیڈ روم کا دریچہ جس کی تصویر بسلسلہ انٹیریر ڈیکوریشن اس زنانہ انگریزی رسالے میں چھپی تھی۔ اتوار کا دن تھا۔ گلابی جاڑوں کی صبح کا سہانا وقت۔ لان پر راجہ صاحب، ان کا منجھلا لڑکا اور چند یوروپین مرد اور عورتیں ایک سوامی جی کی تقریر سننے میں محو تھے۔ یہ ایک نسبتاً نئے سوامی جی تھے جو حال ہی میں انٹرنیشنل گرو سرکٹ میں شامل ہوئے تھے اور ان کے وڑیہتی فرنچ اور جرمن چیلوں کے ساتھ چند روز قبل فرانس سے واپس آئے تھے اور موریہ میں قیام پذیر تھے۔ راجہ صاحب کے ساتھ بریکفاسٹ کرنے کے بعد اب ست چت اور آنند پر بھاشن دے رہے تھے۔ جب ٹیکسی پھاٹک پر آن کر رکی اور تین نفر اس میں سے اترے۔ ایک ذرا پھٹیچر سا انگریز بڈھا سلفرجز کا ایک بیگ اٹھائے، معمولی ساری پہنے ایک غریب دیسی عورت اور کنٹوپ اور دگلہ میں ملفوف جھاڑ جھنکاڑ کھچڑی داڑھی والا ایک باؤلا سا آدمی۔ یہ آدمی جھجھک کر پھاٹک کے ایک ستون کے پیچھے ہی دبک گیا۔ خستہ حال نحیف پادری انگریز نے سہمتی جھجکتی عورت کا ہاتھ تھاما اور اس کے ساتھ لان کی طرف بڑھا۔

راجہ صاحب نے سر اٹھا کر کوفت سے نو واردوں پر نظر ڈالی اور متعجب ہوئے۔ گورکھے دربانوں نے ان اناپ شناپ قسم کے لوگوں کو اندر کیسے آنے دیا۔

غالباً یہ اُول جلُول لوگ JEHOVAH'S WITNESSES ہیں۔ بے ضرر خبطی مشنری جو اتوار کے دن صبح صبح بھلے مانسوں کے گھروں پر پہنچ کر انھیں خبردار کرتے ہیں کہ قیامت

آنے والی ہے۔ یہ لوگ بہت بور کرتے ہیں۔

کرسیوں کے نزدیک آکر انگریز بڈھا ٹھٹھک گیا۔ جب سوامی جی نے پانی پینے کے لئے چاندی کا گلاس اٹھایا فرنگی بوڑھے نے بشاشت سے کہا " گڈ مورننگ فرینڈز!"

وہ اور دیسی عورت چند لمحے اسی طرح کھڑے رہے۔ حاضرین بالکل خاموش تھے۔ سوامی جی کو اپنے بھاشن میں مداخلت بہت ناگوار گذری تھی اور وہ چیں بہ جبیں ہو کر ایک پھول سونگھ رہے تھے۔ مہاراجہ نے ابروے اشارہ کیا بیٹھ جاؤ۔ دونوں بیٹھ گئے۔

"مہاراج آرمبھ کیجئے" راجہ صاحب نے جو سادھو سنتوں کے بیحد معتقد تھے، ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

سوامی جی نے ست اور است پر بھاشن پھر شروع کیا۔ بڈھا آرتھر سر آگے بڑھا کر دھیان سے سننے لگا۔ سوامی جی چند منٹ بعد رکے۔ ایک فرنچ چیلی نے ٹیپ ریکارڈ کا کیسٹ بدلا۔

تب بڈھے انگریز نے ان کو مخاطب کیا "مسٹر گرو! ست اور است پر آپ کے خیالات نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں خود ایک ستیہ پر پرکاش ڈالنے انگلستان سے یہاں آیا ہوں۔ یور ہائی نس۔ میں آپ کی پیاری بہو کیتھرین ـــ" اس نے جیب سے رسالے میں چھپی تصویر کا تراشہ نکال کر نام پڑھا ـــ" اکھنڈ سوبھاگیہ وتی راجیہ لکشمی شیلجا دیوی جی کا باپ ہوں"

"اوہو ـــ واٹ اے پلیزنٹ سرپرائز کرنل ـــ"

راجہ نے دفعتاً مسکرا کر گرمجوشی سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا "کرنل بولٹن! آپ نے اپنی آمد کی اطلاع کیوں نہ دی؟ پہلے کیوں نہ بتایا؟"

"یور ہائی نس!" ـــ بڈھے آرتھر نے گلا صاف کر کے چاروں طرف دیکھا اور فرشتوں والے تبسم کے ساتھ بولا ـــ" کرنل تو میرے خاندان میں سات پشتوں سے کوئی نہیں ہوا۔

میرا باپ موچی تھا۔ ماں باورچن۔ میں آرمی میں ڈرمر بھرتی ہوا تھا، اب دربان ہوں"۔

حاضرین برف کے پتلوں کی مانند منجمد ہو چکے تھے۔ آرتھر نے چاروں طرف دیکھ کر تاسف سے سر ہلایا۔" میرے ساتھ ساری عمر یہی مسئلہ رہا۔ میں خالص سچ بولتا رہا ہوں۔ اور یہاں جب میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مسٹر سوامی سچ کی الوہیت ہی کا درس دے رہے ہیں۔ تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی خرچ کر کے یہاں پہنچا ہوں، اپنی لڑکی سے ملنے۔ غریب آدمی ہوں لیکن اس کے لئے بطور اس کے جہیز کچھ چیزیں بھی لا سکا ہوں"۔ اس نے جھک کر گھاس پر دھرے سلفرجز کے بیگ اٹھائے پھر رکھ دیئے۔۔ مجمع اسی طرح منجمد رہا۔

آرتھر نے پھر بات شروع کی "کیتھرین یقیناً اپنی ماں سے مل کر بھی خوش ہوگی جس سے وہ پندرہ سال کی عمر سے جدا ہے"۔

آرتھر سانس لینے کے لئے رکا۔ کٹو دم بخود اس کو تک رہی تھی۔ ماحول اچانک بےحد غیر حقیقی ہو گیا تھا۔ اصل زندگی میں اس طرح کے واقعات نہیں ہوتے۔ آرتھر پھر گویا ہوا۔ "یہ بیوقوف عورت یہاں آتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ میں نے کہا مار تھا! روشنی سے خائف ہو؟ ستیہ کی روشنی سے مت ڈرو۔ ستیہ۔ حق TRUTH سچ خدا ہے اور ہم سب خدا کے بچّے ہیں۔ کیا تم اپنی پیاری بیٹی سے ملنے کے لئے بیتاب نہیں؟ تو آؤ ہم دتی چلیں اور چل کر ہم اپنی لڑکی سے ملیں۔ کیا کوئی ماں باپ اور ان کی اولاد ایک دوسرے سے ملتے ہوئے جھجھک سکتے ہیں؟ قانون قدرت کے خلاف جا سکتے ہیں؟ ڈرنے کی کیا بات ہے۔ اور یور ہائی نس آپ کی مائیتھولوجی میں ہے کہ لارڈ شیوا جب اپنی سسرال پہنچے تو ان کے مغرور سسر نے ان کی بے عزّتی کی تھی"۔۔۔ آرتھر نے توقف کیا اور کھنکار کر بولا "معاف کیجئے میں نے غلط مثال دی ۔۔۔ مطلب یہ کہ ۔۔۔"

یہ بڈھا قطعی دیوانہ تھا۔ راجہ صاحب نے سوچا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اس عجیب و

غریب اجنبی کو تک رہے تھے۔ ان کے چہرے کی رنگت تیزی سے بدلتی جارہی تھی مگر آرتھر ولٹن نے نہایت اطمینان سے اپنی تعارفی تقریر جاری رکھی۔

"تو یور ہائی نس۔ ابھی جب میں پھاٹک پر پہنچا تو ایک لمحے کے لئے مجھے لگا کہ آپ بھی لارڈ شوا کے سسر کی طرح مغرور ہوں گے مگر اسی وقت آپ کے الفاظ میرے کان میں پڑے۔ آپ مسٹر گرد کے اس ارشاد سے اتفاق ظاہر کر رہے تھے کہ منش کو ہر حالت میں، ہر موقع پر سچ بولنا چاہئے اور سچ کا سامنا کرنے کی ہمت رکھنی چاہئے۔ یہی اصل سدھانت اور گیان ہے۔ اور راجہ صاحب آپ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ میرا نجات دہندہ جیزس کرائسٹ بھی یہی کہہ گیا ہے۔ وہ تو سچ بولتے بولتے سولی پر چڑھ گیا۔ مشہور واقعہ ہے آپ نے بھی سُنا ہوگا ــــ"

منجھلے راجکمار نے محسوس کیا کہ غصیلے راجہ صاحب کا پارہ تیزی سے اوپر چڑھ رہا ہے۔ اور وہ نہ جانے کیا کر بیٹھیں۔ اس نے موقع سنبھالنے کے لئے جلدی سے پوچھا ــــ "آپ لوگ کافی پئیں گے یا چاء ــــ؟"

آرتھر نے مسکرا کر اسے دیکھا "مارتھا کافی؟"

سوامی جی سبزے پر ٹہل رہے تھے۔ منجھلے راجکمار نے کافی بنا کر کٹو آپا کو پیش کی۔ بڈھے آرتھر نے سر ہلایا اور بڑے جوش سے اردو میں بولا ــــ "ہم یہ دیکھ کر بوہت خوش ہوا کہ آپ لوگ چھوٹ چھاٹ بھی نہیں کرتا ہائے ــــ ہم سب خدا باپ کا اولاد ہائے۔ جیزس نے بولا کہ میرے باپ کے محل میں سب کے لئے کمرہ ہائے ــــ یور ہائی نس۔ ہمارا لڑکی کی ماں کا ہم سے شادی بھی نہیں ہوا۔ ہم کو مالوم بھی نہیں تھا کہ مارتھا کیتھرین کو جنم دیا۔ ۲۵ سال بعد ہم نے میگزین میں اس کا تصویر دیکھا ــــ یہ سب خدا کا قدرت کا کھیل ہائے ــــ مارتھا بڑا بہادر عورت ہائے۔ اب تک آیا گیری کرتا مسوری میں۔ بڑا نیک عورت ہے۔ سچا کرسچین۔ اس کا ماں باپ بھی سچا کرسچین تھا۔ وہ بھی بہت غریب لوگ تھا۔ جھاڑو دیتا تھا غسل خانے

صاف کرتا تھا۔ جیزس نے بولا غریب مسکین لوگ ہی خدا کی آسمانی بادشاہت کا وارث ہے۔ آپ کا مسٹر گاندھی بھی یہی بات بولتا تھا۔ دہلی میں بونگی کولونی میں رہتا تھا۔۔ ہمارا اکٹو بھی بونگی ہائے۔ یہ بھی آسمانی بادشاہت میں ضرور جائے گا ـــــ"

راجہ صاحب جو ٹکٹکی باندھے بڈھے کو گھور رہے تھے، انھوں نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور زور سے چیخے۔ راجہ صاحب بدمزاج تھے مگر ساری زندگی کسی نے ان کو اتنے زور سے دہاڑتے نہیں سنا تھا۔ ان کی اس خوفناک چیخ سے دہل کر سب ان کی طرف لپکے۔ راجہ صاحب کو چکر آگیا اور انھوں نے آنکھیں بند کر کے سر جھکا لیا۔ ان کو غش آرہا تھا۔ وہ دل کے مریض تھے۔

(۷)

کیتھرین اس وقت بیڈ روم کے دریچے سے سارا منظر دیکھ رہی تھی جو اس جگہ سے ایک اسٹیج کے سیٹ کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ زندگی ناقابل یقین تھی۔ صبح بریکفاسٹ کی میز پر جب اس کا تعارف سوامی جی سے کرایا گیا تھا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو پہچان گئے تھے۔ سوامی جی وہی مسوری اسکول کے سابق ہندی سنسکرت ٹیچر تھے جنھوں نے اس سے چھیڑ خانی کی تھی جس کی وجہ سے مس رچمنڈ نے آسٹریلیا ہجرت کرنے کا اچانک فیصلہ کیا تھا۔ آسٹریلیا روانگی سے ذرا قبل ہی معلوم ہوا تھا یہ حضرت اسکول کا روپیہ غبن کر کے ایک پہاڑی لڑکی سمیت چمپت ہو گئے تھے۔ جب بھی نہایت تیز طرار، چرب زبان، لسّان آدمی تھے۔

اس وقت بریکفاسٹ کے بعد موقع پا کر انھوں نے اپنی سابق شاگرد سے کہا "دیکھو جی چھوٹی کتھو ـــ میں نے بیس سال کی بڑی محنت سے ولیسٹ میں اپنا یہ کیریر بنایا ہے۔ وہاں سوامیوں کا کمپی ٹیشن بہت سخت ہے اس کے باوجود اس وقت یورپ اور امریکہ میں میرے اٹھارہ آشرم ہیں اور ہزاروں چیلے۔ تم میرا بھانڈا نہ پھوڑو۔ میں تمھارے

بارے میں تمھاری سسرال، اس قدامت پرست رائل فیملی کو یہ نہ بتاؤں گا کہ تم مسوری کی کٹّو آیا کی لڑکی ہو۔" ان کی یہ سرگوشی سنتے ہی کیتھرین کا رنگ فق ہوگیا تھا اور وہ آکر اپنے کمرے میں چھپ گئی تھی۔

سوامی جی نے باہر لان پر جاکر اپنا بھاشن شروع کر دیا تھا۔ لیکن ہونی اپنی بنسی بجا چکی تھی۔ ایک ٹیکسی آن کر رکی اور اس نے اپنی ماں کو اترتے دیکھا اور اس کا نیم مجنوں ماموں اور پھر ایک سنکی سا انگریز بوڑھا۔ وہ جاکر لان پر بیٹھ گئے اور کیتھرین نے اپنے اس ناقابل یقین باپ کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا۔

مس سیلیا رچمنڈ کو ایک مرتبہ گیسٹ ہاؤس میں مقیم ایک دہلوی بیگم صاحب نے باؤلی ہنڈیا پکانی سکھائی تھی۔

زندگی بھی دیوانی ہانڈی تھی جو کھدبد پکے جا رہی تھی اور اب اچانک اس میں ابال آگیا تھا۔

دہشت سے لرز کر اس نے سامنے دیکھا۔ پھاٹک پر اس کا پاگل ماموں کھمبے کی طرح استادہ خلا کو گھور رہا تھا۔ سبزے پر اس کا دیوانہ باپ اس کی زندگی تباہ کرنے پر مصروف تھا۔ اس شخص سے ملنے کی وہ ہمیشہ سے کتنی آرزومند رہی تھی۔ بچپن سے اس کی ماں اور آنٹ سیلیا نے اس شخص کی نیک دلی اور بھولپن کے کتنے قصے سنائے تھے جو محض دو ماہ گیسٹ ہاؤس میں قیام کر کے سب کے من موہ کے چلا گیا تھا۔ شاید قدرت نے اسے پیدا اسی لیے کیا تھا کہ وہ اچانک کہیں سے ظہور میں آئے، زندگیوں کے رخ بدلے اور غائب ہو جائے۔ ناقابلِ یقین۔ ناممکن۔ اور کیا نیکی اور حق پرستی دراصل تباہ کن ہوتی ہے؟

اس نے آنکھیں پھاڑ کر سامنے "اسٹیج" کے کرداروں کو دیکھا جو ایک کومک اوپیرا کا منظر معلوم ہو سکتا تھا اگر اتنا بھیانک نہ ہوتا۔ برہمن راجہ صاحب جن کو اس انکشاف پر کہ ان کی بڑی بہو بھنگن کی اولاد ہے، فوراً غش آگیا تھا۔ وہ چار یوروپین جو جھاٹھکنی

ماما سے بچنے کے چکر میں ایک مہا ٹھگ سوامی کے پالے پڑ گئے تھے۔ اور وہ بوگس "گوڈمین" جو اب راجہ صاحب کو ہوش میں لانے کے لئے منتر پڑھ رہا تھا اور اس کی بے چاری ماں جو ساری عمر روتی رہی تھی اور اب بھی رونے کے سوا اس کے بس میں کچھ نہ تھا اور اس کا باپ غریب خستہ حال، ایک ہاتھ سے معذور جو جانے کس طرح پیسے اکٹھے کر کے اور اس کا جہیز لے کر سات سمندر پار سے آیا تھا اور اب ہکا بکا سب کے چہرے تک رہا تھا۔ جیسے کوئی احمق فرشتہ غلط جگہ پر آنکلا ہو ــــــ دفعتاً کیتھرین کے دل میں ترحم اور محبت اور خون کے جوش کا ایک ریلہ سا آیا اور اس کا جی چاہا وہ بھاگتی ہوئی باہر جائے اور اپنے جھکی نیم پاگل سڑی باپ، مصیبت زدہ ماں اور پیارے ماموں سے جا کر لپٹ جائے۔ اس محل اور اس ارسٹوکریٹک برہمن خاندان اور دولت مند شوہر کو خیرباد کہے اور ان بے مایہ پیارے بھولے دیوانے لوگوں کے ساتھ چلی جائے کیوں کہ جہاں یہ لوگ رہیں گے وہی بالآخر اس کا گھر ہوگا۔ کہ دنیا HOLIDAY INNS اور پلاسٹک کے پیالوں کے علاوہ سرخ چھتوں والے سہ منزلہ HEINZ اسٹائل مکانوں اور چاندی کے گلاسوں سے بھی بھری ہوئی ہے۔ اور اسے اپنا گھر کہیں نہیں ملا۔ کیا وہ سچ مچ اکھنڈ سوبھاگیہ وتی راجیہ لکشمی شیلجا دیوی جی ہے؟ وہ اپنی کھال کے اندر محض کیتھرین بولٹن ہے اور کرنل بولٹن اور کارپورل بولٹن کے جس CONFLICT نے اسے ہمیشہ مضمحل رکھا تھا آج بالآخر وہ بھی حل ہو چکا ہے۔ وہ باہر جا کر ڈرامائی انداز سے اعلان کرے گی ــــــ ڈیڈی ــــــ ماما ــــــ لو میں آگئی۔ میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔

وہ ہمت کر کے دروازے کی طرف بڑھی لیکن کواڑ کھولتے ہوئے اس کی نگاہ اپنے ہیرے کے کنگن سے ٹکرائی۔ سامنے دھوپ میں اس کی ذاتی مرسیڈیز چمکی اور اسے یاد آیا کہ گیارہ بجے اسے گولف کلب پہنچنا ہے۔ کیا یہ سب پل کی پل میں غائب؟

مرمریں غسل خانے میں سے شاور کی آواز آرہی تھی۔ دوسرا خیال۔ اس خوفناک

انکشاف کے بعد اس کا شوہر اسے خود ہی چلتا نہ کر دے گا؟ اس سے بہتر ہے باعزت طریقے سے خود ان لوگوں کے ساتھ چلی جاؤں۔ اسے چکر آیا جیسے وہ ڈوبتے جہاز پر کھڑی تھی۔ اس نے دروازے کا سہارا لیا۔ بچنے کے لئے ہر ممکن کوشش لازمی ہے جہد للبقا کا پہلا اصول۔ اس کا کم عقل شوہر تولیہ کا ڈریسنگ گاؤن پہنے غسل خانے سے باہر نکلا۔ یہ باہر کیسا شور ہو رہا تھا؟ اس نے دریچے کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔ کیتھرین نے ایک گہری سانس بھری اور صاف مضبوط آواز میں بولی "ڈارلنگ! اس رسالے میں وہ تصویر اور مضمون چھپا غضب ہو گیا۔ کوئی بدمعاشوں کی ٹولی آن پہنچی ہے بلیک میل کرنے۔ خود کو میرے ماں باپ بتاتے ہیں تمہارے پتاجی الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں۔ مجھے تو یہ اسی کا شاخسانہ معلوم ہوتا ہے۔ تمہارے والد کے برہمن ووٹ کو توڑنے کے لئے مخالفوں نے ایک ہریجن عورت کو سکھلا پڑھا کر ایک انگریز بڈھے کے ساتھ یہاں بھیج دیا کہ کہے کہ وہ میری ماں ہے۔ یہ بڈھا سی۔ آئی۔ اے۔ ایجنٹ بھی ہو سکتا ہے۔ پولس کو فون کرو ۔۔۔ فوراً ۔۔۔"

راجکمار شیلندر گاؤدی تھا، مگر اتنا نہیں۔ اس نے ابرو اٹھا کر اپنی پری چہرہ یوورانی کو ذرا شک و شبہے کی نگاہوں سے دیکھا۔ کیتھرین کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور وہ خوف سے لرز رہی تھی۔ راجکمار شیلندر اسے اپنے راستے سے ہٹاتا دروازہ کھول کر سیدھا اپنے عالی مرتبت باپ کی طرف لپکا جو ہوش میں آ چکے تھے۔ کیتھرین نے تیر کی طرح غسل خانے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

○

سامنے پھاٹک پر اس کا فاتر العقل ماموں ہاتھ پھیلائے کھڑا سب کی خیر مانگ رہا ہے

کھڑا کبیرا دیر سے مانگے سب کی خیر

2007

ایجوکیشنل بُک ہاؤس ○ علی گڑھ کی مطبوعات

لسانیات

مقدمہ تاریخ زبان اردو ڈاکٹر مسعود حسین خاں ۳۰/۰۰
اردو زبان و ادب 〃 ۱۲/۵۰
اردو کی لسانی تشکیل ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ ۴۰/۰۰
اردو لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری ۱۵/۰۰

اقبالیات

کلیات اقبال اردو (صدی ایڈیشن) ۴۰/۰۰
اقبال معاصرین کی نظر میں وقار عظیم ۵۰/۰۰
اقبال کی اردو نثر ڈاکٹر عبادت بریلوی ۴۰/۰۰
فکر اقبال خلیفہ عبدالحکیم ۵۰/۰۰
اقبال شاعر اور فلسفی وقار عظیم ۲۰/۰۰
شکوہ جواب شکوہ مع شرح ۳/۰۰
بانگ درا (عکسی) علامہ اقبال ۲۵/۰۰
بال جبریل (عکسی) 〃 ۱۵/۰۰
ضرب کلیم (عکسی) 〃 ۱۵/۰۰
ارمغان حجاز (عکسی) ۴/۵۰

غالبیات

دیوان غالب مقدمہ نورالحسن نقوی ۲۵/۰۰
غالب شخص اور شاعر مجنوں گورکھپوری ۳۰/۰۰
غالب: تقلید اور اجتہاد پروفیسر خورشید الاسلام ۴۰/۰۰
اطراف غالب سید عبداللہ ۳۰/۰۰

سرسید

خطابات سرسید احمد خاں عبدالحق ۳۰/۰۰
سرسید اور ان کے نامور رفقاء سید عبداللہ ۳۰/۰۰
انتخاب مضامین سرسید آل احمد سرور ۱۰/۰۰

ادب و تنقید

خواب باقی ہیں (خود نوشت) آل احمد سرور ۱۵۰/۰۰
جرنلسٹ رضا علی عابدی ۱۰۰/۰۰
کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید طارق سعید ۷۵/۰۰
انگریزی ادب کی مختصر تاریخ محمد یٰسین ۷۵/۰۰
ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش عبدالمغنی ۵۰/۰۰
اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل صغیر افراہیم ۸۰/۰۰
اردو ہندی جدید افسانہ طارق چھتاری ۱۰۰/۰۰

اردو ادب کی خواتین ناول نگار نیلم فرزانہ ۱۰۰/۰۰
اسلوبیاتی مطالعے پروفیسر مظفر عباس نقوی ۵۰/۰۰
جدید اردو نظم نظریہ و عمل عقیل احمد صدیقی ۹۰/۰۰
انشائیہ اور انشائیے سید محمد حسنین ۴۰/۰۰
اردو ادب میں طنز و مزاح وزیر آغا ۳۵/۰۰
اردو قصیدہ نگاری ام ہانی اشرف ۲۰/۰۰
اردو ادب کی تاریخ عظیم الحق جنیدی ۱۵/۰۰
اردو ناول کی تاریخ و تنقید علی عباس حسینی ۳۰/۰۰
اردو ڈراما تاریخ و تنقید عشرت رحمانی ۲۵/۰۰
دکنی ادب کی تاریخ محی الدین قادری زور ۱۲/۰۰
آج کا اردو ادب ابواللیث صدیقی ۲۵/۰۰
اردو مثنوی کا ارتقاء عبدالقادر سروری ۱۵/۰۰
اردو تنقید کا ارتقاء ڈاکٹر عبادت بریلوی ۳۵/۰۰
جدید شاعری 〃 ۴۰/۰۰
شاعری اور شاعری کی تنقید 〃 ۵۰/۰۰
غزل اور مطالعۂ غزل 〃 ۳۰/۰۰
فن افسانہ نگاری وقار عظیم ۲۵/۰۰
نیا افسانہ 〃 ۲۵/۰۰
داستان سے افسانے تک 〃 ۲۵/۰۰
آئیے اردو سیکھیں ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ ۱۰/۰۰
اردو کیسے پڑھائیں سلیم عبداللہ ۱۵/۰۰
فن تنقید اور تنقید نگاری نورالحسن نقوی ۵۰/۰۰
پریم چند ایک نقیب صغیر افراہیم ۳۰/۰۰
مقدمہ کلام آتش خلیل الرحمن اعظمی ۲۵/۰۰
انار کلی مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن ۱۲/۰۰
موازنۂ انیس و دبیر مقدمہ: ڈاکٹر فضل امام ۱۵/۰۰
مقدمہ شعر و شاعری مقدمہ: ڈاکٹر وحید قریشی ۱۸/۰۰
امراؤ جان ادا مقدمہ: تمکین کاظمی ۲۰/۰۰
مثنوی گلزار نسیم مقدمہ: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ۱۰/۰۰
مثنوی سحرالبیان 〃 ۱۲/۰۰

فیض

کلام فیض (عکسی) فیض احمد فیض ۲۵/۰۰
نقش فریادی (عکسی) 〃 ۷/۰۰
دست صبا (عکسی) 〃 ۷/۰۰
زنداں نامہ (عکسی) 〃 ۷/۵۰
دست تہ سنگ (عکسی) 〃 ۶/۰۰

سیاسیات و تاریخ

دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن) محمد ہاشم قدوائی ۳۰/۰۰
تاریخ افکار سیاسی (ہسٹری آف پالیٹیکل تھاٹ) 〃 ۳۰/۰۰
اصول سیاسیات (پرنسپل آف پالیٹکس) 〃 ۳۰/۰۰
جمہوریۂ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا) 〃 ۲۰/۰۰
مبادیٔ سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالیٹکس) 〃 ۲۵/۰۰
مبادیات علم مدنیت (ایلیمنٹس آف سوکس) 〃 ۷/۵۰
اسلامی تاریخ اے۔اے۔ ہاشمی ۱۰/۰۰

متفرق

ایڈوانسڈ اکاؤنٹس ڈاکٹر محمد عارف خلیل ۵۰/۰۰
جدید تعلیمی مسائل ڈاکٹر ضیاءالدین علوی ۲۵/۰۰
اصول تعلیم 〃 ۲۰/۰۰
علم سماجیات 〃 ۱۲/۰۰
جدید علم سائنس وزارت حسین ۱۵/۰۰
رہبر تندرستی مسرت زمانی ۱۵/۰۰
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے 〃 ۲۵/۰۰
علم خانہ داری 〃 ۲۰/۰۰
بچوں کی تربیت 〃 ۱۵/۰۰
گلدستۂ مضامین و انشاپردازی ڈاکٹر محمد فائق حما ۱۵/۰۰
اردو شکشک (ہندی کے ذریعہ اردو سیکھیے) ۴/۵۰
ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر ایم اے شہید ۱۲/

ناول اور افسانے

حضرت جان (ناول) قاضی عبدالستار ۶۰/۰۰
دارا شکوہ (ناول) 〃 ۳۵/۰۰
صلاح الدین ایوبی (ناول) 〃 /۰۰
شب گزیدہ (ناول) 〃 /۰۰
چار ناولٹ (ناولٹ) قرۃ العین حیدر /۰۰
روشنی کی رفتار (افسانے) 〃 /۰۰
زیبا (ناول) افتخار بانو /۰۰
ضدی (ناولٹ) عصمت چغتائی /۰۰
کرشن چندر اور ان کے افسانے مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز /۰۰
راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے 〃 /۰۰
اردو کے تیرہ افسانے 〃 /۰۰
منٹو کے نمائندہ افسانے 〃 /۰۰
پریم چند کے نمائندہ افسانے مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس

ایجوکیشنل بُک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ- ۲۰۲۰۰۲، فون نمبر ۲۶۸۳۔